

بہار کا علمی ادبی اخلاقی تاریخی تنقیدی ماہنامہ
رسالہ سہیل گیا
The SOHAIL
GAYA
INDIA'S PREMIER MONTHLY MAGAZINE
مقام اشاعت:- دفتر رسالہ سہیل شمسی پریس گیا
Siddiqui, Gaya, 1940.
138

فواعد وضوابط رسالہ سہیل

(۱) رسالہ سہیل ہر انگریزی مہینہ کی ۱۶ تاریخ کو پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

(۲) سہیل میں ہر وہ مضامین نظم ونثر شائع ہوتے ہیں جو معیار ادب پر پورے اترتے ہیں۔ ناقابل شاعت مضامین واپس نہیں کئے جاتے۔

(۳) سہیل کی سالانہ قیمت مبلغ ۳ روپے ششماہی ۱۲؍ اور فی پرچہ ۴ ہے۔ نمونہ کا پرچہ ۴ کے ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جاتا ہے۔

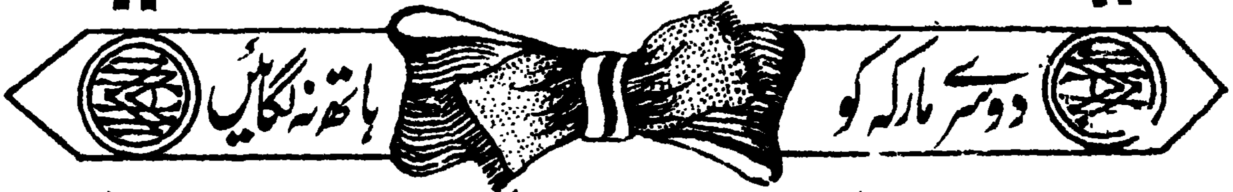
(۴) سہیل میں ہر ماہ کم از کم ۴۸ صفحات کے مضامین اور جاذب نظر ودلکش تصویریں شائع ہوتے ہیں۔

(۵) جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ہر مہینہ کی ۳۰ تاریخ تک آنے پر رسالہ دوبارہ ارسال کردیا جائے گا۔

"منیجر"

ہمیشہ نکٹائی مارکہ زردہ کھائیں



تمام زردوں کا بادشاہ	نکٹائی مارکہ زردہ	تمام مشکی دانوں میں یگانہ	نکٹائی مارکہ سیاہ مشکی دانہ
تمام زردہ پتیوں کی رانی	نکٹائی مارکہ زردہ پتی زعفرانی	تمام زعفرانی گولیوں کی دل و جاں	نکٹائی مارکہ مشکی زعفرانی گولیاں
تمام زردہ قواموں کا امام	نکٹائی مارکہ مشکی زعفرانی قوام	تمام الائچی دانوں کا تاج شاہانہ	نکٹائی مارکہ خوشبودار الائچی دانہ

اس مارکہ کی دھوم یہاں بھی وہاں بھی ہے ❋ برما بھی مدح خواں ہے ہندوستان بھی ہے

(مفصل نرخنامہ اور فہرست اندر ملاحظہ ہو)

محمد مصطفےٰ حسین کا شہرآفاق کارخانہ

نکٹائی مارکہ

کی بہترین و عمدہ ترین و ملذذ ترین چیزیں مغرب و مشرق کی جدید ترین فیکٹریوں کے طریقہ پر تیار کی جاتی ہیں بلکہ خوبصورتی خوشنمائی اور پاکیزگی میں اس کارخانہ کا نمبر ان سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور بہتر سے بہتر اور خوش تر سے خوش تر نفیس پیکٹوں اور خوش وضع شیشیوں میں اپنے جوہر داماں کو جوہر شناس مشتریوں کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ ضرور آزمایش کیجئے

شرط یہ ہے کہ خریداری کے وقت نکٹائی مارکہ کا نشان اور محمد مصطفےٰ حسین کا نام لیبل پر ضرور دیکھ لیا کریں ورنہ جعلی مال کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں

ہیڈ آفس :- نکٹائی مارکہ زردہ فیکٹری ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

برانچیں :-

کلکتہ	بمبئی	رنگون
۵/۱ کیننگ اسٹریٹ	۶۱ ارسکین روڈ بمبئی	۱۱۸ سورتی بڑا بازار

محمد مصطفٰے حسین کا شہرۂ آفاق نکٹائی مارکہ زردہ کا کارخانہ

نکٹائی مارکہ کی خالص چیزیں

زردہ طلائی

یہ ہندوستان کے تمام زردوں کا بادشاہ ہے
نہایت قیمتی نفیس مقوی اور مفرح اجزا سے مرکب ہے
زردہ طلائی مشکی دانہ اکسٹرا کوالٹی فی تولہ پانچ روپیہ
" " " " ۱ کوالٹی عہ ؍

زردہ نقرئی

قسم اول قیمت فی سیر ۳۲ روپیہ
" دوم " " " ۱۶ "
" سوم " " " ۸ "
سادہ دانہ نقرئی چہارم قیمت فی سیر ۸ "
" " " پنجم " " " ۴ "
" " " ششم " " " عہ "
" " " ہفتم " " " ۴ر "

چکنی پتی نقرئی و زعفرانی

قسم اول قیمت فی سیر ۳۲ روپیہ
" دوم " " " ۱۶ "
" سوم " " " ۸ "
" چہارم " " " ۴ "
(سادہ) " پنجم " " " ۲ "

زردہ موتی نقرئی

قسم اول قیمت فی سیر ۳۲ روپیہ
" دوم " " " ۱۶ "
" سوم " " " ۸ "

زردہ نقرئی سرخ زعفرانی پتی

قسم اول قیمت فی سیر ۳۲ روپیہ
(سادہ) قسم ششم " " " ۴ر "

زردہ براؤن زعفرانی پتی

۲ سادہ قسم اول قیمت فی سیر ۳ روپیہ
قسم چہارم قیمت فی سیر ۴ر "

قوام تمباکو مشکی خوشبودار نقرئی

قسم اول قیمت فی تولہ ۳ روپیہ
(بلا ورق) قسم اول " " " عہ "
" " " چہارم " " " ۴ "

پیکڈ زردہ

بکسوں میں جو زردہ بند کیا جاتا ہے وہ
بہترین قسم کا زردہ ہے۔ ذیل میں آدھ سیر کے
بکسوں کی قیمت دی گئی ہے

پیکڈ زردہ خوشبودار

سیاہ پتی سرخ بکس پیکارانہ قیمت ۲ر
" سبز بکس " " ۱۲ر
براؤن پتی سیاہ لیبل " " ۱ر
" " سبز لیبل " " عہ
" " سرخ لیبل " " ۱۰ر
براؤن زعفرانی پتی سبز لیبل ایک پاؤ کا بکس
قیمت ۹ر
" " سرخ لیبل " ۶ر

ہوائی جہاز مارکہ زردہ بکس آدھ سیر کے بکس
قیمت عہ
ہوائی جہاز مارکہ گلابی بکس آدھ سیر ۱۲ر
سانپ مارکہ زردہ بکس " ۸ر

پان کے مسالے (نکٹائی مارکہ)

مکھ بلاس گلاب پھول مارکہ فی ڈبہ ۴ر
" " " " فی گروس ۳۶ روپیہ
پان بلاس نقرئی گولیاں فی شیشی ۶ر
" " " " فی گروس ۵۴ روپیہ
دل بہار یعنی اسینس لایان فی شیشی ۴ر
تمبل بہار نکٹائی مارکہ قسم اول فی درجن عہ
" " فی گروس ۱۲ر
نقرئی شیشی سلور زردہ فی شیشی ۴ر
بٹیل چپ بڑی ڈبیہ قیمت ۶ر
سیاہ چمکیلا خوشبودار نقرئی و طلائی دانہ قسم اول
فی سیر ۴۰ روپیہ
سیاہ چمکیلا خوشبودار نقرئی و طلائی دانہ
قسم دوم فی سیر ۲۰ روپیہ
" " " " سوم " " ۱۰ "
سیاہ چمکیلا سادہ خوشبودار دانہ قسم اول
فی سیر ۴ روپیہ
" " " " دوم " " ۲ "

ہونی کریم سنگندہ مالتی (نکٹائی مارکہ)

اسکے استعمال سے چہرے کے داغ دھبے
چھائیاں اور مہاسے بالکل دور ہو جاتے ہیں جلد
صاف ستھری نکل آتی ہے۔ خوبصورتی پیدا ہوتی ہے
مردوں کے علاوہ عورتوں کیلئے نہایت ضروری ہے۔
قیمت فی درجن ۱۰ر فی گروس ۱۲۰ر

جہاز مارکہ خضاب (نکٹائی مارکہ)

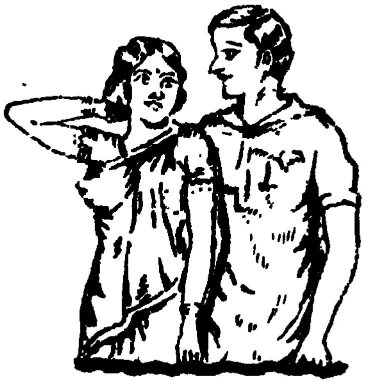
سول ملٹری جہاز مارکہ خضاب صرف دو منٹ میں
سفید بالوں کو سیاہ چمکیلا اور نرم کر دیتا ہے
بالکل بے ضرر اور بہت سستا ہے۔
قیمت فی شیشی ۸ر فی درجن ۱۲ر

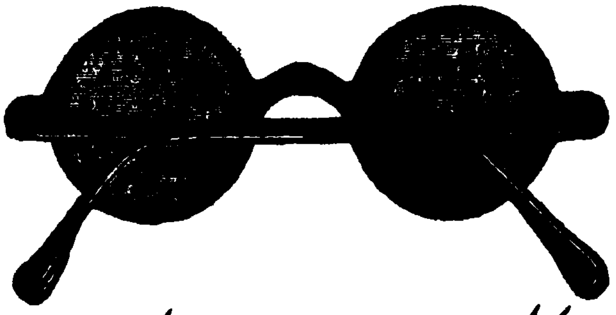
نکٹائی مارکہ

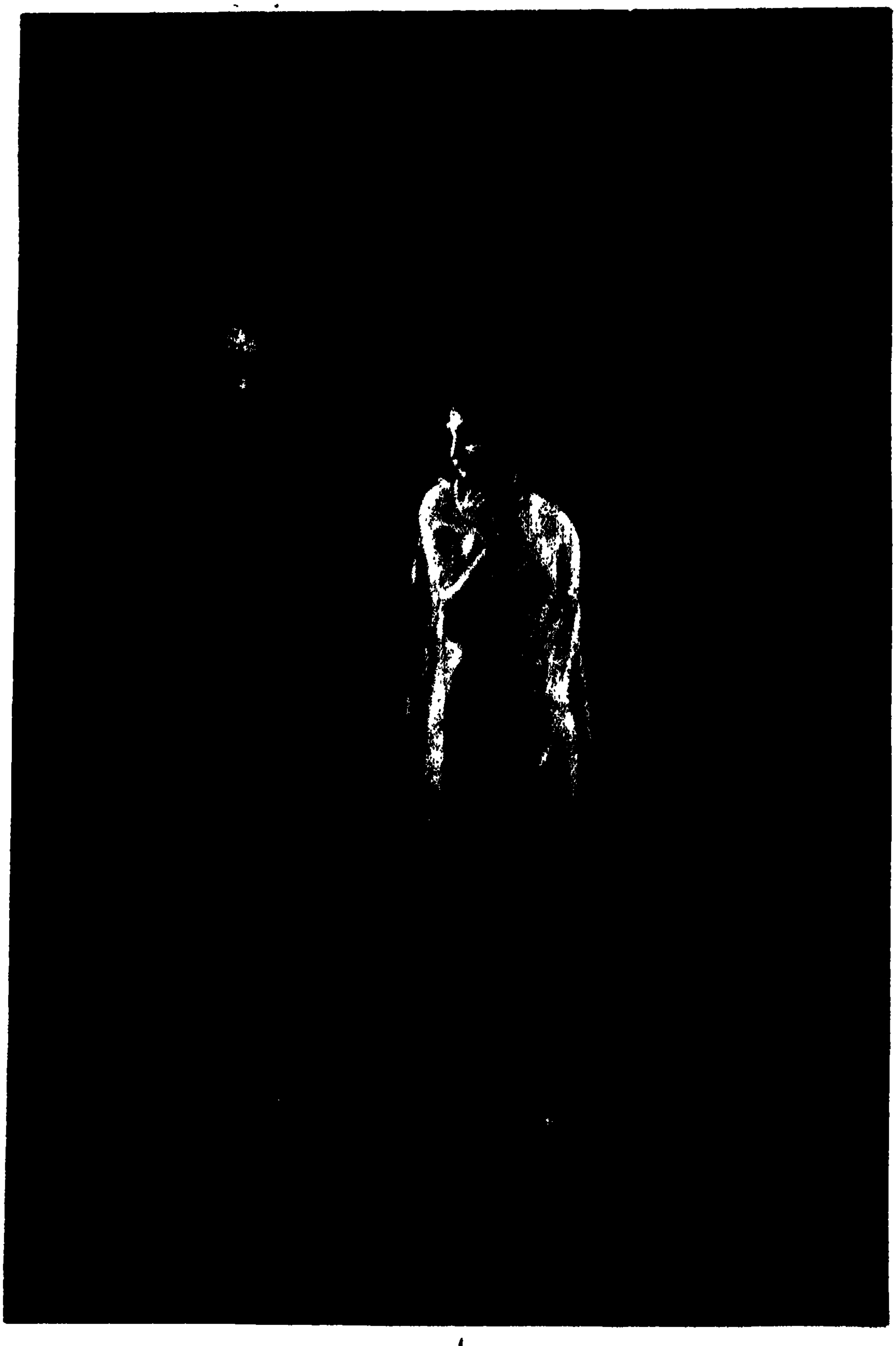
روغن بیر بہوٹی ——
—— روغن دار چینی ——
—— روغن الائچی ——
—— روغن کافور
روغن لونگ ——
—— روغن لیمو ——
—— روغن صندل ——
روغن نورجہاں، روغن تل رنگین اور دیگر
تیل، اسینس سینٹ اور عطر بھی بازار میں
اپنا جواب نہیں رکھتے۔

محمد مصطفٰے حسین کا نام اور نکٹائی مارکہ کا لیبل

مال کی عمدگی پاکیزگی اور ارزانی کا سرٹیفکیٹ ہے







عروس بہار

منظور شدہ محکمہ تعلیم صوبہ بہار

خاص نمبر رسالہ سہیل گیا

بابت ماہ مارچ واپریل سنہ ۴۰ء

جلد ۳ | نمبر ۳ و ۴

ادارہ
عارف سنسہاوی
قیصر عثمانی

پروپرائیٹر
محمد زین العابدین
سنسہاوی

تصاویر

(سہ رنگی) (۱) عروس بہار (۲) مجنوں (۳) بچہ اور چاند (یک رنگی) (۱) شیخ سعدیؒ (۲) حکومت مالدیپ کا بردمانی جہاز "فتح الباری" (۳) مشرق کی تین بہنیں (۴) تاج محل آگرہ (۵) بلند دروازہ فتح پور سکری (۶) اکبر کا دیوان خاص فتح پور سکری (۷) موتی مسجد آگرہ (۸) سوگ محبوب (۹) قیس و لیلیٰ (۱۰) محو انتظار (۱۱) تفریح (۱۲) مغنیہ (۱۳) دریائے برہمپترا کا ایک دلفریب منظر (فوٹو بلاکس) (۱) سرپرست رسالہ سہیل گیا۔ (۲) علامہ شفق رضوی (۳) پروفیسر طاہر رضوی (۴) نغمی گوہر شادانی (۵) بلبل بہار سہ بریکابری (۶) شعلہ وارثی لکھنوی (۷) نصرت آروی (۸) کشتہ گیاوی (۹) محمد فضل الرحمٰن پھلواروی (۱۰) ڈاکٹر ضمیر الحق

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	لمعات	ادارہ	۲

مقالات

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲	تبرکات خیال	ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال مرحوم عظیم آبادی	۱۴
۳	طلسم ہوشربا	مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی حیدرآباد دکن	۲۵
۴	زلف و رخ	ادیب جلیل جناب سید علی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر مونگیر	۴۳
۵	فردوسی اور اسدی	جناب محمد طاہر رضوی پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ	۹۳
۶	نظر ابو زبیری نظر میں	جناب عطاء اللہ صاحب پالوی	۱۰۳
۷	رباعی نگاری اور شاد	حضرت حمید عظیم آبادی	۱۱۴
۸	راجہ رام نرائن موزوں	جناب سید رضا قاسم مختار۔ جیلا	۱۳۹
۹	مسلمانوں کے زمانہ حکومت میں	جناب نصیر حیدر ڈپٹی کلکٹر میمن سنگھ بنگال	
	ہندوستان کا نظام تعلیم		۱۵۱
۱۰	عطا بہاری	حضرت رخشاں ابدالی اسلام پور پٹنہ	۱۶۶
۱۱	نپولین کا خط اپنے بیٹے کے نام	جناب ربط ہاشمی فاضل ادب	۱۹۰
۱۲	فرقہ بندی کی نفسیات	جناب محمد عثمانی سابق اڈیٹر استقلال کلکتہ	۲۰۳
۱۳	ہم	جناب مولوی فضل الرحمٰن پھلواروی	۲۱۹
۱۴	اردو کی ابتدائی شاعری	جناب ڈاکٹر نسیم گورگانوی	۲۲۲
۱۵	ہندوستانیں دستوری حکومت کا انقلاب	جناب منصور کاکوی	۲۲۹
۱۶	حیات بن	جناب سید علی سجاد قنبر رضوی عظیم آبادی	

افسانے اور ڈرامے

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	کوئلہ والا	جناب پروفیسر اختر اورینوی	۱۸
۲	وہ رات	جناب سہیل عظیم آبادی	۳۵
۳	رات کی سنسنی	جناب عبدالباقی بی اے۔ جامعی مفصل پسبی	
		ادفیسر گورنمنٹ بہار	۴۰
۴	نوروز	حضرت بدف اجتہادی لکھنوی سیاح ایران و عرب	۶۹
۵	رنگشا	حضرت ماہنوری	۸۴
۶	باغی ادیب کا خط	جناب "سش" مظفر پوری	۹۹
۷	بیراگی	حضرت ایم۔ اسلم لاہور	۱۰۹
۸	نغمۂ رباب	نغمی گوہر شادانی	۱۲۱
۹	فریب نظر	پروفیسر عبداللطیف تپش ایم اے ملتان	۱۵۵
۱۰	نیرنگ خیال	جناب اختر قادری بلیاروی ایم اے گولڈ مڈلسٹ	۱۶۲
۱۱	خون کے آنسو	جناب جی۔ آر تپش شیخپوروی	۱۶۹
۱۲	شیر کا شکار	جناب نصرت آروی	۲۱۲

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	ہمیں نے مجھ کو پریم سکھایا	محترمہ رضیہ رضا اردل	۲۲۴
	نظمیں		
۱	ترانۂ حمد باری	علامہ حافظ حاجی سید فضل حق آزاد عظیم آبادی گیاوی	۵
۲	خاص نمبر کا استقبال	علامہ شفق رضوی عماد پوری	۱۱
۳	شکریہ نوازش	حضرت بسمل سنبھائی سرپرست رسالہ سہیل	۱۲
۴	رکشا والا	بلبل بہار حضرت سریر کابری	۹۱
۵	سعی خام	جناب سعید احمد اعجاز	۹۷
۶	محبت کیا ہے	جناب حاجی نبی احمد بریلوی	۱۱۲
۷	حضرت اکبر آبادی کے مزار پر	جناب فضا الہ آبادی	۱۳۵
۸	فتنۂ بیدار	جناب وحشی آروی	۱۵۰
۹	موسم بہار کا ساقی	علامہ رسا ہمدانی گیاوی	۱۶۵
۱۰	پھولوں کا بادشاہ	علامہ شفق رضوی عماد پوری	۱۸۸
۱۱	زندگی	محترمہ شکیلہ اختر اردل	۲۰۰
۱۲	تاثرات	قیصر عثمانی	۲۰۲
۱۳	مشرق و مغرب کا نکاح	جناب سید عبدالحفیظ نرم سہروردی ایم آر۔ ایس۔ لندن۔	۲۰۹
۱۴	بچہ اور چاند	بلبل بہار حضرت سریر کابری	۲۱۸
۱۵	پی کہاں	جناب ابو احمد مولانا سید عبدالوہاب شفق گیاوی	۲۲۱
۱۶	عورت سے خطاب	جناب مرزا فدا علی خنجر لکھنوی	۲۳۱
۱۷	مزدور کی فریاد	جناب محمد ابراہیم ہوش کلکتہ	۲۳۷
	غزلیں		
۱	نشتر سخن	جناب نشتر سلونی الہ آبادی	۱۶
۲	ترانہ عشرت	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی	۱۷
۳	ارمغان کشتہ	جناب اودھ کشور پرشاد کشتہ دکیل گیا	۲۲
۴	احسن الکلام	حضرت احسن مارہروی	۳۴
۵	ارشاد عالیہ	حضرت آرزو لکھنوی	۳۴
۶	طوفان نوح	حضرت نوح ناروی	۳۹
۷	محسوسات اثر	جناب شیام بہادر اثر الہ آبادی	۴۲
۸	افسوس	جناب رضا مظہری الکاظمی	۶۸
۹	فکر جمیل	علامہ جمیل مظہری ایم اے	۶۸ ب
۱۰	نقوش بہزاد	حضرت بہزاد لکھنوی	۸۳
۱۱	دل کی نماز	جناب بہزاد فاطمی	۱۰۱
۱۲	شراب کہنہ	حضرت تپاں پھلواروی	۱۰۲
۱۳	جرعات عابد	جناب عابد زاہدی بلیاوی	۱۰۶
۱۴	دست ساقی میں چھلکتا جام ہے	جناب پیارے لال شاکر میرٹھی	۱۰۸
۱۵	بادۂ عرفاں	حضرت عرفاں اسلام پوری	۱۲۰
۱۶	تقریب تعارف موج جناب	حضرت تمنا عمادی	۱۳۸
۱۷	نغمۂ پرکیف	جناب شاکر صدیقی	۱۴۹
۱۸	فغان حسرت	جناب حسرت شاہجہاں پوری	۱۵۳
۱۹	گریۂ رائگاں	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۱۵۴
۲۰	جمالیات صبر	جناب صبر رضوی مخدوم آبادی	۱۶۳
۲۱	پرواز شوق	حضرت ادیب مالیگانوی	۱۸۰
۲۲	لمعات اختر	جناب اختر ماہ پوری	۱۸۷
۲۳	غزل	جناب پیارے مرزا غضنفر کلکتہ	۱۹۳
۲۴	تمہید فغاں	جناب عابدی سیمابی	۲۰۷
۲۵	خیالات پریشاں	حضرت شعلہ وارثی لکھنوی	۲۱۷
۲۶	جذبات مخمور	جناب مخمور لکھنوی	۲۲۰
۲۷	خمخانہ عابد	جناب سید زین العابدین عابد نقوی مضمون اول گیا	۲۲۳
۲۸	آئینۂ جذبات	جناب جوہر فیروزی	۲۲۵
	متفرقات		
۱	پگڈنڈیاں	جناب افسر ماہ پوری	۳۲
۲	پی کہاں	جناب ہمدم باشی	۴۲
۳	رباعی	مسٹر نور اللہ شاہ مرحوم گیاوی	۲۱۶
۴	نقد و تبصرہ	ادارہ	۲۵۵
۵	ڈاکٹر عظیم الحسن مرحوم	جناب منظر حسن۔ حسن پوری	۲۶۰

ترانۂ حمد باری

(از علامہ حافظ حاجی سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی گیاوی مدظلہ)

جان ہے اُسکے سوا کون اور ایماں ہے کون؟ — جان و ایماں کا حقیقت میں نگہباں ہے کون؟
رنگِ گل نالۂ بلبل میں جھلک ہے کسکی؟ — وہ نہیں ہے تو حُلی بندِ گلستاں ہے کون؟
کِس مسیحا کی تجلی دلِ رنجور میں ہے — درد ہے کون اور اُس درد کا درماں ہے کون؟
ہے چراغِ حرم و دیر پرستش کسکی — آتشِ تفرقۂ گبر و مسلماں ہے کون؟
اُسکا اقرار قیامت غضب اُسکا انکار — نفی و اثبات سے بھی دست و گریباں ہے کون؟
ناگزیرِ ہمہ و از ہمہ ہا مستغنی — جان و جانانِ جہاں دشمنِ ایماں ہے کون؟

کفر ہے کفر ہی آزاد نہ ایماں ایماں
کس سے اس درد کو کہیے کہ سخنداں ہے کون؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سہیلے براوجِ ادب تافتہ
ادیمِ گیا رنگ ازو یافتہ

(نتیجۂ فکر [illegible])

خاص نمبر ۱۹۴۶ء :

سُہیل کا خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بُرا یا بھلا جیسا بھی ہو ہم نے پیش کر دیا آپ پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کہ ہم نے اس کی ترتیب میں کون سا نظریہ انتخاب ملحوظ رکھا ہے اور ہم اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

سُہیل کی زندگی کو کتنا عرصہ ہوا یہ غالبًا بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے اس تھوڑی مدّت میں سہیل کو اونچے سے اونچے زینوں تک پہنچانے کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں۔ مُلک کے ممتاز اہلِ قلم حضرات کو اس طرف متوجہ کیا اچھے اچھے مضامین حاصل کئے پابندیٔ اشاعت کا خاص خیال رکھا اور پھر خاص نمبر کا بھی اعلان کر دیا لیکن آپ جانتے ہیں اُسی زمانے میں یورپ میں بربریت کی آگ بھڑک چکی تھی۔ اور آن کی آن میں جب ساری دنیا کا رنگ بدل گیا تو پھر غریب ہندوستان اس کے عالمگیر اثر سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہاں بھی گرانی شروع ہوگئی۔ سامانِ طباعت پر دام چڑھا۔ غیر ممالک سے کاغذ آنے بند ہو گئے۔ خود ہندوستان میں جو کاغذ بنتے تھے۔ اُن کی قیمت میں حوصلہ شکن اضافہ ہو گیا۔ اخبار و جرائد کے لئے یہ وقت بڑا نازک ثابت ہوا۔ کتنے اخبارات بند ہوئے رسالوں نے اپنے صفحات کم کئے سائز چھوٹا کیا۔ معمولی کاغذ دینے لگے۔ چندہ میں اضافہ کیا۔ الغرض اسی قسم کی بہت سی تبدیلیاں ہوئیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن آپ سُہیل کا ہر مہینہ مطالعہ کرتے ہیں۔ دیکھا ہو گا کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی نہ صفحات میں کمی کی گئی ہے نہ سائز چھوٹا کیا گیا اور نہ چندہ ہی میں اضافہ ہوا اور انشاء اللہ اگر آپ کی ہمدردیاں سُہیل کے ساتھ رہیں تو اس میں ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کا اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

ہمارے بعض سخن گستر احباب انگشت بدنداں ہیں کہ سُہیل اتنی قلیل عمر میں کس طرح اتنا مقبول اور ہر دلعزیز بن گیا اور باوجود مخالف کے

تندوتیز جھونکوں کے پروان چڑھتا نظر آرہا ہے ملک کے اکثر شعراء اور علم دوست اہل قلم اس کی آبیاری میں حصہ لے رہے ہیں۔
اس کا جواب ہمارے بس سے باہر ہے۔ ہمارے دوست ٹھنڈے دل سے غور کریں تو ان کا ضمیر خود ان کو جواب دے گا ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

کوئی تو بات ہے ساقی کے میکدہ میں ضرور　　　　کہ دور دور سے میخوار آ کے پیتے ہیں

خیر مقدم ۔۔۔۔۔۔۔۔!

ادیب جلیل سید وصی احمد بلگرامی۔ مولانا عبدالباقی بی۔ اے۔ جامعی۔ جناب پیارے لال شاکر میرٹھی۔ پروفیسر محمد مسلم۔ حضرت نوح ناروی حضرت مانپوری۔ جناب سہیل عظیم آبادی۔ جناب افسر ماہ پوری۔ جناب مخمور لکھنوی۔ جناب منصور گانوی۔ جناب محمد عثمانی اور جناب فضل الرحمن صاحب پھلواری وغیرہ پہلی مرتبہ بزم سہیل میں شریک ہو رہے ہیں۔ ہمیں نہایت مسرت ہے کہ مندرجہ بالا حضرات نے اپنے مضامین نظم و نثر سے سہیل کے خاص نمبر کی زینت بڑھائی۔ ہم تمام حضرات کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ وہ رسالہ سہیل کی آیندہ بھی قلمی معاونت فرماتے رہیں گے۔

خاص نمبر کے مضامین: ۔۔۔۔۔۔۔۔

خاص نمبر کے مضامین خود ایسے ہیں جن کو کسی تعارف کی قطعی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی صحافتی رسم و رواج کے مطابق ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے۔

نبر کات خیال ۔ ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال مرحوم کی ذات گرامی سے ادبی دنیا میں کون واقف نہیں۔ آپ کے بلند پایہ خطوط ملک کے اکثر و بیشتر رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیر تذکرہ خط اپنے سابقہ خطوط میں ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں چند ایسے مشکل الفاظ کی تحقیق کی گئی ہے جس کا مطالعہ ارباب علم کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس خط کیلئے ہم جناب ڈاکٹر نسیم کورگانوی کے شکر گذار ہیں۔

مقالے: ۔۔۔۔۔۔۔۔

طلسم ہوشربا :۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا ایک گرانقدر مقالہ ہے موصوف نے اس عدیم النظیر تصنیف پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے تفصیل کے لئے جناب موصوف کا پیش لفظ کافی ہے۔

زلف و رُخ :۔ ادیب جلیل جناب سید وصی احمد بلگرامی صوبہ بہار کے چند مخصوص لکھنے والوں میں ہیں۔ آپ کے مضامین اسلوب بیان حُسن تخیل اور معنی آفرینی کے لحاظ سے انفرادیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ کے سابقہ مضامین کی طرح اس کا مطالعہ بھی قارئین کرام میں خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔

فردوسی اور اسدی :۔ ایک بلند پایہ علمی مقالہ ہے۔ پروفیسر طاہر رضوی کے قلم سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اسدی فردوسی کا اُستاد تھا۔ اور شاہنامہ کے بعض حصّے اس کی تصنیف ہیں۔ جس کو فردوسی نے اپنے نام سے شاہنامہ میں شریک کر لیا ہے۔ جناب موصوف نے ان دو حقیقتوں کو قطعی طور پر غلط ثابت کیا ہے

نغمۂ نور میری نظر میں :۔ ملک کے مشہور نقاد جناب عطاء اللہ پالوی کا ایک تنقیدی مقالہ ہے۔ جس میں حضرت بہزاد لکھنوی کے دیوان نغمۂ نور کے معائب و محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالہ کے بعض حصوں سے ہمیں اتفاق نہیں طوالت مانع ہے ورنہ بحث کی جاتی۔

رباعی نگاری اور شاد عظیم آبادی:- حضرت حمید عظیم آبادی کا ایک بہترین علمی مقالہ ہے شعر و شاعری کی شکل صنف رباعی نگاری سے متعلق جناب موصوف نے کافی معلومات فراہم کی ہیں آخر میں شاد مرحوم کی چند بلند پایہ رباعیاں بھی پیش کی گئی ہیں۔ افادی نقطۂ نظر سے مقالہ بہت کامیاب ہے۔

راجہ رام نرائن موزوں:- جناب سید رضا قاسم مختار کا ایک تحقیقی تاریخی مقالہ ہے جناب موصوف کو قعرِ گمنامی میں پڑی ہوئی نامور ہستیوں کو اپنی قابلِ قدر تحقیق و تفتیش کے بعد دنیائے ادب میں روشناس کرانے کا خاص شغف ہے۔ چنانچہ آپ نے اس مقالہ میں صوبہ بہار کے ہونہار سپوت راجہ رام نرائن موزوں تلمیذ حضرت شیخ علی حزیں کی ادبی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے اسکی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

مسلمانوں کے زمانۂ حکومت میں ہندوستان کا نظامِ تعلیم:- جناب ڈپٹی نصیر حیدر صاحب کا ایک تاریخی مقالہ ہے۔ جو پڑھنے سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ جناب موصوف عنوان بالا کے ماتحت ایک مستقل کتاب تحریر فرما رہے ہیں اور آپ نے اسی کا ایک حصہ خاص نمبر کے لئے عنایت فرمایا ہے۔

عطا بہاری:- جناب رخشاں ابدالی کا ایک ادبی تحقیقی مقالہ ہے۔ جناب موصوف نے صوبہ بہار کے اس گمنام شاعر کے حالات قلمبند کرنے کے بعد اسکی شعر و شاعری سے قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مقالہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

نپولین کا خط اس کے بیٹے کے نام:- جناب ربط ہاشمی نے نپولین کے خطوط میں سے ایک اہم خط کا ترجمہ قارئین سہیل کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس خط میں نپولین نے اپنے بیٹے کو امور سلطنت کے متعلق گرانقدر ہدایات دی ہیں۔ جو قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ جناب موصوف نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ آئندہ بھی قارئین سہیل کو نپولین کے خطوط سے روشناس کراتے رہیں گے۔

فرقہ بندی کی نفسیات:- اس مضمون میں وقت کے ایک اہم مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور فرقہ بندی کی نفسیات کو واضح کرنیکے بعد اربابِ حل و عقد کو دعوت فکر دی گئی ہے۔

ہم:- جناب فضل الرحمٰن صاحب پھلواروی کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ جس میں "ہم" کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ 'ہم' ہم کو صرف سطحی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں غور کرتے کہ اس "ہم" نے مختلف وقتوں میں کیسے کیسے انقلابات برپا کئے ہیں مضمون اس کی تفصیل کے لئے کافی ہے۔

اُردو کی ابتدائی شاعری:- جناب نسیم گورگانوی کا ایک معلومات افزا مضمون ہے۔

ہندوستان میں دستوری حکومت کا ارتقاء:- ایک تاریخی مقالہ ہے جناب منصور کاکوی کے قلم سے۔

حیاتین:- جناب قنبر رضوی عظیم آبادی کا یہ طبی مقالہ اپنی افادیت کے ساتھ ساتھ طوالت بھی لئے ہوئے تھا۔ اس لئے جابجا سے مناسب انتخاب کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ قنبر صاحب ہماری اس بیجا مداخلت کو معاف فرمائیں گے۔

افسانے اور ڈرامے

کوئلہ والا:- اُردو افسانہ نگاری کو ترقی دینے میں جن اہل قلم حضرات کا حصہ رہا ہے ان میں پروفیسر اختر اورینوی کی ہستی بھی بہت بڑی حد تک ممد و معاون رہی ہے۔ وسیع المطالعہ ہونے کے علاوہ آپ انسانی نفسیات پر بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ کوئلہ والوں کی زندگی کو منظرِ عام پر لانا آپ ہی کا حصہ تھا۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام کے لئے یہ افسانہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ رات :— کلکتہ کی لاابالی زندگی کا دلچسپ مرقع ہے جسے ترقی پسند فسانہ نگار حضرت سہیل عظیم آبادی نے نفسیاتی رنگ میں پیش کیا ہے۔ آپ کی کہانیاں دنیائے ادب کے ترقی پسند حلقہ میں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں جناب موصوف کا یہ افسانہ بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بے حد کامیاب ہے۔

نوروز :— ایرانی ماحول میں گھرا ہوا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ حضرت ہدف اجتہادی لکھنوی کے قلم سے یہ ایرانی طرز معاشرت کی اتنی صحیح تصویر شاید اردو ادب میں یہ پہلی بار پیش کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔

رات کی سنسنی :— اردو کے جلیل القدر صحیفہ نگار جناب عبدالباقی صاحب بی۔اے جامعی کا ایک کامیاب افسانہ ہے اور حقیقی معنوں میں ترقی پسند رجحانات کا حامل ہے۔

رکشا :— ملک کے مشہور مزاح نگار حضرت مانپوری سے کون واقف نہیں آپ کے مزاحیہ مضامین کا نہایت بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے اور وہ جس رسالہ میں شائع ہوتے ہیں اس کا ورق ورق علیحدہ ہو جاتا ہے۔ جناب موصوف کا یہ مزاحیہ مضمون ان کے سابقہ مضامین سے کسی طرح کم نہیں۔ رکشا اور رکشا والے کی حقیقت کو مزاحیہ انداز میں پیش کرنا آپ ہی کا حصہ تھا امید ہے کہ قارئین کرام میں نہایت شوق سے پڑھا جائیگا۔

باغی ادیب کا خط :— مشہور فسانہ نگار جناب "ن" مظفر پوری کا ایک دلگداز مختصر افسانہ ہے۔ موصوف نے ملک کی موجودہ مفلسی اور پست حالی کا جس دردناک پیرایہ میں نقشہ کھینچا ہے۔ یقیناً کسی حالت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کی زبوں حالی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لٹریچر میں اس قسم کے افسانوں کی بے حد ضرورت ہے۔

بیراگی :— ادیب شہیر حضرت ام۔اسلم ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کے افسانے تقریباً ہر طبقہ میں بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں زیر تذکرہ افسانہ بھی آپ ہی کے قلم کا مرہون منت ہے۔

فریب نظر :— پروفیسر عبداللطیف تپش ایم۔اے کا لکھا ہوا ایک افسانہ ہے۔ جدید طرز نگارش کی طرف ہمارے ادیبوں کا رجحان نہایت سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے پرانی تحریروں کو پس پشت ڈال کر جدت و ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے شکر ہے کہ اس میں ہمارے ادیبوں کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ پروفیسر تپش بھی انہیں لوگوں میں ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

نیرنگ خیال :— ترجمہ ہے انگلستان کے مایہ ناز شاعر و ادیب آر۔ ال اسٹیونس کے ایک شاہکار افسانہ کا جو فی الجملہ مصنف کے تصوراتی رجحانات کا آئینہ دار ہے صوبہ بہار کے مشہور ادیب جناب اختر قادری ایم۔اے کی مترجمانہ صلاحیت نے اس کو حد درجہ دلآویز بنا دیا ہے۔ ممکن نہیں کہ کوئی اسے شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑ دے۔

خون کے آنسو :— ہندوستان کی عورتوں پر ان کے شوہروں کی جانب سے کیسے کیسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں اس کی تفصیل جناب قیس شیخپوروی کے افسانہ میں دیکھئے ایک بیوی اپنے دکھ درد کی کہانی سہیلی کو لکھ بھیجتی ہے۔ انداز بیان نہایت دلکش اور موثر ہے۔

شیر کا شکار :— ایک دلچسپ واقعہ ہے جسے جناب نصرت آروی نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔ واقعہ اتنا دلچسپ ہے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔

تم ہی نے مجکو پریم سکھایا :— محترمہ رضیہ رعنا کا ایک رومان پرور افسانہ ہے حسن و محبت کی رعنائیوں سے بھرا ہوا۔

نغمۂ رباب :— آل انڈیا ریڈیو کے مشہور ڈرامہ نویس جناب مفتی گوہر شادانی کا ایک بلند پایہ رومانی ڈرامہ ہے جو آل انڈیا

ریڈیو اسٹیشن لاہور سے ۲۹ نومبر ۳۹ء کو نشر ہوا۔ یہ ڈرامہ میں ڈرامہ نگاری کی تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں مکالمے اتنے چست اور شیریں ہیں کہ ایک بار پڑھنے سے سیری نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ انسان اسے پڑھتا جائے۔ اس ڈرامہ نے خاص نمبر میں ڈراموں کی کمی کو بذات خود پورا کر دیا ہے۔

نظمیں

ترانہ حمد باری :- علامہ آزاد عظیم آبادی ایک بلند پایہ نظم ہے۔

رکشا والا :- بلبل بہار حضرت سریر کابری کی ایک درد آفریں نظم ہے۔

سعی خام :- حضرت سعید احمد مجاز کا شمار اُردو کے خوشگو شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ کی یہ نظم جدید شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے قارئین یہ سنکر خوش ہوں گے کہ آئندہ بھی آپکی دلکش نظمیں وقتاً فوقتاً سہیل میں شائع ہوتی رہیں گی۔

محبت کیا ہے :- جناب حاجی احمد بریلوی کی ایک بہترین نظم ہے جو وکٹر ہیگو کی نظم کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے محبت کیا ہے۔ اس کا جواب حاجی صاحب کی زبانی سنئے۔

فتنۂ بیدار :- جناب وحشی آروی کی ایک رومانی نظم ہے۔

موسم بہار کا ساقی :- حضرت رسا ہمدانی کی ایک بلند پایہ نظم ہے۔

پھولوں کا بادشاہ :- علامہ شفق کی ایک دلکش نظم ہے پھولوں کا بادشاہ کون ہے یہ غالباً آپ جانتے ہوں گے۔ لیکن کیوں ہے اس سے شاید آپ ناواقف ہوں گے۔ علامہ موصوف کی زبانی 'کیوں' کی وجہ سنئے اور لطف اٹھائیے۔

زندگی :- محترمہ شکیلہ اختر کی ایک بلند پایہ نظم ہے۔

مشرق و مغرب کا مکالمہ :- جناب بزم سہروردی کی یہ نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

عورت سے خطاب :- جناب مرزا خنجر لکھنوی کی ایک خطابی نظم ہے جس میں موجودہ دور کی خواتین کو مخاطب کر کے ان کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔

پی کہاں؟ جناب ابواحمد سید عبدالوہاب صاحب شفق وکیل گیا کی ایک رومان انگیز نظم ہے۔

غزلیں

غزلوں کے لئے ہم حضرت عشرت لکھنوی۔ حضرت احسن مارہروی۔ علامہ آرزو لکھنوی۔ حضرت نوح ناروی۔ علامہ جمیل مظہری۔ حضرت شاکر میرٹھی۔ حضرت عرفان اسلام پوری۔ علامہ تمنا عمادی۔ حضرت فراق گورکھپوری۔ حضرت ادیب مالیگانوی۔ پروفیسر محمد مسلم۔ حضرت بہزاد لکھنوی حضرت شعلہ لکھنوی۔ حضرت مخمور لکھنوی۔ جناب کشتہ گیاوی۔ حضرت عابد نقوی نشتر سلونوی۔ جناب بہزاد فاطمی۔ جناب عابد سیمابی جناب عابد زاہدی۔ جناب شاکر صدیقی۔ جناب صبر رضوی۔ جناب اختر تاہ پوری۔ جناب مرزا غضنفر کلکتوی۔ جناب آثر الہ آبادی وغیرہ کے خاص طور پر شکر گذار ہیں۔ جنہوں نے اپنی بلند پایہ غزلیں خاص نمبر کے لئے ارسال فرمائی ہیں۔

معذرت :- ہم تمام ان قلمی معاونین سے معذرت خواہ ہیں جنکے مضامین دیر سے پہنچے یا طویل ہونے کے باعث خاص نمبر میں اشاعت پذیر نہ ہو سکے۔ انشاءاللہ قریبی اشاعتوں میں شائع کئے جائیں گے۔

(ادارہ)



حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنسہاروی

سرپرست



علامہ شفق رضوی عماد پوری



محمد طاہر رضوی گولڈ میڈلسٹ

پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ

خاص نمبر کا استقبال

بہار کا آئینہ ماضی و حال

نتیجۂ نفسی حضرت علامہ شفق عمادپوری مدظلہ کے افادات

بہار ہے تری اے صوبہ بہار ایسی
کہ خار خار چمن کا ترے گُل تر ہے

عجیب خطۂ جاں بخش و دلنواز ہے تو
کہ ذرّے ذرّے میں اک کیف روح پرور ہے

ادب میں اپنی نظیر آپ ہر ادیب ترا
سخن میں اپنی مثال آپ ہر سخنور ہے

کوئی ہے نثر میں یکتا کوئی ہے نظم میں فرد
کسی کے قبضے میں اہلِ قلم کا دفتر ہے

کوئی ہے شاہدِ رعنائے فن کا دلدادہ
سخن کسی کا عروسِ سخن کا زیور ہے

کوئی ہے بادۂ عرفاں سے مست جام سرور
کسی کے ہاتھ میں علم و ہنر کا ساغر ہے

تجھی میں گزرا ہے بیدل سا دلستانِ سخن
زباں پہ نام ہے جسکا اثر دلوں پر ہے

تجھی میں گزرا ہے راسخ سا درد کا ثانی
کہ جس کا شعر کوئی تیر کوئی نشتر ہے

تجھی میں آج بھی ایسے ہیں بعض نام آور
کہ جنکا دوسرے صوبوں میں شہرہ گھر گھر ہے

وطن میں رہ کے کسی کی نہ ہو جو قدر تو کیا
صدف میں رہ کے کہاں آبروئے گوہر ہے

رہے جو بطنِ صدف ہی میں ہے گُہر بھی خزف
رہے جو لعل رگِ سنگ میں تو پتھر ہے

یہ کسکا منہ ہے شفق کس زباں سے کوئی کہے
نہ جوہری نہ کوئی قدرداں جوہر ہے

خدا کے فضل سے ہے دوسرا برس اسکا
یہ ماہنامہ جو اُردو زباں کا رہبر ہے

سہیل کو مہِ کامل کا ہو عروج نصیب
وطن کی آنکھوں کا تارا یہ خاص نمبر ہے

شکریہ نوازش

اے قلم! انگشتِ حیرت در دہاں تو ہی بتا
خاص نمبر میں اگر دے اس کا تو شافی جواب
بول اٹھا یہ قلم میرے ہیں دو بازو بڑے
اک اربابِ کرم ہیں دوسرے اہلِ قلم
گو کسی لائق نہیں اے دوستانِ ارجمند
سب کا منت کش ہوں مجھ سے شکریہ کیا ہو ادا
یہ رسالہ اک برس جب چل چکا با آب و تاب
قدرداں تھے اک طرف اور اک طرف اہلِ قلم
اک سے اک افسوں طرازِ نثر، افسانہ نگار
نکتہ سنجِ عصر علامہ شفق[1] فخرِ بہار
احسن[3] و نوح[4] و مبارک[5] فخرِ شاگردانِ داغؒ
ناظم و ناثر تمنا[7] ئے عمادی باکمال
بہرہ یاب فیض شاگردانِ استادِ امیرؒ
ناظم و ناثر ولی[10] و یاس[11] سا اہلِ قلم
مانپوری[13] و نبی[14] احمد، ادیب[15] و جامعی[16]

دو زبانیں کیوں ازل سے ہو گئیں مجھ کو عطا
قدردانوں سے عجب کیا ہے ملے زریں خطاب
جن کے ہاتھوں صفحے صفحے پر ستارے ہیں جڑے
دو زباں سے شکریے دونوں کے کرتا ہوں رقم
بیش قیمت مال وہ ہے جو ہو گاہک کو پسند
اتنے احسانوں کا بوجھ اور ایک سرِ ناچیز کا
خیر سے سالِ دگر کا ہو گیا پھر فتحِ باب
خاص نمبر کی اشاعت کے ہوئے ساماں بہم
اس پہ پھر جادو بیاں ہر ماہرِ فن سحر کار
مقتدر علامہ آزاد[2] اسے اعلیٰ اقتدار
پھر حمید[6] ماہرِ فن شادؒ کے چشم و چراغ
آرزو[8] ئے لکھنوی شمعِ شبستانِ جلالؒ
ناظمِ ملکِ معانی، بلبلِ خوشگو سریر[9]
پھر وصی[12] سا ناقد و مضمون نگارِ ذی حشم
طاہر[17] و اسلم[18]، رضا قاسم[19] جمیل مظہری[20]

---

[1] شفق رضوی [2] آزاد عظیم آبادی [3] احسن مارہروی [4] نوح ناروی [5] ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی [6] حمید عظیم آبادی
[7] تمنا پھلواروی [8] آرزو لکھنوی [9] سریر کابری گیاوی [10] سید شاہ ولی الرحمٰن ڈپٹی مجسٹریٹ [11] یاس بہاری
[12] سید وصی احمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر [13] صوبہ بہار کے مشہور مزاح نگار [14] حاجی نبی احمد بریلوی [15] ادیب مالیگانوی
[16] مولانا عبدالباقی بی اے جامعی [17] پروفیسر طاہر رضوی [18] ایم اسلم لاہور [19] سید رضا قاسم مختار جیلانی [20] جمیل مظہری ایم اے

حضرتِ رخشاں سہیل و اختر و شمس و قمر
شمعِ افروزِ شبستانِ سخن بزم و رسا
قیس و وحشی نصرت و شیں و شفق خنجر فراق
کشتہ و اعجاز و نشتر صبر و منصور و نسیم
عارف و قیصر جو ہیں دونوں مدیر نوجواں
طابع و ناشر ہیں اکبر سا جوان خوش صفات
نظم میں نام و لقب سب کے کہاں تک ہوں رقم
لطف و احسان و کرم احباب کے ہیں بے حساب
چشمِ ما روشن دلِ احباب ما ہم شاد باد

بحرِ نظم و نثر کا اک ایک تابندہ گہر
مشعلِ بزمِ ادب، شعلہ ہدف گوہر عطا
ربط و قدوس و تپش بھی اپنے اپنے فن میں طاق
عابد و بہزاد و شاکر صاحبِ ذوقِ سلیم
چشمِ بد دور اس رسالہ کے ہیں یہ روحِ رواں
نیک سیرت نیک طینت نیک خصلت نیک ذات
عذر ہے شرمندۂ تنگیِ دامانِ قلم
اپنی ہی کوتاہ دامانی سے آتا ہے حجاب
خانۂ احساں ز لطفِ دوستاں آباد باد

اک طرف اہلِ نظر ہیں ما حضر ہے اک طرف
ہدیۂ ما گر قبول افتد زہے عز و شرف

بسمل سنسہاروی سرپرست رسالہ سہیل

ھ۱ رخشاں ابدالی اسلام پوری ھ۲ سہیل عظیم آبادی ھ۳ (۱) پروفیسر اختر اورینوی (۲) اختر قادری بلیاروی ایم۔اے (۳) اختر شاہ پوری ھ۴ شمس گیاوی پیر ہمزاد ھ۵ مولانا قمر الہدیٰ قمر شیر گھاٹوی ھ۶ سید عبد الحفیظ بزم سہروردی ھ۷ رسا ہمدانی گیاوی ھ۸ شعلہ وارثی لکھنوی ھ۹ ہدف اجتہادی لکھنوی ھ۱۰ مفتی گوہر شادانی ھ۱۱ عطاء اللہ پالوی ھ۱۲ جی۔ آر قیس شیخپوروی ھ۱۳ وحشی آروی ھ۱۴ نصرت آروی ھ۱۵ شیں مظفر پوری ھ۱۶ سید عبد الوہاب شفق وکیل گیا ھ۱۷ خنجر لکھنوی ھ۱۸ پروفیسر فراق گورکھپوری ھ۱۹ ربط ہاشمی فاضل ادب ھ۲۰ مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی ھ۲۱ پروفیسر شیخ عبد اللطیف تپش ھ۲۲ دیوان کشور پرشاد کشتہ گیاوی ھ۲۳ سید احمد اعجاز ھ۲۴ نشتر سلونی الہ آبادی ھ۲۵ صبر رضوی مخدوم آبادی ھ۲۶ منصور کاکوی ھ۲۷ نسیم گورگانوی ھ۲۸ (۱) عابد نقوی منصف اول گیا (۲) عابد زاہدی بلیاوی (۳) عابد سہیلی ھ۲۹ (۱) بہزاد لکھنوی (۲) بہزاد فاطمی ھ۳۰ (۱) شاکر میرٹھی (۲) شاکر صدیقی۔

تبرکاتِ خیال

یعنی ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال کا خط جناب امتیاز حسین ترمذی کے نام

کلکتہ۔ ۲۷ راگست ۴۴ء

عزیز المکرم ------------ !

نوشدارو ملا۔ جی گیا۔ "حیات اور ممات" یہ دونوں ابتک لاینحل رہے ہیں۔ کسی مذہب نے انکے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کن با
کہی جب وہ (مذہب) اپنا حق ادا نہ کرسکا تو سائنس کیوں اسکے پیچھے پڑتا۔ مگر پھر بھی اسکے ذریعہ سے کچھ حاصل ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ سب سے اول ایرانی حکمانے ان باتوں
کی کتاب لکھی بہت قدیم (یعنی تقریباً ۱۲ سو برس قبل مسیح) ہے اور اسمیں یہ مسائل بھی مندرج ہیں۔ مگر اب اسکا اصل اور صحیح نسخہ نایاب ہے۔ ایرانی علوم کو
یونانیوں نے غارت کیا۔ جو بچ رہا تھا وہ وحشی عربوں یا ناخدا ترس شاہوں کے ہاتھوں برباد ہوا۔ بندہش کا ایک قابل اعتبار نسخہ مرحوم مولوی ....
(کلکتہ) کے پاس مع ترجمہ کے تھا۔ جوانی میں اسے میں نے پڑھا تھا۔ مگر وہ وقت مسائل کے سمجھنے کا نہ تھا جو یاد کیا وہ بھی اب بھول
بیٹھا ہوں گے لٹریچر سے مجھے بہت کم واسطہ رہا ہے۔ جو جانتا ہوں وہ محض سطحی۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہند کے حکمانے اس میں بھی کافی محنت
مگر ان میں بھی یہی عیب ہے جو مسلمانوں میں۔ یعنی کھینچ تان کر ایسے مسائل بھی مذہب کے رشتہ سے جوڑ دئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کا وزن کم
ہے۔ حکماء اسلام میں شیخ (ابن سینا) نے البتہ ذرا آزادی سے کام لیا ہے۔ روح پر اس کی ایک نظم (عربی میں) اچھی اور ذرا آزادا
مگر پھر بھی وہ شاعری کر گیا ہے۔ اس کا ماخذ ایرانی فلسفہ ہے۔ شیخ کے بہت بعد مولانا روم کا زمانہ ہے۔ ان کی مثنوی ایرانی
سراسر متاثر ہے۔ مگر وہ اس بات کو چھپانا چاہتے ہیں۔ اور بیچ بیچ میں سامی و سریانی (مذہبی) قصے بیان کر کے اس وقت کے متعصبین ..
چاہتے ہیں! یہ مثنوی واقعی ایک بڑی چیز ہے۔ اسے سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو اکثر مسائل کا ایک آئیڈیا ہو جائے۔ مجھے بڑی خوشی
کہ آپ کی نظر اس مثنوی پر بھی ہے۔ زمانہ اور وقت آپکے ساتھ نہیں۔ ورنہ اس کے بہت سے مسائل آپ سلجھا دیتے۔ گو میں اس کا
میدان ہوں اور نہ اہل، مگر پھر بھی ہم آپ اگر ساتھ ہوتے تو دو دماغ کچھ کر لیتے۔ لیکن یہ وہ آرزو ہے جو پوری ہونے والی نہیں!

واقعی آپ کی نظر خوب گئی۔ ایران کی ذہنیت بہت کم لوگ سمجھتے ہیں اس لئے دھوکا کھاتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ ہو سکے تو ا
قلم اٹھائیے۔ اس ضمن میں یا اس بہانے آپ بہت کچھ کہہ جا سکیں گے۔ تبصرہ بر شاہنامہ پر نظر ثانی کرتے وقت میں بھی دکھ اٹھا
مگر موضوع سے الگ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کھل کر نہ کہہ سکا۔ اس کمی کو پورا کر دیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے آپکے وہ اتحاد خیا
جس کی نظیر بمشکل ملے گی۔ اور مجھے اس کا فخر حاصل ہے کہ پرانا علم نئے علم سے مل جاتا ہے، جو چیزیں آپکے ماحضر ہیں انہیں مجھے دیکھے
۳۰ برس سے زیادہ ہوا۔ اب سب بھول گیا۔ مگر جب آپ سے باتیں کرتا ہوں تو کچھ یاد آجاتا ہے۔ ادھر شاہنامہ سامنے تھا۔ رستم و
کی لڑائی پر نظر کی۔ اپنے تبصرہ میں اس مقام پر پہنچا جہاں اسفندیار پر اشو زردشت نے وہ دعا دم کر دی تھی جس سے اس پر کسی
حربہ کا اثر نہ ہوتا تھا۔ انگریزی مفسرین شاہنامہ فردوسی کے اس بیان پر مسکراتے ہیں۔ مگر دفعتاً مجھے یاد آگیا اور لوتھا کی انجیل دیا

آیت ۱۹) سے میں نے ٹھیک ایسا ہی ایک بیان سامنے رکھ دیا۔ حضرت عیسیٰؑ اپنے ایک حواری سے کہتے ہیں کہ تمہیں تجھے وہ قوت بخشتا ہوں کہ سانپ کے کاٹے ہوؤں کو اچھا کر دے اور دشمن کا کوئی ہتھیار تجھ پر چل نہ سکے گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا! اب اس کے بعد کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ میں نے اس لئے تحریر کر دیا کہ آپ بھی سمجھ لیں کہ مجلہ مذاہب کا ایک سا لب و لہجہ ہے اور یہ کہ ایک نے دوسرے سے بہت کچھ لیا ہے! زروشت مسیح سے کم از کم ۱۲ سو سال قبل ہیں۔

ناجی و نارجی کے ذکر پر آپ کے والد مرحوم کا فیصلہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ایک ہی نہیں۔ ہماری بیشتر چیزیں خود ساختہ یا اور جگہوں سے لی گئی ہیں۔ وجود، صفات حمد، نعت، منقبت، یہ سب اپنی شاعری ہے معصوم بھی خود ساختہ و پرداختہ اور ایرانی فلسفہ کا نچوڑ اور رومنوں کی تقلید ہے۔ اسلام میں ان چیزوں کا وجود نہیں ہے۔ شیعہ مذہب عرصہ تک ایسے بیانوں سے یکجا رہا۔ ملا ابن بابویہ کے بعد یہ مذہب بھی مسخ ہو گیا۔ اب جو ہمارے سامنے ہے وہ جعفری مذہب نہیں بلکہ صفوی و اختراعی مذہب ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ آپ کو معلوم ہے۔ اور اٹھارہویں صدی کے علمائے عراق اور ان کے مقلد علماء لکھنؤ کے حال سے بھی آپ واقف ہیں۔ مولوی نجم الہدیٰ سے مجھے افسوس ہے کہ اس عہد (رانچی) ملاقات ہوئی جہاں علمیت کے سوا ہر نعمت موجود تھی۔ اس لئے ان سے کام کی باتیں نہ ہو سکیں وہاں کا مذاق دیکھ کر میں نے خود کو مذاق میں ڈال دیا۔ مگر باتوں باتوں میں ان کے دماغ کو میں سمجھ گیا۔ اور اس لئے ان کی قدر کرتا ہوں۔ خوش قسمت ہیں آپ کہ ان سے قریب ہیں۔ اور بدقسمت ہوں میں کہ ان سے دور ہوں! ہمارا داغ بھی آجکل گُندا ہے۔ تبصرہ کا جو بیان رہ گیا ہے وہ اب تک قلمبند نہ ہو سکا۔ خدا املا سے ختم کرائے کہ پوری تحریر آپ کو بھیج کر مطمئن ہو جاؤں اور بے فکر ہو جاؤں:

فرنچ جرنل یہاں صرف امپیریل رکارڈ آفس میں آتا ہے وہاں سے لیکر کیونکر بھیجوں؟ مگر ہے یہ چیز دیکھنے کی۔ دشمن کی بات کو بھی سُننا چاہیئے۔ موجودہ یورپ بقول آپ کے صرف سیاست کا بندہ ہے۔ اور سیاست اب دھوکا اور ظلم کے تحت میں ہے اسلئے وہاں کی ذہنیت اہلِ بیت کو سراہ نہیں سکتی اور جب تک بہت ہوشیار ظلم نہ ہو یورپ کا دماغ درست نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی نجم الہدیٰ کو میرا سلام پہنچا دیجئے اور کہئے کہ بھولے نہیں۔ وہ مجھے صرف ایک نثر نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اور بس اگر ممکن ہو تو اتوار اتوار مجھے خط لکھا کیجئے، اور کچھ نہیں تو اس طرح ہم آپ ذرا نزدیک ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ بعض ضروری باتیں قلم بند ہو جائیں۔

یسن (فقہہ زردشت) قدیم پہلوی لفظ ہے اس کے معنی سیدھی راہ دکھانے والے کے ہیں۔ بعضوں نے اس کا تلفظ یاسین (یسین) بھی بنایا اور کہا ہے کہ کلدانی و سریانی اور اکثر سامی زبانوں میں (بہ اختلاف لہجہ و تحریر یعنی املا) یہ لفظ دونوں طرح بولا اور لکھا جاتا تھا ایرانیوں نے بہ زمانۂ نوشیرواں جب یمن کو فتح کیا تو یہ فارسی (پہلوی) لفظ وہاں (جنوب حجاز) پہنچا۔ اور رفتہ رفتہ ممتاز عربوں کی زبان پر چڑھ گیا۔ ایام جاہلیت میں اس لفظ کا پتہ نہیں ملتا۔ صرف قرآن نے اسے جلوہ دیا۔ ایسے بہت سے قرآنی الفاظ ہیں جو غیر زبانوں سے آکر عربی بن گئے۔ یاسوب (پہلوی) کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ یہ لفظ عرب جا کر یعسوب (الدین) بنا۔ غرض یہ بحث بھی مزیدار ہے۔ جس سے بڑے بڑے انکشافات ہوتے ہیں! مولوی نجم الہدیٰ صاحب کو بھی اس بحث میں شریک کر لیجئے گا۔ دو اور مشہور لفظوں کی طرف آپ کو متوجہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اول "خندق" اسے عربی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ پہلوی ہے۔ کندک۔ کندن (کھودنا) سے یہ پیدا ہوا۔ یہ لفظ غالبًا سلمان فارسی کا دیا ہوا ہے۔ جنگِ خندق میں حفاظت کے لئے حسبِ مشورہ

مسلمان لدو گرد ایک کھائی کھود دی گئی۔ انہوں نے اپنے ملک کی لڑائیوں کا دستور بناکر یہ کندک کھدوائی۔ عربوں نے اس لفظ کو خندق کردیا! دوسرا لفظ صراط ہے۔ یہ قرآنی لفظ ہے یعنی قرآن کے نزول سے قبل لفظ صراط عربی ہی نہ تھا۔ یہ بھی پہلوی سے قرض لیا گیا۔ قدیم فارسی اور اصل چینوٗ (یا سن، ایسن) کا یہ لفظ ہے۔ اسے چنوات اور چنات کہتے ہیں۔ یسنؔ میں ہے کہ بدن سے روح نکلتے ہی ایک بال سے باریک اور تلوار سے تیز تر پل پر سے گذرے گی۔ اس پل کا نام چنات ہے۔ عرب حرف چ کو عموماً س اور ص کر ڈالتے ہیں۔ جیسے چین کو زیر تقلید یونانی) سین کہہ دیا۔ اسی طرح حرف ن بھی حرف ر سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ چنات سرات بنا اور پھر صراط لکھا گیا۔ عربی میں اسکے دومعنی قرار پاگئے۔ راہ نیک (صراط مستقیم) اور پل (**BRIDGE**) عربی زبان کی کم مائگی کا حال اور بیرونی الفاظ کے اس میں داخل ہونے کی تاریخ پر آپ نظر کریں گے تو بہت سے راز عیاں ہو جائیں گے۔ قرآن کے مترجمین و مفسرین چونکہ ایسے الفاظ کی اصل سے بے خبر ہیں، اس لئے وہ غلط معنی بیان کرکے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں! یہی حال مسلمانوں کے اکثر عقائد کا ہے کہ وہ دوسرے مذہبوں اور دوسری قوموں (خصوصاً فارسیوں) سے لئے گئے مگر وہ اسلامی سمجھے جاتے ہیں!

آپ کی تفریح طبع کے لئے بائرن کے چند مصرعے اسوقت یاد دلا دیتا ہوں ؎

BY ALLAH, I WOULD ANSWERE, 'NAY'!
THOUGH ON 'AT-SIRAT' BRIDGE I STOOD
WHICH TOTERO O'ER THE BURNING FLOOD,
WITH PARADISE WITHENMY VIEW,
AND ALL ITS HOURIS[1] BECKONING THROUGH.

[1] حوریں

دیکھئے لفظ کہاں سے کہاں پہنچے اور ایک زبان سے دوسری زبان میں داخل ہوکر کیا معنی پیدا کر دیتے ہیں! اس تفریح میں جناب نجم گیلانی کو بھی ضرور شریک کر لیجئے۔ والسلام "خیال" (مرسلہ ڈاکٹر نسیم گورگانوی)

نشترِ سخن

از جناب پنڈت مانک ... نشتر ... الہ آباد

اک نیا غیب کا کرشما ہوں — اُس کا جلوہ ہوں جس کا پردا ہوں
اشک آنکھوں سے گر کے کہتے ہیں — دفترِ غم کا اک فسانا ہوں
تجکو میں جانتا ہوں جو تو ہے — مجھے اپنی خبر نہیں کیا ہوں
میری ہستی ہے مانعِ دیدار — آپ اپنی نظر کا پردا ہوں
میں انہیں یاد آ نہیں سکتا — ایک بھولا ہوا فسانا ہوں
لذتِ غم سے آشنا کر دے — درد کے واسطے تڑپتا ہوں

بند ہوتی ہیں آنکھیں اے نشتر
اب قیامت کی نیند سوتا ہوں

ترانۂ عشرت

از حضرت خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی مدظلہ

مریضِ جاں بلب ہوں مجھکو مرجانا نہیں آتا
عیادت کے بہانے سے انہیں آنا نہیں آتا

تجھے کیا قصہ گو الفت کا افسانا نہیں آتا
ارے ظالم مرے دل کو بھی تڑپانا نہیں آتا

میری میت سے اتنی دور کیوں احباب بیٹھے ہیں
کفن بھی غسل دیکر ان کو پہنانا نہیں آتا

بہارِ رنگ و بوئے عالم ایجاد ہے مجھ سے
مگر اس پر بھی اس دنیا میں اترانا نہیں آتا

کیا ہے قتل تو پھر تماشہ بھی ذرا ٹھیرو
ستمگر کیسے ہو بسمل کو تڑپانا نہیں آتا

سکوتِ بزم ہے وقتِ سحر ہے شمع بھی گل ہے
فدا ہونیکو اب محفل میں پروانا نہیں آتا

وہ اپنی روئے آتشناک کو دکھلا کے کہتے ہیں
کہ روشن شمع ہے جلنے کو پروانا نہیں آتا

خبر دیتا ہے دورِ آسماں کچھ ہونیوالا ہے
مگر ان دھمکیوں میں تیرا دیوانا نہیں آتا

مرے ساقی کی آنکھوں کا تصدق ہے یہ اے عشرت
کہ سب بیہوش ہیں محفل میں پیمانہ نہیں آتا

کوئلا والا

از جناب اختر اورینوی

"کوئلہ لو کوئلہ" "! کوئلہ لو کوئلہ" ! — پھیری کرکے کوئلہ بیچنے والے مزدور سورج نکلتے ہی محلّوں کی گلیوں کی خاک چھاننے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ نیم شکستہ ٹھیلا گاڑیوں میں اینٹے جتے ہوئے یہ دربدر مارے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دروازوں پر صدا لگاتے، دستک دیتے اور کواڑ کی پٹ کو کھٹکھٹاتے ہیں۔ کہیں سے جھڑکیاں، کہیں سے ڈپٹ، کہیں سے رعب دار "ٹھہرو" کے ساتھ "ایک من تول دو" کی مربیانہ آواز اور کسی مکان سے "جاؤ جاؤ آج نہیں لیا جائیگا" کے احکام صادر ہوتے ہیں۔

رمضانی ایک ادھیڑ عمر کا کوئلہ والا تھا۔ وہ شہر کے حاشیہ پر ایک بیوہ کوثر کے ٹوٹتے ہوئے گھر کو ٹھیکہ پر لیکر اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دمہ کی ستائی ہوئی بیوی اور مختلف ناپ تول کے سوکھے روکھے بچے۔ یہی لوگ رمضانی کے گھر کی زینت تھے۔ میاں رمضانی سے گھر پر ملنے والوں میں زیادہ تر قرض خواہ ہوتے تھے — دین دیال بنیا، رحمو خوانچہ والا، شہباز خاں کپڑے والا اور محلے کے چند لوگ۔

رمضانی کبھی کبھار اپنے گھر کے سامنے نریل پیتا رہتا تھا۔ مگر زیادہ تر وہ قرض خواہوں کے ڈر سے اندر ہی اس شغل میں منہمک رہتا۔ "کھوں کھوں کھوں" اندر رفتہ رفتہ "کھائیں کھائیں" اور "ڈھائیں ڈھائیں" کی آوازیں گھر کے اندر سے آتی رہتی تھیں۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کے وقفے سے تو تو میں میں میاں بیوی اور اس کی بیوی کی صلواتوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ان کے نیم عریاں بھوکے بچے، گلیوں، سڑکوں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر کھیلتے۔ رمضانی کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ وعظ کی مجلسوں، جلسوں اور درگاہوں پر قوالیوں میں ضرور شریک ہوتا تھا۔ جمعہ جمعرات اور عرس کے موقعوں پر نذر نیاز میں بھی حصّہ لیتا تھا۔ پہلے وہ لکڑی کی اور اب کوئلہ کی پھیری لگا کر اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا —

"بھائی عیدو! سچ ہے دنیا فانی ہے۔ پاک پروردگار کلام حدیث میں فرمائیں ہیں کہ ایک دفعہ مجلس وعظ سے واپس آکر رمضانی نے اپنے دوست سے واقفکارانہ انداز میں کہا ..." روزہ نماز کرو۔ حلال میں ملاوٹ اور چوری مت کرو۔ حق حلال کھاؤ اور غیر عورت پر نظر نہ کرو ... اور یہ بھی فرمائیں ہیں کہ اپنے خدا بند کا فرمانبرداری کرو... آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر کی طرف چور چور نگاہوں سے دیکھا۔

"سب سچ فرمائیں بھائی مگر چور سنے دھرم کہانی .... اس جگ میں سب چور ..... غریب کرے تو باندھا جائے امیر کرے اترائے" عیدو نے جواب دیا۔

"بھائی عیدو! ہم تو اپنی جان بھر حق حلال پر نظر رکھے ہیں دنیا کچھ کرے۔ ہاں میری جورو ذرا بد مزاج ہے اپنا بہت خراب کرتی ہے۔ ہم سے لڑتی ہے۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ہم تو بھائی محنت مزدوری کرنے سے باز نہیں آتے مگر سالا کرج جان نہیں چھوڑتا.." رمضانی بولا

"ہاں رمجانی! تم تو نماز نیاز پیر فقیر بھی کرتے ہو .. ہم کیا کریں! شراب حرام ہے جو تو کبھی منہ نہیں لگایا۔ ہاں وہی تاڑی کا چسکا ہے مگر بھائی ہم سے تم سے لئے دنیا میں اور کا مجا دھرا ہے۔ محنت کرتے کرتے مر جاؤ۔ جندگی میں کبھی آرام نہیں۔ کرج، سود بیاج، مار ڈانٹ اور ہر دم ہو للہ مسر کھلا۔ یہی دو گھڑی چین کرنے کی کھاتر تاڑی چڑھا لیا تو کیا ہوا گھر آکر بھول جاتا ہوں ... بڑے بڑے مولوی مولانا کو بھی دیکھ

ہے۔ یوں امید نے اظہار خیال کیا۔

لچھمی پرشاد گولہ دار کے صحن میں ٹھیلہ گاڑیوں اور مزدوروں کا جمگھٹ تھا۔ میلے چیکٹ بدبو سے کپڑے پہنے ہوئے کوئلہ پھیری کرنے والے مزدوروں کو کوئلہ تول تول کر دیا جا رہا تھا۔ مزدور بورے کے کوئلے اٹھا کر پلڑے پر رکھتے تھے اور منشی تولتا جاتا تھا۔ کوئلہ والوں کے منہ ہاتھ ہنومان کی طرح کالے ہوتے جاتے تھے۔ گولہ دار موٹی سی توند اور فربہ گردن کے ساتھ کسی فاقہ زدہ مزدور کے چہرے کی طرح پیلے کاغذ کا بہی کھاتہ لئے اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے ذاتی ہنگامہ خزانے پر بیٹھا ہو۔ سامنے روپوں اور ریزگاری کے تھاک تھے مزدوروں کے حساب دیکھے جا رہے تھے۔

"پردیسی! ارے پردیسیا!" لچھمی پرشاد گولہ دار نے ناک کی نوک پر رکھے ہوئے سفید فریم کے چشمہ کے بالائی محافت گھورتے ہوئے پکارا۔

ملکاؤں نے صدائے بازگشت کی طرح تیجہ جاپ شروع کی۔

"ارے پردیسیا! ارے پردیسیا!" ایک نے صدا دی۔

"سالوں کو دیکھو۔ مالک جناب کا حساب کے لئے پکارتے ہیں اور حرامجادے سب بھت پرگائب۔" دوسرے نے کہا۔ "حاضر سرکار" کہتا ہوا ایک پست قد مزدور دوڑا آیا۔ مجور ترا کھینی کھاتے کھاتے چھوڑ دیا سے بات کرنے لگے۔۔۔۔۔

گولہ دار نے بیں برجبیں ہو کر کہا۔ "تیرے حساب میں دس روپیہ باقی گرتا ہے آج سب وصول کریں گے۔ نہیں تو کوئلہ نہیں ملے گا۔ سنا؟"

"معاف سرکار ہم تو آپ کے حسامی ہیں سرکار۔۔۔۔۔ آج کل میں اسول کر دیں گے سرکار، مجبور ہمارے باپ ہیں۔"

مائی باپ نے برافروختہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ولایت میں لڑائی کے ادجہ سے مال مہنگا ہو رہا ہے۔ کاروبار میں ہم کو لگانا پڑتا ہے نہ تم بے فکروں کو۔ بیدے من سے دیدو نہ تو ہم کسی طرح سے وصول کریں گے۔۔۔۔۔" عملہ نے چند ماں بہن بیٹی کی گالیوں کا اضافہ کیا اور کچھ کوس دھمک دکھائی۔

پردیسیا کو کوئلہ نہیں دیا گیا۔ دوسرے کوئلہ والوں کا حساب شروع ہوا۔

رمضانی رات بھر نہیں سو سکا تھا ستمبر کا مہینہ تھا۔ ادھر تو ہفتوں بارش ہوئی تھی مگر گذشتہ شب سے فضا ابر آلود ہو رہی تھی اور رات کو خوب دھوم سے بارش ہوئی۔ رمضانی نے گھر کے اندر پانی کا ریلا دیکھا اور دیکھا کہ جھونپڑی بھی مفلوک الحال ٹپا ٹپ گرتی ہے رہی تھی کے دیدہ گریاں کی طرح چھپر سے پانی مسلسل ٹپکتا رہا تھا۔ رمضانی کی بیوی کو دمے کا شدید دورہ اٹھ رہا تھا۔ رات کو اس کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ گذشتہ روز رمضانی کے کوئلے نہیں بک سکے تھے اور دو دن سے بھی چاول ادھار نہیں ملے اسکے دن آگے بھی بہت باقی تھے۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں۔ دن کو کمائی نہ ہو تو رات کو خرچ کیسے چلتا۔ بچے سب بھوکے سو رہے تھے اب جو بارش نے نیند میں خلل ڈالا تو گھر بھر مجلس ماتم برپا۔ لڑکے سب رونے میں ایک سے ایک بڑھ نکلے اور اس پر لڑکوں کی ماں کی ڈانٹ۔ ہمسائی اور گالی گلوچ صلواتیں۔ رمضانی کے گھر میں رت جگا ہوتا رہا۔ اسی ہنگامے میں رمضانی کو ٹھیلہ گاڑی پر رکھے ہوئے کوئلے کا خیال آیا۔ وہ تو بھیگ رہے تھے۔ وہ گرم دوڑ رمضانی نے اپنا گدڑا لے جا کر ٹھیلہ چھپایا۔ مگر بارش نے بہت حد تک اپنا کام کر لیا تھا۔۔ رات کالی ناگن کی طرح رینگتی اور پھیرتی ہوئی گزر گئی۔

صبح ہونے سے پہلے ہی بارش تھم گئی۔ دن نکلتے ہر کا خیمہ غریب کی چادر کی طرح چیتھڑا چیتھڑا ہو چکا تھا۔ افق میں سورج کبھی ابر کے گالوں سے جھانکتا تھا اور کبھی انہیں ٹکڑوں میں ابن آدم کے حال کو دیکھ کر شرم سے منہ چھپا لیتا تھا۔ رمضانی نے اٹھ کر اپنی ٹھیلہ گاڑی کا جائزہ لیا۔ گدڑا شرابور ہو چکا تھا اور کوئلے بالکل بھیگ گئے تھے۔ اس کا دل بھی برف کی طرح سرد ہو گیا۔

"آج بھیگا ہوا کوئلہ کون لے گا؟ بھاری ہو جائیگا کوئلہ۔ رمضانی نے دل میں سوچا۔ "گولہ کے شیڈ میں کوئلہ سوکھا ہوگا۔۔۔۔ سالے دوسرے مجور سب سوکھا کوئلہ لے کر بیچ لیں گے۔ میرا مال آج پھر پھر جاگا۔۔"

رمضانی نے اپنی ناکامیابی اور اس کے نتائج کا اندازہ کیا۔ بچے سب بھوک کے مر جائینگے۔ بیوی گالیاں دیگی اور بنیا ادھار مانگنے پر جھڑکیاں سنائیگا۔۔۔۔۔ اس نے سوچا کہ گولہ دار سے چلکر خشک کوئلے حاصل کرے مگر اس کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہ تھی۔ رمضانی نے دو چار مایوس انگڑائیاں لیں۔ اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ٹھیلہ گاڑی میں جُت چکا تھا۔ اس کے قدم مضمحل

انداز میں دھیرے دھیرے اُٹھ رہے تھے۔ جاتے جاتے بیوی نے دو چار "خوش آمد" جملے رخصتانہ میں تحفتاً پیش کئے اور پھر ڈھائیں ڈھائیں کرنے لگی، بچوں کے کورس نے رونے کا دوامی باجا بجایا اور پڑوس کے دھوبی کا کُتا نیند سے چونک کر دور تک بھوں بھوں کرتا ہوا میاں رمضانی کو پہنچانے گیا۔ گلی کے موڑ پر بنیا دکان کھول رہا تھا۔ اُس نے بھی تقاضوں سے اُس کا خیر مقدم کیا۔ رمضانی خاموش گردن جھکائے ہوئے تھیلا آگے بڑھاتا جاتا تھا۔

"کیسا بے حیا ہے بے شرم۔ بولے بھی نہیں ہے۔ دھارو ہو تو حلک سے اباج کا ہے نہ نکلے؟ ہم کپڑہ لتا سب چھین لیں گے" بنیے نے جل کر کہا۔

رمضانی کا جسم تھکا ہوا اور بھوک سے مضمحل ہو رہا تھا اور اس کی روح بھی اداس اور ویران ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا۔

"اس دنیا میں ایمانداری سے روجی کمانے سے اچھا چوری کرنا ہے۔ جب تک تھانہ پولس نہ ہو اچھا ہے، جب باندھے گئے تب بھی جنجال سے چھٹکارہ......" وہ یہی سوچتا ہوا بڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ وہاں سے کوئلہ کا گولہ نزدیک ہی تھا۔

"نہیں رمجانی جیتے جی ایسا نہیں کرے گا۔ دُنیا پھانی ہے" رمضانی کے دل میں ایمان کی ایک کمزور سی چنگاری سُلگی اور پھر تلخ حقیقتوں کی خاکستر میں بجھنے لگی۔

"میاں رمضانی! سُنتے ہو جوشاندے کا دام بہت سا تمہارے ذمہ باقی ہے۔ بھائی ایسا کرو گے تو آئندہ دوا نہیں ملے گی۔ خراب موسم آرہا ہے۔ تمہاری بیوی کو دمہ کی شکایت اب تک باقی ہے۔ دیکھو باقی جلد ادا کر دو....." بڑی سڑک پر حکیم صاحب عطا نے مطب کھولتے ہوئے رمضانی کو دیکھ کر کہا۔

"سلام عطاء صاحب! کا باکی ادا کریں۔ کھائے کو تو ملتا نہیں۔ مر جائے جُرو! باپ کے گا....." یہ کہتا ہوا رمضانی تیوری پر بل ڈالتا ہوا گزر گیا۔

رمضانی گولہ پہنچ گیا۔ ادھر سے پردیسیا منہ لٹکائے اداس باہر نکل رہا تھا۔ رمضانی کی رہی سہی اُمید پر بھی پانی پھر گیا۔ رمضانی اور پردیسیا دونوں ایک ہی محلے میں بھیک ہی مانگاتے تھے اور دونوں بچھیں پرشاد گولہ دار کے ناتی داروں میں سے تھے۔

"کا بھائی پردیسی! مال نہیں ملا؟" رمضانی نے پوچھا۔

"نہیں! سالہ پاپی سیدھے مُنہ بات تو نا کیہس" پردیسی نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

"شاید میرے دیدے دیا بدلیو دے۔ کوئلہ سالہ رات بھنگ گیہ کل تو بکھے نا کیا....." یہ کہتے ہوئے رمضانی احاطے کے اندر ترازو کی طرف چلا ــ احاطے کے ایک طرف دو تین کوئلے والے لڑ اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے......

"اس کی ماں کو ......" ماں کی گالی دیتے ہوئے ایک مزدور چلایا،

"سالہ بھردسیا کو دیکھو۔ چوری چھپے ہمرا محلہ میں بھی جا کر ساتین رواج کوئلہ بیچلس تب نہ کہن، ہمر سودا بکھے نا کرے اور اوسار نوٹنگی کے ناچ دیکھے لاتیار اور منہ میں بیڑی بھکا بھک بھکا بھک ہون' آویں سار نہیں تو کلیجہ بکسا دیون"

"بکرا پیچھے میں بول لے، بول لے۔ آیتو تو منہ کا آواج" ایک دوسرے مزدور نے گالی دیتے ہوئے جواب دیا۔

"راہ سے نکال تو"

"توں کون بولے والا"

"ہنکرا بہن کے یار ہئی بھردسیا"

"چپ سالا۔ جبان سنبھال کے بول"........

لڑائی کے ہنگامے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا رمضانی شیڈ کی طرف چلا شیڈ کے اندر ڈھیر دن ڈھیر کوئلے رکھے ہوئے تھے اور کچھ شیڈ کے باہر۔ شیڈ ہی میں ایک طرف گولہ دار کی گدی تھی اور سامنے ترازو کا کانٹا تین لانبے لانبے گولوں سے بندھا ہوا جھول رہا تھا۔ مزدوروں کی قسمت اُسی کانٹے پر تُلتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حشر کے میدان میں میزان لگی ہوئی ہے اور سیٹھ جی خدا بنے ہوئے اعمال کے فیصلے سُنا رہے ہیں۔ مگر اس خود ساختہ پروردگار کے یہاں دوزخ ہی دوزخ تھی، جنت کا نام تک نہ تھا۔ احاطہ کی زمین کوئلوں کے برادہ سے سیٹھ کے دل کی طرح سیاہ ہو رہی تھی۔ گدی کے قریب پہنچ کر رمضانی نے گولہ دار کو ایک زبردست سلام کیا۔ جواب میں ایک متکبرانہ خاموشی تھی گولہ دار کا تکلم پچہ پر گھس گھس کر رہا تھا۔ رمضانی نے منشی جی سے باتیں کرنی

جاتیں۔ اور جھڑکیاں سنیں۔ تھوڑی دیر کے بعد باب اجابت خود بخود کھلا مگر جلالی رنگ میں ——

"رمجنیا! باقی بقایا اور سول روپے! ہزار کا رنگ ڈھنگ خراب ہو رہا ہے اور یہ کمینے سب میرا ادھار لیتے ہوئے بھی نہیں دیتے..... اب سختی اب سختی کیا جائگا...... منشی جی! رمجنیا نے کل گدی پر ایک پیسہ بھی لاکر نہیں دیا۔ آج اس کو مال نہیں ملے گا!" گولہ دار نے برافروختہ ہو کر کہا۔

"قسم کھا کے کہتے ہیں سرکار! کل مال نہیں بکا۔ جھونپڑیا میں سب مال حاضر ہے۔ .. سرکار راستے پانی میں بھنگ گیا۔ اگر بیچ پر دیا کرکے اس کو بدلوا دیا جائے..... ہم ہیں ان پہلے کا پائی پائی چکو تو آگے پیچھے دے دیں گے...... " رمضانی نے لجاجت سے عرض کیا۔

آگے پیچھے کا بچہ! کلکتہ سے شام کو تار آیا ہے اور اس کو جھریا اور آسنسول سے تار آیا....... بلائت کی لڑائی کے اوجہ سے بجار کھراب ہو رہا ہے....... ٹھاکر سنگھ! سب باقی داران سے جیسے ہو روپیہ وصول کرو.......

رمضانی کا سر چکرانے لگا..... اس کے لئے دنیا تاریک ہو رہی تھی۔ وہ دو روز سے بھوکا تھا اس کے بچے بھوکے تھے۔ اس کی بیوی بیمار اور فاقہ زدہ تھی۔ قرض کے بار سے وہ دبا ہوا تھا۔ اب اُسے کھانے کی چیزیں ادھار دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ دنیا اُسے ایک بے معنی خلا معلوم ہو رہی تھی۔ سر دست اُس کا دماغ کچھ سوچنے سے بھی قاصر تھا...... وہ کابوس زدہ مریض کی طرح گویا بلا ارادہ اپنے ٹھیلے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی شریک حال ٹھیلہ گاڑی سے ہم آغوش ہو کر رونا چاہتا تھا.......

...... وہ پھر رکا۔ پیچھے مڑا اور سیٹھ کی گدی کے سامنے جاکر سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے رو رو کر منت سماجت کی مگر گولہ دار پتھر کے بت اور سنگ دل کی قبر کی طرح ساکت و خاموش تھا۔ مایوس ہو کر رمضانی ٹھیلہ گاڑی کے پاس آیا....... منشی نے آواز دی

"رمجنیا! سب کوئلہ اجھل دے!"

کوئلہ انڈیل دیا گیا۔ اور رمضانی اپنے پیٹ کی طرح خالی گاڑی لیکر گولہ کے احاطہ سے باہر نکل گیا....... پھاٹک پر خوانچہ والا دال موٹ اور پھلکیاں بیچ رہا تھا۔ خراب تیل کی تیز بو چنے کی دال کی سوندھاہٹ سے ملکر رمضانی کے ناک میں پہونچی۔ اور وہ تلملا اُٹھا۔ اُس نے پیچھے مڑکر دیکھا۔ شیڈ کے اندر اور باہر کوئلوں کے ڈھیر اُسے مردم خوار سیاہ دیو کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ اُس کا دماغ بھڑکتے کوئلے کے چولھے کی طرح دہکنے لگا۔ اُس کی چشم تصور کے سامنے عرب کے دیگ عفریت کی توند کی طرح نمودار ہوئے........ رمضانی کی آنت میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔

.... ٹھیلہ گاڑی پر اس کا پھٹا ہوا گندڑا دھرا تھا!...

...... گندڑے کے چاک قبر پر چڑھائی ہوئی زرنگار چادروں پر نفرت کی ہنسی ہنس رہے تھے۔ رمضانی اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے کوئی قبرستان سے مردہ دفن کرکے واپس آرہا ہو۔

رمضانی بلا ارادہ اُس محلے میں آنکلا۔ جہاں وہ اور پردیسیا کوئلے کی پھیری کرتے تھے.......... وہ خدا جانے کس عالم میں تھا کہ محلہ کے نکڑ میں داخل ہوتے ہی اُسنے کہک کر صدا لگائی۔ "کوئلہ لو کوئلہ" اُسنے کئی دفعہ یہی صدا لگائی۔ اچانک اس کی نظر خالی ٹھیلہ گاڑی کی طرف جھکی۔ اس کا سر چکرا سا گیا۔ قدم ڈگمگا گئے اور دل بیٹھ گیا۔ اُس نے ٹھیلہ کو ایک گلی کی موڑ کے کنارے لگا دیا اور خود گاڑی سے ٹیک لگاکر بیٹھ گیا۔ مضمحل، اداس، بے حس۔ بہت دیر کے بعد اُسے شدید بھوک کا احساس ہوا اور اسی کے ساتھ اُسے ایک من کوئلے کے دام کا خیال آیا۔ جو محلہ کے ایک گاہک کے یہاں باقی تھا۔ وہ اس طرح جست لگاکر اُٹھا جیسے کتا ہڈی پر لپکے۔ اُس کے جسم میں غیر معمولی طاقت آگئی۔ آن کی آن میں رمضانی پیشکار صاحب کے دروازے پر تھا۔

"ملکائن! کوئلہ کا دام!" رمضانی چلایا۔

"کتنا بلا کرتا ہے۔ بٹھر!" گھر کی خادمہ نے ڈانٹ بتائی۔

"کوئلہ کا دام!" رمضانی چلاتا رہا۔

آخر ایک لڑکا دام لے کر باہر آیا۔ اس کے کف دست میں ایک روپیہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اور دو اکنیاں ستاروں کی طرح اپنا روپ دکھا رہی تھیں۔ یہ دو من کوئلے کے دام تھے۔ رمضانی نے بڑی بے تابی سے لڑکے کے ہاتھ سے گویا دام جھپٹ لیا۔ نو آنے اس کے تھے اور نو آنے پردیسیا کے۔

رمضانی جانتا تھا کہ اس کا حق صرف نو آنے پیسے ہے۔ لیکن اس وقت ایک اکنی بھی اس کے لئے مال مطاع بے بہا تھی۔ وہ وہاں سے تیر کی طرح نکلا۔ اور بڑی سڑک کے چوراہے کے ایک ہوٹل میں جاکر اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور ایک پیالی چائے کی بھی پی۔ ہوٹل سے نکلتے وقت اسے مولوی صاحب کا وعظ یاد آرہا تھا۔

"چوری مت کرو۔ حق حلال کھاؤ۔" تھوڑی دیر کے لئے اسے ندامت کا احساس ہوا کہ اس نے مالک کو دھوکا دیا۔ اس کا تو صرف ایک من کوئلے کا دام تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں پردیسیا تو نقصان نہ اٹھائے۔

"ہوں! پردیسیا بڑا لڑاکا ہے۔ وصول کر لے گا۔"

رمضانی نے سوچا اور اسے یہ سوچ کر اطمینان سا ہوا۔ حق حلال! بہت سے مولوی ملانے تو بھی دیکھا کہ ہوں! اسے اپنے دوست عیدو کی بات یاد آرہی تھی۔

رمضانی اس احساس سے سڑک پر خوش چلا جا رہا تھا کہ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے +

ارمغانِ کُشتہ

(از جناب اودھ کشور پرشاد کشتہ وکیل گیا)

ہمارے وہم و گماں میں پھر عذاب آیا — نظر کے سامنے جب ساغر شراب آیا
نصیب دے ہی رہا تھا مجھے جواب مگر — ہزار شکر کہ خط کا مرے جواب آیا
ہمارے دل کی امنگوں میں مچ گئی ہلچل — قیامت آئی کہ ظالم ترا شباب آیا
تھی کمسنی تو حیا میں تھیں شوخیاں شامل — جوانی آئی تو شوخی کو بھی حجاب آیا
جو آنکھیں بند ہوئیں دل ہوا وہیں بیدار — ہماری آنکھ کھلی موت کا جو خواب آیا
ہزار ظلم کرو اور ایک بھی نہ گنو — مری سمجھ میں تمہارا نہ یہ حساب آیا
تمام عمر رہی کشتہ آرزو جس کی — فنا کے بعد نظر مجھ کو اب وہ خواب آیا

بدانش پسندیدہ کن جان پاک که ناداں ندارد فزونی زخاک

کتابخانۂ دانش

کتابوں کی فہرست مفت طلب کیجئے

ایران کی فہرست مفت طلب کیجئے

جو

برسوں سے کلکتہ میں حضرات علماء و تلامذہ کی خدمت کرنے میں مصروف رہا ہے گذشتہ سال سے اپنا ایک ڈپو طہران میں بھی قائم کیا ہے جس کی وجہ سے ایران اور ہندوستان کے درمیان بہترین ادبی ارتباط قائم ہوگیا ہے دونوں کتبخانوں میں فارسی کی قدیم و جدید کتابوں کا کافی ذخیرہ ہمیشہ موجود رہتا ہے حسب معمول سالیانہ کلکتہ ڈپو کی کتابوں کی فہرست خریداران محترم کی خدمت میں پیش ہوتی ہے۔

اُن کے علاوہ جو کوئی کتاب حضرات کو درکار ہو فوراً طہران سے منگائی جائے گی۔

کلکتہ کا پتہ

کتاب خانۂ دانش

پوسٹ بکس ۱۵۶ کلکتہ

۲۲ ترپٹی بازار اسٹریٹ کلکتہ

ایران کا پتہ

طہران۔ خیابان سعدی

کتاب فروشی دانش

ایران

احسن الکلام

(از جناب احسن مارہروی)

دل جھکا مائل طبیعت ہوگئی
آج بسمل اللہ اُلفت ہوگئی

ابتدائے عشق والفت ہوگئی
زندگی کی ختم مدت ہوگئی

میرا حالِ زار تو دیکھا مگر
یہ نہ پوچھا کیوں یہ حالت ہوگئی

دے دیا دل جس کو ہمنے دے دیا
ہوگئی جس سے محبت ہوگئی

دل میں جبتک آہ تھی اک بات تھی
لب تک آتے ہی حکایت ہوگئی

موت کا آنا غنیمت ہوگیا
ہم کو غم کھانے سے فرصت ہوگئی

کیسی مطلب آشنا تھی چشم شوخ
دل اڑایا اور چمپت ہوگئی

اُن کی چالوں کا نتیجہ یہ ہوا
وقت سے پہلے قیامت ہوگئی

چشم پُرنم نے کیا افشائے راز
آبروئے ضبط غارت ہوگئی

کہہ گئے احسنؔ کے منھ پر آج وہ
تیری صورت سے بھی نفرت ہوگئی

طلسم ہوشربا

داستان پارینہ پر ایک نیم متعارف مقالہ

از مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی۔ حیدرآباد دکن

بہت دن ہوئے کہ میں نے طلسم ہوشربا کی جلدیں دیکھی تھیں۔ یہ جلدیں اس شوق اور دلچسپی کے ساتھ دیکھی گئی تھیں کہ اب اپنی زندگی میں کسی دوسرے کام کو اس قدر دلچسپی کے ساتھ کرنے کا خیال بھی مجھے نہیں آتا۔ اسوقت میرا بچپن تھا، اور نانی جی کی پریوں والی کہانی سنتے ہوئے بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ پہلے ایسے افسانوں میں جی لگتا تھا۔ کیا اچھے دن تھے کہ دن کو بھی دھڑکا تھا نہ شب کو آنکھ روتی تھی۔

"گرمیوں میں مدرسہ بند ہو جاتا۔ اور ہم گھر آجاتے۔ اس کے بعد ہوشربا کی جلدیں پڑھی جاتیں۔ اور اس طرح پڑھی جاتیں کہ صبح و شام کا تصور دور ہو جاتا تھا: رات اور دن کا امتیاز بھی ہمیں اس سے جدا نہ کرتا تھا۔ بزرگوں کا حکم کھانا کھانے پر اور ان ہی کا اصرار سونے پر مجبور کرتا، ورنہ ہم دونوں بھائی اتنی دلچسپی کے ساتھ یہ افسانہ پڑھتے تھے کہ کبھی کبھی ساری رات اس قصہ کو ختم کرنے میں رات بسر ہو جاتی"

اگر میرا قیاس غلطی نہیں کرتا تو شاید آپ نے بھی اسی عمر میں یہ افسانہ پڑھا ہوگا۔ جب لشکر مہرخ کی تباہی پر رونا۔ اور ساحروں کی بربادی پر ہنسی آجاتی تھی۔

اس مصنف کی بدنصیبی کو کیا کہئے جس کی کتاب کے پڑھنے والے، داد دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے ہوں، نہ اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ لگا سکتے ہوں، اور اس کی تاریخی اہمیت کا کون اندازہ لگائے کہ ان بدنصیب افسانہ نگاروں نے جن کے دماغ و قلم کی کاوش ہمارے زمانہ طفلی کا ایک کھلونا معلوم ہوتی ہے۔ اس ذریعہ سے صرف اپنا پیٹ ہی نہیں پالا بلکہ اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی، اور انیسویں صدی کے ہندوستانی تمدن کا ایسا عمدہ نقشہ کھینچا کہ جس کو دیکھنے سے پورا ماحول سامنے آجاتا ہے۔ بیراگی فقیر کی کٹیا سے لیکر بھرا بھرایا بازار تک، اور دیہات کی ایک بڑھیا کے گھر سے لیکر بادشاہ کے محل تک، ہر جگہ کے آداب محفل، سامان زینت، طرز تعمیر اور انداز گفتگو آپ اس میں دیکھ سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں اتفاقی طور پر مجھے طلسم ہوشربا کی جلدیں پھر ایک بار مل گئیں۔ بچپن کے دیرینہ رفیق کو دیکھ کر جی چاہا کے دو چار صفحات پڑھ ڈالوں اب جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ اتنی فرومایہ چیز نہ تھی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ کچھ اس کے متعلق لکھنے لگا۔ "افسانہ کا افسانہ" سلسلۂ زلف دراز کی طرح بڑھتا گیا، کتاب کے ایک ایک خدوخال کو واضح کرنے میں مضمون اتنا بڑھ گیا کہ خود ایک چھوٹی سی کتاب کی وسعت کا محتاج ہو گیا؛ اسی کتاب میں سے کچھ ابتدائی حصہ ناظرین سہیل کے لئے پیش کر رہا ہوں، امید ہے کہ ناظرین اس حصہ سے داستان کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

"عبدالقدوس ہاشمی"

داستان کی وسعت

داستان طلسم ہوشربا جو مع بقیہ و دو حصہ جلد پنجم دس ضخیم جلدوں میں ہے۔ جسکے مجموعی صفحات تقریباً نو ہزار ہیں۔ بڑے سائز پہ باریک خط سے دو یا تین بار چھپ چکی ہے۔ اگر اتنا ہی ہوتی جب بھی شاید چینی کے علاوہ دنیا کا سب سے بڑا افسانہ ہوتی۔ مگر یہ داستان محض ایک جزو ہے۔ اس بڑی داستان کا جسے داستان امیر حمزہ کہا جاتا ہے یہ پوری داستان حسب ذیل اجزا پر مشتمل ہے۔

(۱)	نوشیروان نامہ	دو جلدیں	۲	
(۲)	کوچک باختر	ایک	۱	
(۳)	بالا باختر	ایک	۱	
(۴)	ایرج نامہ	دو جلدیں	۲	
(۵)	طلسم ہوشربا	دس جلدیں	۱۰	مع دو جلد بقیہ ہوشربا اور دو حصے جلد پنجم
(۶)	صندلی نامہ	ایک	۱	
(۷)	تورج نامہ	ایک	۱	
(۸)	لال نامہ	ایک	۱	
(۹)	طلسم فتنہ نور افشان	تین جلدیں	۳	
(۱۰)	طلسم ہفت پیکر	تین جلدیں	۳	

کل ۲۵ جلدیں، صفحات کی تعداد تقریباً ۲۵ ہزار

تلخیص

فسانہ کی تلخیص یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ذرا پہلے کا زمانہ ہے۔ نوشیروان بادشاہ ایران کو نجومی اطلاع دیتے ہیں کہ جناب عبدالمطلب خادم کعبہ کے گھر زہرہ و مشتری کے قران السعدین میں ایک خوش نصیب لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ جس سے شہنشاہان روئے زمین تھرا اٹھینگے۔ بادشاہ اپنے ہوشمند وزیر بزرجمہر کو بھیجتا ہے۔ یہ وزیر خود بڑا نجومی ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسی وقت دو اور لڑکے عرب میں پیدا ہو سکتے۔ جو اس صاحبقران کے رفیق ہونگے چنانچہ وہ مکہ مکرمہ جاتا ہے۔ اور عبدالمطلب کے بیٹے حمزہ اور ان کے دونوں ہونے والے رفقا عمرو بن امیہ ضمری اور مقبل وفادار کو لے آتا ہے۔ شاہی انتظام سے انکی تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ نوشیروان کی بیٹی مہر نگار حمزہ پہ عاشق ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے دوسرے شریر وزیر بختک کے بہکانے سے شادی کیلئے بار بار کسی نہ کسی پہلوان یا بادشاہ کو زیر کرنے کی شرط لگا دیتا ہے۔ بالآخر نوشیروان اور حمزہ سے بگڑ جاتی ہے۔ اور نوشیروان ختم ہو جاتا ہے اس کے دو بیٹے ہرمز و فرامرز بختک کے فرزند بختیارک کے ساتھ بھاگ کر زمرد شاہ باختری کے یہاں پناہ لیتے ہیں یہ زمرد شاہ دعوائے خدائی رکھتا ہے۔ حمزہ تعاقب میں آتا ہے۔ اور قسم کھا لیتا ہے کہ جبتک زمرد شاہ کو ٹھکانے نہ لگائے گا چین نہ لے گا۔ زمرد شاہ شکست پر شکست کھاتا ہوا ملکوں ملکوں بھاگتا پھرتا ہے۔ کہیں پہلوان اور بادشاہ اس کی مدد کرتے ہیں۔ اور کہیں ساحران زبردست اسکو پناہ دیتے ہیں۔ حمزہ سے جا بجا ان لوگوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔ اور طرح

صرع کے عجائب سے واسطہ پڑتا ہے۔ آخر میں زمرد شاہ قتل کیا جاتا ہے۔ اور حمزہ واپس مکہ مکرمہ آکر یادِ پروردگار اور انتظار بعثت نبی آخرالزمان میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جابجا افسانہ از افسانہ کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اور دیوؤں، پریوں، ساحروں، غیر ساحروں اور پہلوانوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں امیر حمزہ اور افراسیاب بادشاہ طلسم ہوشربا سے بھی بگڑی اُلجھ جاتی ہے۔ امیر حمزہ کا نواسا اسد شیر دل اس طلسم کو توڑتا اور افراسیاب کو قتل کرتا ہے۔ افسانہ کا پلاٹ مختلف ایرانی ہندوستانی تورانی اور یونانی خرافیات سے مرکب ہے۔ سارے کا سارا افسانہ محض فرضی اور ذہن کی گڑھت ہے۔ مگر افسانہ کے اہم افراد اور انکی خصوصیتیں قدیم داستانوں سے ماخوذ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فسانہ کا مصنف ان قوموں کی روایات سے نہ صرف واقف بلکہ ان کا ماہر ہے۔ چند کرداروں کا صحیح تعارف کراتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ مصنف نے کردار کہاں سے حاصل کئے ہیں۔

عبدالمطلب بن عبد مناف — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا۔ قریش کے سردار اور کعبہ کے مجاور، سنہ عام الفیل یعنی سنہ ۴۸ قبل ہجرت میں وفات پائی۔

امیر حمزہ — عبدالمطلب کے صاحبزادے۔ سید الشہداء و مشہور صحابی سنہ ۳ ہجری میں غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ بڑے بہادر اور زبردست پہلوان تھے۔

عمرو بن امیہ ضمری — قبیلہ ضمرہ جو ساربانوں کا ایک قبیلہ تھا۔ اس کے آپ ایک فرد تھے، مشہور صحابی ہیں۔ آپ بہت تیز دوڑتے تھے۔ کوئی دوسرا ان کا دوڑنے میں مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ جرأت و بہادری میں مشہور تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو کئی بار مختلف جگہ پیام دیکر بھیجا ہے۔ زمانہ خلافت معاویہ رضؓ میں وفات پائی۔

عمرو بن معدیکرب — مشہور صحابی۔ یمن کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۹ ہجری میں اپنے یہاں کا ایک وفد لیکر بارگاہ رسالت میں آئے۔ سنہ ۱۸ میں جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے۔ ضرب المثل شہسواران عرب میں سے، ان کے قصائد عرب کے مذہبیات یعنی آب زر سے نوشتہ قصائد میں ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے

اذا لم تستطع امرا — فدعہ الی ما تستطیع

بطور ضرب المثل کے استعمال ہوتا ہے۔

مالک بن اشتر نخعی — جنگ صفین میں حضرت علیؓ کا مشہور بہادر سپہ سالار، نیزہ بازی میں لاثانی کمال کا مالک۔

نوشیروان — خاندان ساسانیان ایران کا آخری با اختیار فرمان روا، جس کی عدالت عجم میں ضرب المثل ہے، دنیا کے عجیب و عظیم الشان ایوانوں کا مالک، جس کے عہد میں ایران کا آفتاب تمدن اپنے نصف النہار تک پہنچ چکا تھا۔ سنہ قبل ہجرت میں وفات پائی۔ لفظ نوشیروان لقب ہے۔ اصل نام خسرو بن قباد تھا۔

ہرمز — خاندان ساسانیان کا آخری رکن جو قادسیہ میں مسلمانوں کی فتح کے بعد سے بے وقعت ہو کر عجم میں بھاگتا پھرا۔ ہرمز کے اصل معنی ستارۂ مشتری کے ہوتے ہیں۔ شاہنامہ میں ہے

ہمہ باستان باسر افشان شدند — چو ناہید و ہرمز درخشان شدند

غالباً یہ لفظ کلدانی لفظ ہرمس یعنی بزرگ سے نکلا ہے۔ اور ستارہ پرست قوموں نے پہلے تعظیماً مشتری کا اور پھر تیمناً انسانوں کا نام قرار دیا۔ اسے اور مزد بھی کہتے ہیں۔ قدیم کتابوں میں لفظ ہرمس اور ہرمز بطور اسم حضرت ادریس علیہ السلام کے لقب کے

طوسی پر بھی ملتا ہے۔

فرامرز — عجم کی روایات میں یہ نام ہے رستم کے بیٹا کا چنانچہ فردوسی نے اس طرح ذکر کیا ہے

بزرجمہر — فارسی لفظ بزرگ مہر کا معرب ہے۔ بادشاہ عادل نوشیرواں کا وزیر تھا۔ اور اپنی دانائی کیلئے بلاد عجم میں، فلاطون اور ارسطو سے زیادہ شہرت رکھتا تھا

افراسیاب — عجم کی مشہور روایات کے مطابق توران کا زبردست بادشاہ تھا جس نے سالہا سال شاہان ایران سے جنگ کی فردوسی کہتا ہے،

چو فردا برآید بلند آفتاب　　　من و گرز و میدان و افراسیاب

مشہور ہے کہ اس نے ایک بہت بلند اور عجیب گنبد بنایا تھا۔ جس پر چوبیس گھنٹہ نوبت بجا کرتی تھی۔ ایک مشہور شعر ہے۔

پرده داری میکند بر قصر قیصر عنکبوت　　　بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

زمرد شاہ یا ختری (نغا) — اس شخصیت کا تعلق بھی قدیم ایرانی افسانوں سے ہے۔ کہتے ہیں کہ خراسان میں سب سے قدیم شہر ... جغرافیہ نویسوں کی بلخیہ ... اور پہلوی میں باختر کہتے تھے۔ کوہ سبلان کے پیچھے ایک بڑا شہر "سبائل" نام سے آباد تھا۔ یہاں ایک بڑا جلیل القدر بادشاہ رہتا تھا۔ جس نے پہاڑی پر ایک عالیشان محل بنوایا تھا۔ اس محل کا رنگ سبز تھا۔ اور اسے قیتول کہا کرتے تھے۔ اس سبز رنگ کی مناسبت سے بادشاہ کو زمرد شاہ کہتے تھے یہ چیز ایرانیوں میں اسقدر مشہور تھی کہ سرسبز پہاڑوں کو قیتول زمرد شاہی سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ سید اشرف ماژندرانی کہتا ہے۔

دشت از لالہ چو قنقور ، سرخ عیار　　　کوہ از سبزہ چو قیتول زمرد شاہی

قیتول ترکی لفظ ہے۔ جو برج کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
اس بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ دعوائے خدائی رکھتا تھا۔

جمشید — شاہ نامہ کی روایت کے مطابق خانوادہ پیشدادیان ایران کا چوتھا۔ اور اوستا کے مطابق تیسرا فرمان روا۔ جس کے پاس کچھ ایسی مخفی طاقتیں موجود تھیں کہ جو چاہتا کر گذرتا۔ مشہور افسانہ "جام جہان نما" کا مالک تھا۔ اور دعوائے خدائی و یکتائی رکھتا تھا۔ اسے جم، جمشیدون اور جمشاسپ بھی کہتے ہیں۔ قطران کا شعر ہے

خدایگان زمانہ مسعود کرد و خواہد کرد　　　ہر آنچہ خواہد مکند چو کرد جمشیدون

اسدی طوسی کہتا ہے

بدانست ہر کس کہ گشتاسپ است　　　فرزندۂ تخت جمشاسپ است

کمال خجندی کہتا ہے،

الٰہی چو خورشید تابندہ باد　　　چو جمشید نامش فروزندہ باد

رتقی کا شعر ہے۔

زدہ بر ہمہ کرد با مون علم　　　کہ فرزند بہر فریدون و جم

بعض مورخین کا خیال ہے کہ جمشید حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام ہے۔ اس لئے ساحر اس نام سے کانپتے ہیں۔

سامری سمیریا۔ یا سامرہ، موجودہ علاقہ شام و فلسطین کا ایک شخص تھا جس نے حضرت موسیٰ کے غیاب میں سحر صنعت سے ایک طلائی بچھڑا بنایا۔ جو بولتا بھی تھا۔ لوگوں نے اس کی پرستش بھی کی۔ سحر و ساحری کے لئے اُسے خدائی کا درجہ دیا جاتا تھا۔

چند خاص خاص ناموں کی حقیقی تاریخی اور بعض کی قدیم افسانوی شخصیت کے تعارف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ داستان امیر حمزہ کے افسانہ نگار نے جس التزام کے ساتھ ان اشخاص کو پیش کیا ہے کہ وہ صرف ایسے شخص کا کام ہو سکتا ہے کہ جو عرب و عجم کی تاریخ اور ان کی روایات سے کافی واقفیت رکھتا ہو۔ مثلاً ہوشربا میں افراسیاب شہنشاہ ہوشربا کے یہاں سب سے عجیب شئے جو بتائی گئی ہے وہ اس کا گنبد نور ہے اسی طرح زمرد شاہ باختری کی خدائی کا کارخانہ قلعوں سنگ بیر قائم ہے۔ عمرو بن امیہ ضمری کو جو حقیقتاً اس طویل افسانہ کی جان ہے۔ اپنی خصوصیت تیز رفتاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور خود اس کی زبان سے بارہا کہلایا گیا ہے کہ

دوندہ جہانگیر طرار ہوں	جہانگیر عالم کا عیار ہوں۔
میں تیز رفتار ہوں گرم قدم	سیاہ ٹھوکریں کھائیں ہر ہر قدم
اڑا دوں صبا کے بھی میں ہوش کو	نہ پائے مری گرد پاپوش کو

حمزہ صاحبقراں کو سنجیدہ، نیکوکار، اور زبردست پہلوان بنایا گیا ہے۔ جس کے ساتھ ہر وقت تائید غیبی موجود رہتی ہے۔ ہر جنگ و فرامرز کو شکست پر شکست دلوا کر زردی کی خاک چھنوائی۔ مالک اژدر کو بے مثل نیزہ باز دکھایا گیا۔ سامری و جمشید کو ساحروں کا خدا بنا کر پیش کیا۔

افسانہ کا ماخذ

یہ افسانہ جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں، ہندوستانی، ایرانی، یونانی اور تورانی خرافیات سے ماخوذ ہے۔ مسلمانوں میں چوتھی صدی ہجری سے خوب بڑے پیمانہ پر افسانے لکھے جانے لگے۔ میرا خیال ہے کہ عربی زبان میں سب سے پہلا بڑا افسانہ کتاب الاغانی ہے۔ جو ابو الفرج الاصفہانی المتوفی ۳۵۶ھ نے چودہ حصوں میں لکھا۔ اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے ایک دوسرے سے الگ افسانے لکھے گئے ہیں۔ اکثر ان میں مشہور تاریخی شخصیتوں کے متعلق لوگوں سے سن سنا کر درج کر لئے گئے ہیں۔ اور کچھ مصنف کے طبع زاد بھی ہیں۔

اس کے بعد دوسری زبانوں کے افسانے کی بنیادوں پر عربی میں افسانے لکھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی کے اوائل میں مشہور کتاب الف لیلہ بن کر تیار ہوئی۔ یہ کتاب داستان سیف بن یزن فارس الیمن، کتاب الاغانی داستان شہرزاد (فارسی) اور کلیلہ و دمنہ وغیرہ چند کتابوں اور کان پڑے افسانوں سے مرتب ہوئی۔ مجھے سیف بن یزن کی داستان کے مکمل سترہ حصے جب ملے تو میں نے دیکھا کہ الف لیلہ کا بیتل کا شہر اور طلسمی گھوڑا۔ وغیرہ تقریباً ۵ فی صد داستانیں بعینہٖ اسی داستان سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے قصوں کا بڑا مجموعہ (*Legend of the Bani Israil.*) کے نام سے میں نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاہنامے کے کئی کردار ان خرافی افسانوں سے لئے گئے ہیں۔ اور اسی طرح چینی افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلوانوں کے متعلق جو کچھ شاہنامہ میں ہے وہ ان ہی افسانوں سے ماخوذ ہے۔ غرض یہ کہ داستان امیر حمزہ مختلف قوموں کی خرافی روایات کا مربوط اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس میں وہ تمام نقوش ملتے ہیں۔ جو داستان عجم، الف لیلہ، قصہ سیف بن ذی یزن، اسرائیلی خرافیات، ہندوستانی کہانیاں، مہابھارت کے فرضی افسانوں اور یونان کے نا عقل میں آنے والے نقوں میں موجود ہیں۔ مؤلف داستان امیر حمزہ کا

یہ کمال ہے کہ انہوں نے ان بل بے جوڑ قصوں کو اس طرح مربوط و مسلسل کر دیا ہے کہ بار بار ایک قسم کے حوادث کا ذکر ہونے کے باوجود نہ صرف طبیعت پر بار نہیں ہوتا بلکہ دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ اس ضخیم کتاب کے تقریباً ۲۵ ہزار صفحات میں سے جہاں سے جی چاہے کھول کر پڑھنا شروع کر دیجئے۔ دو چار صفحات پڑھنے کے بعد آپ افسانہ کے تمام کردار کو اچھی طرح پہچان جائیں گے۔ اور اس یقین کے باوجود کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ناممکن ہے۔ آپ آگے پڑھنے پر اپنے کو مجبور پائینگے۔

اردو میں یہ افسانہ کیسے آیا اس کے بارے میں اس کی تمام جلدوں پر لکھا ہوا ہے کہ اصل میں یہ افسانہ شہنشاہ اکبر کی دلچسپی کے لئے علامہ فیضی نے مرتب کیا تھا۔ اور اب منشی نولکشور نے اسے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔

منشی احمد حسین قمر نے طلسم ہوشربا کی چھٹی جلد میں لکھا ہے کہ علامہ فیضی کی تصنیف کردہ کتاب میں صرف چند چھوٹے چھوٹے قصے تھے۔ اردو کا جامہ پہنانے والوں نے اسے ترقی دیکر صدگونہ کر ڈالا۔

منشی آغا محمد صاحب تہر لکھنوی مرحوم نے جلد اول کی تقریظ میں لکھا ہے کہ دفتر میں ایک ایک قصہ فارسی میں لکھا تھا وہ بھی کسی کو نہ ملتا تھا منشی جاہ نے اسکو عبارت رنگین اور مضمون نمکین میں تفریح وار لکھا والسلام کیا۔

ساتویں جلد طلسم ہوشربا کی تقریظ میں منشی رتن ناتھ سرشار لکھنوی نے لکھا ہے:

"امیر حمزہ صاحبقران کی مشہور و معروف داستان جس کے نام سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اور جس کے مطالعہ کا ایک عالم شائق ہے۔ عرصہ بعید اور مدت مدید سے اس ملک میں رائج ہے۔ اس کی نسبت مشہور ہے کہ علامہ ابوالفیض فیضی فیاضی نوراللہ مضجعہ نے جلال الدین اکبر بادشاہ دہلی کی تفریح طبع اور دل بہلانے کی غرض سے اس لطف و خوبی اور انتہا کی خوش اسلوبی کے ساتھ تصنیف کیا کہ جا بجا ہندوستان میں اس کے بندے گزرے گئے"

منشی قمر نے پانچویں جلد میں یہ لکھا ہے کہ اصل فارسی میں جو ترتیب قصہ کی تھی میں نے جہاں اور بہت سے قصے نئے ملا کر لکھے ہیں، نیز قصہ کی اصل ترتیب بھی بدل دی۔

منشی جانکی پرشاد لکھنوی ایک مشہور داستان گو نے کچھ نئے افسانے اسی قسم کے تصنیف کئے تھے۔

منشی تہر نے ساتویں جلد میں لکھا ہے کہ میں نے وہ افسانے بھی اس میں شامل کر لئے ہیں۔

غرض ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ فیضی نے بنیادی فارسی داستانوں کے لکھے۔ مترجمین نے اضافہ تفصیل و تبدیلی سے کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ میں نے کہیں اصل فارسی کتاب نہیں دیکھی۔ لکھنؤ میں بھی کہیں پتہ نہ چل سکا

ایک کتاب بیروت (شام) سے چار جلدوں میں کوئی تیس سال ہوئے کہ شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نام قصۃ الامیر حمزۃ البہلوان ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ پلاٹ یہی ہے، کردار اور مقام سب یہی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق بتایا گیا ہے کہ فارسی سے عربی میں منتقل کی گئی ہے۔ میں نے یہ کتاب ساری پڑھی ہے۔ کچھ طلسمی قصے اور دیوپری کے افسانے تو اس میں ہیں۔ مگر ایرج۔ بدیع الزمان۔ نورالدہر اور افراسیاب وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں۔ صرف ابتدائی دو جلدوں (یعنی نوشیرواں نامہ) کا ترجمہ بلکہ تلخیص معلوم ہوتی ہے۔

ایک اور کتاب داستان امیر حمزہ کے نام سے چار چھوٹی چھوٹی جلدوں میں فارسی میں موجود ہے۔ اس کا قلمی نسخہ میں نے دیکھا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا منشی عبداللہ نے ترجمہ کیا۔ اور منشی تصدق حسین کی نظر ثانی کے بعد غالباً ۱۲۸۸ء میں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔

فسانہ کی خوبی اور کمال پر مجھے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر علامہ شبلی نے لکھا تھا، تو یقیناً ان کے دماغ میں ایسی صلاحیت موجود تھی۔ اور اگر کسی نے اور لکھا ہے تو اسے فیضی کا مثیل و عدیل سمجھنا چاہیئے۔ مختلف اقوام کی خرافیات سے اتنی تفصیلی واقفیت وسیع مطالعہ کا پتہ دیتی ہے۔

مجھے اس وقت اس کتاب کے اردو ترجمہ سے بحث ہے۔ اور پوری داستان نہیں بلکہ صرف طلسم ہوشربا کی چند اہم خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اسلئے تھا کہ ناظرین کا اصل داستان سے تعارف ہو جائے۔

اردو ترجمہ

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر آیا ہوں داستان طلسم ہوشربا کی مع بقیہ ہوشربا سات جلدیں ہیں۔ جن میں سے ابتدائی چار جلدیں منشی محمد حسین جاہ لکھنوی کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور باقی تین جلدیں منشی احمد حسین قمر لکھنوی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ جلدیں منشی نولکشور صاحب سی آئی ای مالک مطبع اودھ اخبار لکھنؤ نے ۱۸۸۳ء تا ۱۸۹۰ء لکھوا کر شایع کیں۔

قبل اس کے کہ میں ترجمہ پر تفصیلی بحث کروں۔ دونوں داستان گویوں کا مختصر تعارف کرتا ہوں

(۱) منشی محمد حسین جاہ شرفاء لکھنؤ میں سے آبائی پیشہ دربار کی ملازمت تھا۔ تعلیم لکھنؤ ہی میں پائی۔ فارسی اور اردو کے ادیب تھے۔ شاعری میں حضرت آمیر سے مشورہ کرتے تھے۔

جب عہد واجد علی شاہ میں سلطنت اودھ انگریزی عملداری میں شامل کر دی گئی تو جاہ نے معاشی پریشانی سے تنگ آکر پیشۂ داستان گوئی اختیار کر لی۔ جو لوگ کسی قدر مرفہ الحال بچ گئے تھے وہ مدد کر دیا کرتے۔ اور یہ بیچارے زندگی بسر کرتے رہے۔ ۱۸۸۳ء میں منشی نولکشور نے ہوشربا کی داستان کا کام انکے سپرد کیا۔ خود ان کے بیان کے مطابق انہوں نے ملا فیضی کی لکھی ہوئی چھوٹی سی کہانی کو پھیلا کر بڑی داستان بنا دیا۔ چار جلدیں لکھ کر تمام کی تھیں کہ غریب کا وقت ۱۸۹۰ء میں بمقام لکھنؤ انتقال پایا۔

زبان پر ان کو اپنے جانشین منشی احمد حسین قمر سے زیادہ عبور حاصل تھا۔ انکی لکھی ہوئی جلدوں کا مقابلہ بقیہ جلدوں سے کیجئے۔ تو ان کی زبان دانی کا اندازہ ہوتا ہے

(۲) منشی احمد حسین قمر۔ خود انہوں نے پانچویں جلد ہوشربا میں لکھا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد شاہان اودھ کے جاگیردار تھے۔ شاہی ختم ہوئی تو جاگیر ضبط ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامہ میں گھر تاراج ہو گیا۔ رہا سہا جاتا رہا۔ اس کے بعد مدتوں یہ بیمار رہے۔ اچھے ہوئے تو داستان گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔ شاعری میں ان کا درجہ اپنے پیشرو منشی جاہ سے بڑھا ہوا ہے۔ انہوں نے سلسلۂ داستان ہوشربا میں بہت سے اضافے کئے۔ طلسم فتنہ نور افشاں کی جلدیں جتنی بھی استادوں کا ضمیمہ سمجھئے۔ ان کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ ملا فیضی نے جو تقسیم و ترتیب قائم کی تھی۔ اسے انہوں نے بدلکر کچھ کا کچھ کر دیا۔ اس کے علاوہ خود کئی نئے دفتر بھی تصنیف کئے۔ ایک جگہ ساتویں جلد ہوشربا میں لکھتے ہیں۔

"ملا فیضی صاحب وغیرہ نے جو ہفت دفاتر نوشیروان نامہ وغیرہ تحریر فرمائے۔ بدیع الزمان گرد لشکر شکن کے بہت مرتبے بڑھائے کوچک باختر و بالا باختر میں بدیع الزمان و قاسم نے بڑی بڑی لڑائیاں فتح کیں۔ سمرقند ملک سمجان لقب پایا حقیر کو حفظ مراتب کا خیال آیا کہ اسد بھانجے ہیں۔ اور بدیع الزمان ماموں۔ اتنے بڑے طلسم ہوشربا میں کوئی لیاقت نہ پائیں۔ پس حقیر نے داستان میں خورشید روشن ضمیر کی تصنیف کیں۔ ۱۸۹۵ء تک منشی قمر زندہ تھے۔ استاد جلال اور ماہ سے گہرے تعلقات تھے۔ وفات کب ہوئی معلوم نہ ہو سکا۔

اب ترجمہ پر ذرا تفصیلی نظر ڈالئے۔ تو سب سے پہلے آپ کو آداب و ترتیب داستان ملیگی۔ جس میں عموماً۔ حمد۔ نعت۔ مناقب۔ ساقی نامہ اور چہرہ ہوتا ہے۔ ان کے نمونے کتاب میں ملینگے۔ ان کے علاوہ زبان کے نمونے حسب ذیل قابلِ داد اور قابلِ غور ہیں۔

(۱) شاہی و شہریاری زبان۔ (۲) کنیزوں، اصیلوں اور پیش خدمتوں کی زبان۔ (۳) شریف خواتین کی زبان۔ (۴) ڈومنیوں، گائیوں اور بیسوائیوں کی زبان۔ (۵) بازاری شہدوں کی زبان (۶) دیہاتیوں کی زبان (۷) سپاہیوں کے اصطلاحات۔ (۸) تارک الدنیا فقیروں کی زبان۔ (۹) برہمنوں کی خاص زبان۔

اسی طرح منظر نگاری میں۔ صبح۔ شام۔ دوپہر۔ صحرا۔ باغ۔ میدان جنگ۔ محفل نشاط۔ دریا۔ زنگار۔ شہر۔ دربار۔ میلا ٹھیلا۔ وغیرہ

جذبات نگاری میں۔ ہجر۔ وصل۔ جرأت۔ شرم۔ غصہ۔ غرور۔ عصبیت۔

تاریخ تمدن میں۔ رسوم ولادت۔ شادی۔ وفات۔ درباداری۔ چڑھاوے۔ مختلف طرز تعمیر۔ طریقہ جنگ۔ دستور لشکر کشی۔ صلح۔ انتظام ملکی۔ مختلف طبقات کے لباس۔ ہتھیار۔ فنونِ جنگ۔ اور توہمات وغیرہ۔

چونکہ ان سب کے نمونے نقل کرکے ان پر تقریظ اور ان کی توضیح کیلئے رسالہ کی وسعت کافی نہیں ہوسکتی اسلئے یہ مضمون کتاب کی شکل میں شائع کیا جائیگا

پنکھڑیاں

ٹیگور کے دو دلکش نغمے

(از جناب افسر ماہ پوری)

رات کو

رات کو
جب آواز تھک جاتی ہے۔
تو سمندر کی آوازیں ہوا کا دامن
بھر دیتی ہیں۔
دن کی منتشر آرزوئیں
روشن چراغ کے گرد
آرام کرنے کے لئے
لوٹ آتی ہیں۔
محبت کے کھیل
عبادت میں بدل جاتے ہیں۔
زندگی کا چشمہ
گہرائی میں اتر جاتا ہے اور
دنیائے اشکال
ہر شکل سے بے نیاز ہوکر
نشیمنِ حسن میں
واپس
آجاتی ہے۔

اندیکھا دولہا

لمعات عروسی
شام کی تاریکی میں
محصور ہیں۔
چڑیوں نے
اپنا آخری گیت ختم کردیا ہے
اور ہوائیں
سطح آب پر
محو استراحت ہیں۔
غروب آفتاب نے
دلہن کے کمرے میں
سُرخ چادریں پھیلادی ہیں اور
چراغ
رات بھر جلنے کے لئے
تیار کئے جارہے ہیں
سکوت کے پیچھے
اندیکھا دولہا چل رہا ہے۔
نہ جانے کیوں میرا دل لرز رہا ہے۔
تمام گانے خاموش ہیں
کیونکہ
شام کے ستاروں کی چھاؤں میں
شادی کی رسمیں ادا کی جائینگی

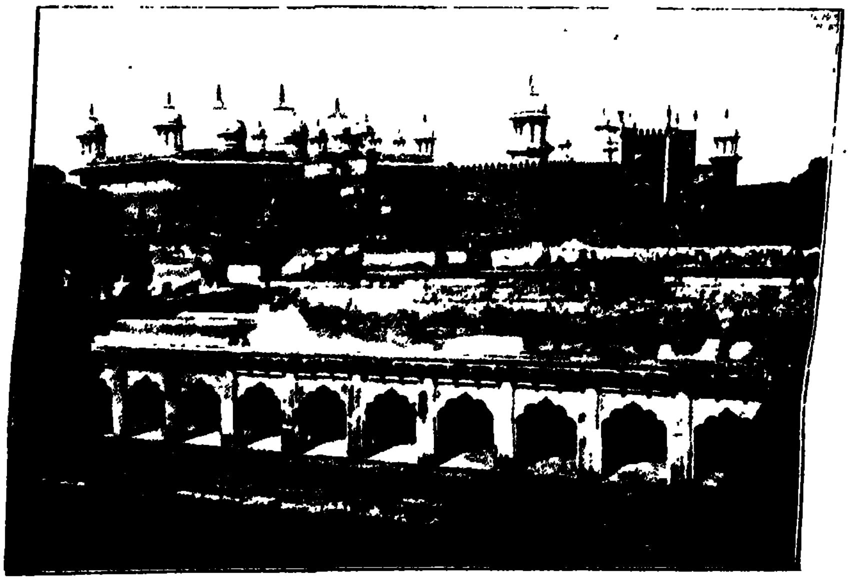








اکبر کا دیوان خاص فتح پور سیکری



موتی مسجد آگرہ

اعلان جنگ

ہٹلر کی بین الاقوامی شہرت کا دارومدار سائنس کی ترقی پر ہے۔ اس نے نئے نئے قسم کے گیس، سامان جنگ تیار کر کے ساری دنیا کی عقل کو پریشان کر دیا ہے۔ وہ اپنی سائنس کی ترقی کے آگے دنیا کی ساری طاقت کو ہیچ سمجھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود بڑی بڑی طاقتوں کے مخالف ہوتے ہوئے بھی یورپ کے اکثر ممالک کے ساتھ اعلان جنگ کر چکا ہے۔

زلف سنبل ہیئر آئل۔ سائنس کی بہترین ایجاد ہے۔ اس نے طبی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ اسکے بیشمار فوائد نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ زلف سنبل ہیئر آئل کے مندرجہ ذیل خواص ہیں

(۱) دماغ کی تھکاوٹ دور کر کے قوت پہنچاتا ہے (۲) درد سر اور نزلہ کا خاندانی دشمن ہے۔ (۳) سر کے اُڑے ہوئے بالوں کو جماتا ہے (۴) سر کے چکر دل کی گھبراہٹ کو دور کرتا ہے (۵) دماغ کو فرحت اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے (۶) اختلاج قلب کیلئے بیحد مفید ہے۔ (۷) چشمہ کی محتاجی کو دور کرتا ہے (۸) دفعہ کو صاف کرتا ہے (۹) بالوں کو مثل موتی کے چمکیلا اور مثل ریشم نرم بنا دیتا ہے (۱۰) ہسٹریا کے مریضہ کی سوزش ہاتھ پیر کی جلن کو دور کرتا ہے (۱۱) خوشبو دلکش اور تیلوں کا سرتاج ہے (۱۲) آشوب چشم، سرخی چشم، خارش چشم کو کافور کرتا ہے (۱۳) ناک سے خون آنے کو بند کرتا ہے۔

نوٹ :۔ حضرات اسکے فوائد بیشمار ہیں یہ نہایت خوشبودار تیل ہے اسکو استعمال کر کے آپ جس راستہ سے گذریں گے لوگوں کی نظریں تعجب سے آپکی طرف اُٹھ جائینگی۔ کیونکہ اسکی خوشبو دلکش اور مفرح دماغ ہے۔ غم کو راحت سے بدل دیتی ہے۔ روغن کاہو۔ روغن زیتون۔ روغن دانہ میں جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ مجرب اور تیر بہدف ثابت ہو چکا ہے قیمت فی شیشی عہ تین شیشی ۱؎ چھ شیشی للعہ ایک درجن کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔

سول ایجنٹ :۔ ایچ۔ ایم۔ کمپنی آئی ہاؤس ڈاکخانہ رفیع گنج ضلع گیا

ارشادِ عالیہ

از حضرت علامہ آرزو۔ لکھنوی

دن میں سو رنگ سے گو بادِ صبا آکے گئی
نہ مگر میری تباہی کی ہوا آکے گئی

اثرِ نالہ مبارک کہ وہ غافل یہ کہے
دل ہلاتی یہ ابھی کس کی صدا آکے گئی

تھا محبت بھری اک سانس کا وقفہ کتنا
اتنی ہی دیر میں سو بار حیا آکے گئی

الحذر خوگرِ ایذا کا زوالِ نعمت
بن گئی جاں پہ جب کوئی بلا آکے گئی

بس یہیں تک تھی رہِ نامہ و پیغام کی حد
نہ صبا جاکے پھر آئی نہ ہوا آکے گئی

زندگی کی ہوئی ضامن یہ توجہ تجھ سکی
تھرتھراتی ہوئی بسمل کی قضا آکے گئی

دکھی لوہو وہ زباں جس سے کھلیں گوشِ قبول
اسکو جانے ہی دو لب تک جو دعا آکے گئی

ان تلون پہ بھی یاد اسکی ہے کیا پختہ مزاج
دل میں جم کر نہ رہی عمر بھر آ، آکے گئی

ہر نفس گردشِ نیرنگ کا محور ہے بنا
وہ پلٹ کر نہ پھر آئی جو فضا آکے گئی

کیا نبادیگا نہ جانیں تجھے بڑھتا ہوا حسن
ناز سکھلاتی گئی جو بھی ادا آکے گئی

آرزو مستیٔ شب بنکے رہا دن کا خمار
جھومتی جب کوئی متوالی گھٹا آکے گئی

وہ رات

از جناب سہیل عظیم آبادی

ہر آدمی کی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے۔ جب اسکی خواہش خودکشی کر لینے کی ہوتی ہے۔

وہ رات!! وہ رات بھی عجیب رات تھی۔ جب زندگی سے میں اُکتا گیا تھا —— وہ رات اب بھی یاد آتی ہے۔

چھ سال کے بعد نرائن سے یکایک راستے میں ملاقات ہو گئی وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ ملکر کتنی خوشی ہوئی ہو گی —— سے بہتر سوا میرا کون جان سکتا ہے؟ .... ہم دونوں بڑی محبت سے ملے۔ وہ گھر سے سیر کیلئے آیا تھا۔ اور میں پردیس میں پیٹ پالنے کیلئے محنت کرتا تھا۔ بہت دنوں پر ملے تو ہم لوگ سب کچھ بھول گئے۔ اُس نے مجھ سے اور میں نے اُس سے بہت سی باتیں پوچھ ڈالیں۔

چائے ختم کر لینے کے بعد بھی ہم دونوں بہت دیر تک ہوٹل میں بیٹھے بات کرتے رہے۔ جب باہر نکلے تو دیر تک ساتھ ٹہلتے رہے۔ نرائن دوسری جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔

اچھا! ریاض اب مجھے جانا چاہئے۔ میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ مگر چلو تمہارا گھر دیکھتا چلوں، کل پھر آکر مل لونگا۔

گھر کا نام سنتے ہی میں گھبرا گیا —— میرا گھر! میرے گھر کو دیکھ کر نرائن کیا کہے گا۔ میرے گھر کو دیکھ کر!! وہ مجھے عالیشان کوٹھی میں رہتے دیکھ چکا تھا۔ اگر عالیشان کوٹھی میں نہ رہتا ہوتا تو پھر دوستی ہی نرائن سے کب ہوتی۔ مگر اب —— زمانہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ نرائن کو اپنے گھر لے جاؤں۔ مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر یہ سوچ کر تسکین ہوئی کہ کلکتہ میں جس طرح میں رہتا ہوں، وہ کوئی معیوب طریقہ نہیں۔ زیادہ تر لوگ اسی طرح رہتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"چلو"

ہم دونوں چلے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ گھر کی طرف چلتے ہی بہت سے خیالات میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگے۔ سفر میں ہر آدمی محل میں نہیں رہتا۔ بڑے بڑے آدمیوں کو معمولی طور سے گذارا کرنا پڑتا ہے۔ میں تو اکیلا ہوں۔ دولتمند لوگوں کو یہاں تین چار کمروں میں پورے خاندان کے ساتھ زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ ایسا نہیں کہ نرائن اسے نہ جانتا ہو۔ دوسرے نرائن کو کبھی اس بات کا پتہ نہیں چل سکتا۔ جس سے اسے معلوم ہو کہ میری حالت اب پہلے جیسی اچھی نہیں۔ کمرہ کیسا ہی کیوں۔ لیکن چار منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر میرا کمرہ ہے۔ مکان گندہ ہے۔ مگر صرف نچلی منزل میں، جہاں مزدور لوگ رہتے ہیں۔ اوپر کا حصہ بالکل صاف ستھرا ہے۔ —— اور میرا کمرہ! وہ بھی برا نہیں۔ ہوادار ہے۔ کافی بڑا ہے کرایہ کی مسہری، میز اور کرسیاں بھی ہیں۔ اگر دو مہینے سے کسی چیز کا کرایہ ادا نہیں ہوا تو نرائن کو کیا معلوم۔

مگر پھر بھی میں چپ نہ رہ سکا۔ اور مجھے یہ کہنا پڑا۔

"نرائن! یہاں میرے پاس ویسی شاندار کوٹھی نہیں ہے۔ تم دیکھو گے تو حیرت میں آجاؤ گے۔ کہ میں کتنا بے سروسامان ہوں۔ تم جانتے ہو میں یہاں کاروباری آدمی کی زندگی گزارتا ہوں۔ بالکل ایک بنیا کی طرح

"چھاتی ٹھاٹ ختم"

نرائن نے کہا۔

"باوا کا پیسہ نہیں ہے اب؟ اب تو اپنی کمائی ہے نا......."

میں مطمئن ہوگیا۔ نرائن کو میری طرف سے اتنی خوش فہمی ہے۔ میری جیب میں پانچ روپے اور کوئی آنے پیسے تھے۔ مجھے اطمینان تھا کہ اتنے نارائن کی خاطر کی جا سکتی ہے۔ چائے، کیک اور پان سگریٹ آسکتا ہے۔ زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔ نرائن یہ تو جانتا ہی ہے کہ میں کوئی لکھ پتی نہیں۔

ہم دونوں تیزی کے ساتھ چل رہے تھے۔ راستہ میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر ہم لوگ اس چار منزلہ عمارت کے قریب آگئے۔ جہاں مجھ جیسے بہت سے آدمی کبوتروں کی طرح رہتے ہیں۔ دن بھر کڑی محنت کرکے روٹی کماتے ہیں۔ اور رات کو تھوڑی دیر چڑیوں کی طرح شور مچا کے سو رہتے ہیں۔ میں نے نرائن کو مکان دکھایا۔ باہر سے بڑا شاندار اور پر رونق تھا۔ باہری حصے میں ایک حلوائی کی دوکان تھی۔ ایک بنگالی کا ہوٹل تھا اور ایک پان بیڑی کی دوکان۔ میری ضرورت کی ساری چیزیں فوراً ہی مل سکتی تھیں ——— میں نرائن کو ساتھ لیتا ہوا اندر آیا۔ نچلی منزل میں کچھ مزدور انگیٹھیوں پر اپنا کھانا پکا رہے تھے۔ کوئی گیت گا رہا تھا اور کوئی دوسرے سے اپنے گھر کی باتیں دہرا رہا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ نرائن میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ریمارک نہ کرے۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ آخر اس نے کہہ ہی دیا۔

"ریاض! تم اس مکان میں کس طرح رہتے ہو۔ اور اب تک زندہ کیسے ہو؟"

مجھے نرائن سے اسی کی امید تھی۔ وہ دولتمند آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری زندگی اسے نہیں بھائے گی۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"نرائن یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ مجھے تو ایسا آرام اور کہیں نہیں مل سکتا۔"

وہ بولا۔

"اور یہ ہنگامہ"

"کیا کیا جائے۔ مگر خلوص اور محبت انہیں غریبوں میں ہے۔"

نرائن کو لیکر میں اپنے کمرے کے سامنے پہنچا۔ میرے کمرے کے دروازہ میں دو تالے بند تھے۔ ایک تو میں نے خود ہی بند کر رکھا تھا۔ دوسرا کس نے بند کردیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں گھبرا گیا۔ آخر یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ ایک میرے دوست بھی ٹھہرے ہیں۔ شائد انہوں نے ہی دوسرا تالا لگا رکھا ہے۔ حالانکہ اس تالے کی ایک کنجی میں نے انہیں دے رکھی تھی۔ اور دوسرا تالا انہیں بند کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

نرائن نے معذرت کی۔ اور جانے کی اجازت چاہی۔ وہ ایک دوسرے دوست کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ اور نرائن کو رخصت کرکے پھر اپنے کمرے کی طرف چلا۔ جیسے ہی میں مکان میں داخل ہوا۔ اور سیڑھی پر پاؤں رکھنا چاہا۔ مکان کے بوڑھے دربان نے کہا۔

صاحب آپکے کمرے میں تالا میں نے بند کیا ہے۔ مالک کا یہی حکم ہے۔ آپ نے تین مہینے سے کرایہ نہیں دیا ہے سیٹھ صاحب بہت رنج تھے۔

میں نے دربان کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس نے پھر کہا۔

"میں تالا اس وقت تک نہیں کھول سکتا۔ جبتک آپ کرایہ نہ ادا کردیں۔"

"آخر کرایہ کبتک دینگے آپ؟"

میں مشکل سے کہہ سکا۔

"جلد ہی ادا کردونگا۔"

اتنے میں دو تین مزدور آگئے۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ جیسے میں نے چوری کی ہو۔ سارے بدن میں ایک قسم کی گرمی پھیل گئی۔ اور میں بات بڑھنے کے ڈر سے کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے باہر چلا آیا۔

سڑک پر وہی بہار تھی۔ کہیں کسی قسم کی کمی نہ تھی۔ ہوٹل کے

سامنے کچھ لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور گھوڑ دوڑ کی باتیں کر رہے تھے۔ روپیوں کی باتیں سن کر مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ اور ہلکی ہلکی سردی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ میں گرم کپڑے بھی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ سوچنے لگا۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ تین مہینے کا کرایہ کسطرح ادا ہو۔ میری جیب میں پانچ روپے اور چند آنے ہیں۔ یہی میری کل پونجی ہے۔ اور تین مہینے کا کرایہ دینا ہے ———— یعنی اکیس روپئے۔ آخر آئینگے کہاں سے؟ سوچتا ہوا آگے بڑھا۔ تھوڑی دور جاکر ایک اور چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ مجھے تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ میں ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ ہوٹل گرم ہو رہا تھا۔ میں نے کھانے کو مانگا۔ لقمہ حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔ پھنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کھانے میں ذرا بھی مزا نہ ملا۔ پھر چائے منگائی۔ اتنے میں ایک قد آور آدمی رکشے سے اتر کر ہوٹل میں آیا۔ اور چائے مانگی۔ ہوٹل والے نے پوچھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے سیٹھ؟"

"ارے یار تو روز ہی ٹوکا کرتا ہے۔ ارادہ کہاں کا ہوگا۔ جانتا ہی ہے تو ——"

ہوٹل والے نے پھر پوچھا۔

"بس چمپا کے گھر اور کہاں"

ہاں تو اور کہاں۔ میرا اور کہاں گھر ہے۔ دن بھر محنت کی۔ رات کو اس کے گھر آرام کیا۔

میں نے پیسے دیئے۔ اور کچھ سوچے سمجھے بغیر چل پڑا۔ نو بج چکے تھے۔ خیال آیا کہ رات کس طرح کٹیگی۔ کسی دوست سے کچھ روپئے قرض لیکر دربان کے حوالہ کردوں۔ اور بقیہ روپیوں کا حلّ کردوں۔ لیکن خیال آتے ہی یہ بھی یقین آگیا کہ یہ کبھی نہ مانے گا۔ یہ شخص پہلے پولیس میں جمعدار تھا۔ اس کے دل میں رحم کہاں! اس کا جھرّی والا چہرہ اور گھسے ہوئے دانت اور دھنسی دھنسی آنکھیں یاد آگئیں۔ یقین ہو گیا کہ وہ کبھی نہ مانے گا۔ جس طرح بھی ہو۔ لیکن پورے اکیس روپئے دینے ہونگے۔ لیکن ساتھ ہی ایک خوشی ہوئی۔ اُس نے نرائن کے سامنے کچھ نہیں کہا۔ میری عزت رہ گئی۔ اگر اسکے سامنے کچھ کہدیتا تو بڑی بے عزتی ہوتی۔ لیکن پھر خیال ہوا۔ مگر بیچارہ کہاں رہے گا وہ غریب میرے ساتھ آکر ٹھہرا ہے۔ اگر دربان نرائن کے سامنے کہدیتا تو یہ عیبت ہی ختم ہو جاتی۔ وہ فوراً جیب سے روپئے نکال کر دیتا۔ سوچا کہ نرائن سے چل کر روپیہ قرض لے جائیں۔ مگر وہ کہاں ٹھہرا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا۔

اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا کچھ دور اور بھی نکل گیا۔ مسجد سے نماز پڑھ کر لوگ نکل رہے تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ بعض ملاقاتی بھی تھے۔ باتیں کرنے لگا۔ لیکن دل ڈھونڈھتا ہوا تھا۔ مسجد سے سیٹھ یعقوب نکلے۔ صاحب سلامت ہوئی۔ چھرہرے کے بڑے آڑھت دار تھے۔ اپنی عادت کے مطابق بڑے تپاک سے ملے۔ باتیں کرتے ہوئے اپنے مکان تک لیگئے۔ پھر چائے پلائی۔ پان کھلایا۔ ان کے کچھ اور ملنے والے بھی تھے۔ اُن سے ملایا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ تپاک سے کہا۔

آپ سے جب ملاقات ہوتی ہے۔ دل خوش ہو جاتا ہے۔ بہت دنوں پر ملاقات ہوئی ہے۔ دل نہیں چاہتا کہ جانے دوں۔ مگر مجبور ہوں۔ بہت سے دوست آگئے ہیں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ کہاں کہاں اور کس طرح ان لوگوں کے سونے کا انتظام کروں گا۔

میرا دل سن سے ہو گیا۔ میں جب کبھی بھی اُن سے ملنے آتا تھا۔ تو وہ ٹھہر جانے کی ضد کرتے تھے۔ اس رات کو وہاں باتیں کرتے کرتے جب دیر ہو گئی تو میں نے سوچا کہ انہیں کے وہاں سو رہونگا۔ لیکن سیٹھ یعقوب کے ایک جملے نے مجھے پھر بدحواس کر دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کلکتے میں چار وقت کھانا کھلا دینا آسان ہے۔ مگر ایک وقت ٹھہرنے کی جگہ دینا مشکل ہے۔ ایک دل چاہا کہ سیٹھ صاحب سے سارا حال کہدوں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ گیا۔ دس بجگئے تو اُن سے رخصت ہوا۔

اب پھر میں بازار میں تھا۔ بازار میں وہی رونق تھی۔ صرف میں اُداس تھا۔ یا اگر دوسرے ہوں بھی تو میں انہیں جانتا نہ تھا۔ میں سر جھکائے فٹ پاتھ پر چلا جارہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ آج کہاں سونے کی جگہ ملسکتی ہے۔ یہ ناگہانی مصیبت کیسے ٹلے۔ لیکن سارے کلکتے میں میرے لئے پناہ کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اور میرا دماغ ایسی جگہ ڈھونڈ ھو نکالنے کی فکر میں ہر ملاقاتی کے گھر کا چکر کاٹ رہا تھا۔ لیکن آخر میں دل کہتا تھا کہ وہاں جانا مناسب نہیں ـــــ

اسی طرح کی باتیں سوچتا ہوا میں ایک پارک کے قریب پہنچا۔ سارا بدن تھکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بے سمجھے بوجھے پارک میں جاکر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہاں ہلکی ہلکی سردی محسوس ہونے لگی۔ شبنم برابر گر رہی تھی۔ پاس ایک دوسرے بنچ پر ایک بنگالی نوجوان بیٹھا تھا۔ سر کے بال پاگلوں کی طرح بکھرے ہوئے۔ وہ بنچ بجلی کی روشنی سے بالکل ہی قریب تھا۔ اس روشنی میں وہ ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور اس انداز سے جیسے وہ ختم کرکے اُٹھنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

لیکن بنگالی نوجوان کی طرف سے میرا خیال فوراً ہی ہٹ گیا۔ میں پھر رات کے وقت ٹھہرنے کی فکر میں لگا رہا۔ اب مجھے ہلکی ہلکی سی نیند بھی آنے لگی تھی۔ سخت فکر ہوئی۔ پارک میں اکادکا آدمی باقی رہگئے تھے۔ میں بنچ پر لیٹ گیا۔ دل چاہا کہ کوئی درد بھرا گیت گاؤں۔ اور خوب جی کھول کر روؤں۔ مگر نہ گا سکا نہ رو سکا۔ پارک کے چاروں طرف سڑک کے بعد عالیشان مکانات تھے۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اور دل میں ایک ہوک اُٹھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ آج کی رات پارک ہی میں کاٹ دونگا۔

میں یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ پارک کے پہرہ دار نے آکر مجھے اُٹھایا اور کہا۔

"بابو صاحب یہاں سونے کا حکم نہیں ہے"

میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا۔

نہیں سو نہیں رہا ہوں ـــ

"اب جائے گھر گیارہ بج رہے ہیں۔ اب پارک کے دروازے بند کردونگا"

میں نے بڑے تالاب کو دیکھا۔ جو پارک کے بیچوں بیچ میں تھا۔ پھر پانی پر آس پاس کے مکانات میں جلنے والے بجلی کے قمقموں کا عکس کھیل رہا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ اب کہاں جاؤں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ اسوقت کون جگہ دے گا۔ آخر ایک دوست یاد آگیا صفدر۔ لیکن صفدر اس جگہ سے پانچ میل کی دوری پر رہتا تھا۔ سوچنے لگا کیسے جاؤں؟۔ جانیکیلئے کوئی سواری بھی نہ تھی۔ اور ٹہلتے ہوئے پہنچ جانا سخت مشکل تھا۔ معلوم ہوا جیسے کسی نے امید کے چراغ کو پھونک کر بجھا دیا۔ پھر سارے بدن میں گرمی پھیل گئی۔ یکایک وحشت کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ دل چاہا کہ اس تالاب میں کود کر جان دیدوں کہ اس قسم کی لاابالی زندگی کا خاتمہ ہوجائے۔

میں پارک سے سوچتا ہوا نکلا۔ آخر یہ زندگی کیا ہے؟ صبح سویرے اُٹھتا ہوں معمولی سا ناشتہ کرکے کام کی تلاش میں نکلتا ہوں۔ جہاں جو کچھ ملگیا۔ کھالیا۔ کبھی دوستوں کے چائے پر ہی سارا دن کٹ گیا۔ قرض پر ساری امید ہے۔ نہ رہنے کا ٹھکانا اور نہ کھانے کا۔ اب اس وقت کہاں جاؤں۔ کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ میرا کونسا ایسا ہمدرد بیٹھا ہے۔ جو اسوقت پناہ دے گا۔

میں بڑھتا چلا گیا۔ جتنا زیادہ سوچتا تھا کہ کہاں رات کو پناہ لیجائے۔ دماغ اتنا ہی زیادہ الجھتا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ کسی درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر پڑ رہوں ـــ سڑک کے کنارے ہر درخت کو دیکھتا جاتا تھا کہ کوئی مناسب درخت ملجائے۔ جسکے پیچھے چھپ کر زمین پر لیٹ سکوں لیکن کوئی ایسا درخت بھی نظر نہ آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا میں میرے لئے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔

یکایک ایک بازاری نوجوان بیچ سڑک سے گاتا ہوا گذرا ـــ

کوٹھے پر جو بجر گئی۔ دل پہ چھری چل گئی۔ بانکی ایسی بیسٹر یا کرے ہے انتظار......

یکایک معلوم ہوا جیسے ساری مشکلات حل ہوگئی بس آجکی رات بیسٹر یا کے گھر۔ بہت سے لوگ وہاں جاتے ہیں۔ لیکن میں ہیں بہت ہی قلاش آج آ ملا ہوئی۔ سوچا۔ آج کی رات تو بسر کسی کے ہاں ہی ہو [illegible]

میں سیدھا اس محلے میں چلا گیا جہاں بیسٹر یا لوگ انکا انتظار کرتی رہتی ہے۔

وہ رات مجھے آج تک یاد ہے ـــ

طوفانِ نوح

(از ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

بس اس کے سوا اور کی فریاد غلط ہے
محرومِ کرم ہے تو مرا دل ہی فقط ہے

یہ تیری قسم میری تسلّی کو فقط ہے
جو عہد غلط ہے وہ بہر طور غلط ہے

مقصد کوئی پورا ہو یہ اُمید غلط ہے
توفیقِ عمل ہم میں نہیں جوش فقط ہے

قاصد تری تقریر سمجھ میں نہیں آتی
بھیجا تھا جو میں نے اُنہیں تو وہی خط ہے

آجائے گا کچھ صبر ترے عذرِ ستم پر
غم اس سے ہمارا ہو غلط یہ تو غلط ہے

مکتوبِ محبت کی عبارت کو جو پڑھ لے
وہ دل ہی مرا واقفِ اعراب و نقط ہے

قاصد جو کسی کا کہیں مجھ کو نظر آیا
دریافت کیا اُس سے مرا بھی کوئی خط ہے؟

تقدیر بتاتی نہیں رستہ ہیں کوئی
اتنا تو وہ کہتی ہے کہ تدبیر غلط ہے

کیا آپ سے میں راز کہوں دردِ جگر کا
ادراک مجھے کچھ نہیں احساس فقط ہے

یا وہم ہے بیکار کا اُلفت میں مجھی کو
یا آپ کا اقرارِ محبت ہی غلط ہے

اے نامہ رساں کھل گئیں مجھ پر تری چالیں
لکھا نہیں اُن کا یہ لکھایا ہوا خط ہے

پرساں نہیں کوئی شبِ غم اور ہمارا
کہتے ہیں جسے درد وہ ہم درد فقط ہے

ممکن نہیں وہ صفحۂ عالم سے مٹا دیں
کیا لفظِ محبت بھی کوئی حرفِ غلط ہے

خط میں بھی نہ لکھے مجھے حالات کسی نے
القاب ہے آداب ہے بعد اسکے فقط ہے

کیا عہدِ کرم قولِ وفا شرطِ محبت
یہ شرط غلط، قول غلط، عہد غلط ہے

ہم کاتبِ تقدیر کے لکھے کو پڑھیں کیا
ایسا ہے قلم جس میں نہ مد ہے نہ نقط ہے

اُس شوخ کی تحریر سے کیا خوش ہو مرا دل
مطلب تو نہیں ایک بھی تو ہاتھ کا خط ہے

اے نوح تجھے اور تو آتا نہیں کچھ بھی
طوفان اٹھانا ہی ترا شغل فقط ہے

رات کی سنسنی

(از جناب عبدالباقی صاحب بی۔ اے جائنٹ مقصل سپلائی آفیسر گورنمنٹ بہار)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کچھ دوست جیل میں اسیر تھے۔ واقعہ کی تصویر میں 'پرسنل' رنگ آگیا ہے
اس کی معذرت! مقصد صرف ایک قلمی تصویر کھینچنا ہے۔ نتیجہ نکالنا آپ کا کام!

جیل کی رات ——— کیا رات ہوتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہاں کھلی فضا میں آسمان کی نیلی چھت کے نیچے چھٹکے ہوئے تاروں سے نہ تو باتیں کرنے کا موقع تھا۔ نہ غالب کی طرح فطرت کی بدمذاقیوں پر قہقہہ لگانے کا قرینہ۔ ایک کوٹھری تھی اور اس میں سات بجے شام کو ہم چار گنہگار بند کر دئے جاتے تھے۔ اس کے بعد کچھ کچھ موسیقی کے ساتھ گستاخی کی جاتی۔ یہاں سُر اور راگ راگنیوں کی کوئی تمیز نہ تھی، آواز کا ہر بندھا ہوا، پھٹا ہوا، کانپتا ہوا، تھرتھراتا ہوا سلسلہ موسیقی تھا، اور تان سین کی موسیقی کو مات دیتا تھا۔ کبھی شعر و شاعری کے چرچے ہوتے، غالب، اقبال، جوش، جگر، اصغر، اکبر، حسرت، ساغر، جمیل مظہری، اجتبیٰ، سور داس، تلسی داس، کبیر، دنکر، بچن، مہا دیوی پر بہت جنچی تلی تنقیدیں ہوتیں اور ہر شخص اس خیال سے بولتا کہ بولنا چاہیئے اور دماغ پر زور دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ کبھی تلسی داس کے رامائن کی کتھا بھی ہوتی۔ اور اس بوڑھے کے آرٹ کی خوب خوب داد دی جاتی اور کبھی چیر پھاڑ کی جاتی۔

رات کو دس بجے ہم سب اپنے اپنے پلنگ پر دراز ہو جاتے۔ لالٹین کی روشنی قریب قریب بجھا دی جاتی۔ رات قبر کی طرح اندھیری ہی چاہیئے، ورنہ نیند نہیں آتی۔ وہ لوگ بھی کیسے ہیں جو برقی قمقموں میں سوتے ہیں۔ انہیں چور، دشمن کا ڈر ہوگا۔ غریب کو، قیدی کو، بھلا کیا ڈر! جس روز احاطہ میں سانپ نکلا تھا، اُس روز پہلی بار دماغ پر رد عمل ہوا ——— اور اسے خوف ہی کہہ سکتے ہیں ——— کہ لالٹین دھیمی کر دینی چاہیئے، بجھانی نہیں چاہیئے۔ اور اس پر سب کا اتفاق تھا۔ ہم لیٹے رہتے، چپ چاپ۔ کبھی میں مدھم سر میں کچھ گاتا۔ کبھی بینی پوری جوابی تان چھیڑتے۔ ان کے پاس غالب، انیس اور اکبر کا جواب نہ تھا، مجھے سور داس اور تلسی داس کا جواب لانے میں دقت ہوتی۔ اور دونوں اس اندھیرے میں سو جانے کی کوشش کرتے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہم لیٹے لیٹے بحث کرتے۔ ایک روز بحث چھڑی کہ جے پرکاش اچھا نام ہے 'یا رام ورکش بینی پوری' یا 'باقی'........ ہر شخص لغت کا سہارا لیتا، میں نے ایک تو لغوی دلیل پیش کی، دوسرے سامعی اور صوتی، 'با' اور 'قی' میں کس قدر موسیقی ہے، لیکن بینی پوری نے کہا اور وہ 'عدل' بھول گئے۔ اس کا بھی میرے پاس جواب تھا، میں نے جواب دیا بھی لیکن میں کروٹ بدل کر سوچنے لگا کہ "بحث میں یہ لوگ کبھی قائل ہونا ہی نہیں چاہتے ہندوستان کا بھلا کیسے فائدہ ہوگا"

ایک روز شام بہت اداس تھی، شفق کی سرخی پر سفید بادل کا ٹکڑا چھا گیا تھا، بادل سے چھن چھن کر شفق کی جو سرخی آرہی تھی، اس نے سیل کے گھنے پیڑ کی نئی اور نیلی نیلی پتیوں کی چمک کو لال لال گالوں والی اور نیلی نیلی آنکھوں والی جوان دلہن کے سوگ کا آنسو بنا دیا تھا،

جیل خانہ کی آدھی سفید، آدھی سیاہ دیوار پر ہلکی ہلکی سرخی، ہولی کی گرم دوپہر میں کسان کی آنکھوں کے گڈھے کا ابیر اور گلال معلوم ہوتی۔ ہم سب بیل کے پیڑ کے نیچے ہریالی پر لیٹے تھے، بیل پھولوں سے لدا ہوا تھا، اور اس کی بھینی بھینی خوشبو، سہاگ رات کی پہلی صبح کی وہ مہک معلوم ہوتی جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے۔

آیا ہے اٹھ کے نیند سے وہ رسمسا ہوا جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

وارڈر آیا اور اس نے ہمیں باڑے میں بند کر دیا۔ ہم وقت سے کچھ پہلے بند کئے جا رہے تھے، لیکن ہم میں سے کسی نے خلاف معمول اس پر احتجاج نہیں کیا۔ کبھی کبھی بولنے کو جی نہیں چاہتا۔ پڑھنا چاہا پڑھنے میں جی نہ لگا۔ رونا چاہا آنکھیں تیار نہ ہوئیں۔ ہنسنا چاہا تو دم گھٹنے لگا۔ دل بھی بجھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے میں نے گھڑی کے خلاف احتجاج کیا۔ جو ابھی نو ہی بجا سکی تھی اور سانپ کی طرح رینگتی جا رہی تھی۔ یہ پلنگ پر جانا، بیتی پوری کے لئے شاہد اونگھنے کو ٹہلنے کا بہانہ ہوا۔ وہ بھی پلنگ پر پہنچے۔ اور تھوڑی دیر بعد سب پلنگ پر تھے۔ "سب سے پہلے گھنٹی بجانا بھی کتنا مشکل کام ہے" میں نے فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے سوچا —— لیکن نیند نہیں آتی تھی رات اندھیری تھی۔ یہ "اٹھارہ نمبر ٹھیک ہے" کی صدا کس قدر بے معنی ہے، بدتمیزی ہے، بڑی بدتمیزی —— خواہ مخواہ غریب قیدیوں کی نیند پر ڈاکا ڈالا جاتا ہے۔ اور یہ رات کے پہرہ داروں کا فولادی بھدا جوتا۔ اور اسکی صدائے بازگشت کس قدر سامعہ خراش ہے۔ یہ ہر وقت ہٹ پٹ، بھد بھد، ٹیم ٹاخ۔ اور یہ جھینگر، یہ جھینگے، توبہ، توبہ —— یہ دنبھو بی کو دی۔ ستیہ پرکاش کا دودھ چٹ کر جائے گی، کل ہمیں دہی نہیں ملے گا۔ نجانے ستیہ پرکاش نے دودھ میں "جورن" ڈالا یا نہیں وہ تو روز بھول جاتے ہیں۔ عجیب بات ہے۔ اور یہ میری ...... کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک بھی خط نہیں لکھا —— معلوم نہیں زندہ ہیں یا مر گئیں —— قبرستان کتنی بڑی جگہ ہے، سنسان، سناٹا، سب مرنے ہی مرنے —— میں بھی قبرستان نہیں جاؤنگا —— ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ایں! بارہ بج گئے کسی نے کتنا اچھا کہا ہے۔

ابھی بارہ بجا چکی ہے گھڑی رات برسات کی ہے اندھیاری

لیکن اس میں کیا خوبی ہے۔ شش۔ شش۔

ارے یہ کیا —— لاحول ولاقوۃ۔ میرا وہم ہے۔ نہیں پھر آواز آئی۔ توبہ۔ یہ مجھے ہو کیا گیا ہے۔ جائیے جائیے۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں —— وہ پھر آواز آئی۔ نہیں وہم نہیں، واقعہ ہے۔ اف کیسی بھیانک آواز۔ کیا میری ...... بچے مر گئیں۔ لیکن یہاں ان کی روح کیوں آئی۔ کیا میرے بچے کی روح ہے —— خواہ مخواہ میں سڑی کیوں ہو گیا ہوں۔ لیکن یہ آواز تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ کیا اژدہا، ہٹی قریب ہی ہے۔ یہ چڑیل ہے۔ بھوت ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، دماغ پھٹنے لگا سانس اٹکنے لگی، آنکھیں اُلٹنے لگیں —— پھر وہ آواز آئی۔ میں نے گرم چادر اوڑھ لی، سر سے پیر تک۔ نفرو رہجہ سنا ہے، رات کے ایک بجے، اس سناٹے میں، بھوت نہ ہوگا تو کیا ہوگا —— ہاں۔ یا ملک الموت! —— پھر آواز آئی آنکھ کی پتلیاں ناچنے لگیں، رگیں اینٹھنے لگیں سانس رکنے لگی —— ساتھیوں کو آواز دوں، وہ کہیں گے کیسا بزدل ہے —— وہ آواز تو اور قریب ہو گئی توبہ، استغفار۔ اللہ میرے گناہ بخش دے اللھم صل علی محمد اللہ لا الہ الا ھو الحی —— یہ آواز تو میں کان کے پردے پھاڑنا ہی چاہتی ہے، سینہ کی ہڈیاں توڑنا ہی چاہتی ہے —— ہاں یہ موت کا فرشتہ ہے۔ میری روح کو قبض کرلے گا۔ کیا وصیت کروں۔ کس سے وصیت کروں —— پھر وہی آواز —— اب آجا۔ تجھے آنا ہے تو آجا۔ ٹیو ا ہی دبوچے گا نا۔ میں بھی مرنا

تیار ہوں آخر بزدلی کی موت کیوں مروں۔ ۔اب تو آواز پہنچ ہی گئی —— میں چیخا۔

سب دوست جاگ رہے تھے

صبح پہلی تحقیقات اس واقعہ کے بارے میں کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ ہزاری باغ کے جنگلوں کی کوئی چڑیا ہے۔ اور اسے "ہڑونگ" یا "مرگ" کہتے ہیں۔ — کتنا خوفناک، کتنا بھیانک، کتنا ڈراؤنا نام —— جس چڑیا کے نام سے تخیل کانپ جاتا ہو، اس کی آواز سے بارہ بجے رات کو، کان کے پردوں میں شائیں شائیں، دماغ کے خانوں میں جھنجھناہٹ، ژائیں، ژٹ، کلیجہ میں دھڑادھڑ دھڑکن، بدن پر لرزہ طاری ہو جائے، کپکپی ہونے لگے تو اس میں کسی کا کیا قصور!—— یہ رات تھی، اور اندھیری رات۔ اور شام ہی سے اداسی تھی۔

محسوساتِ اثر

از جناب شیام بہادر اثر الہ آبادی شاگرد حضرت نشتر سلونی

اب کی اثر کچھ ایسا بہار چمن میں ہے — پیدا جنوں کا جوش مرے پیرہن میں ہے
بدلا نہ اس کا رنگ زمانہ بدل گیا — اب تک اثر شباب کا چرچ کہن میں ہے
میلا نہ ہوگا زیر لحد پیرہن مرا — اے صبح حشر تیری سپیدی کفن میں ہے
داغوں نے گل کھلائے ہیں سینہ پہ لالہ زار — ہر اک چمن کا پھول ہمارے چمن میں ہے
کچھ سرگذشت بلبلِ آوارہ کی نہ پوچھ — ہر اس چمن میں آج تو کل اس چمن میں ہے
دلچسپیاں ہیں شام غریباں میں بھی اثر — لیکن کہاں وہ بات جو صبح وطن میں ہے

پی کہاں

از جناب بدر سیمابی نقوی [illegible]

ہلکی ہلکی تاریکی........

اودے اودے بادل........

شیتل بوندیں........

خنک ہوائیں........ ....

وہ کھڑی تھی........ کھوئی کھوئی سی........ دریچہ سے لگی ہوئی........

حسین بھولی لڑکی........

آنکھیں منتظر........ اور متجسس........

کالے کالے لانبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے

وہ کھڑی تھی........ کھوئی ہوئی........ خاموش........

پی کہاں کی صدا نے فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیا........

مگر اس کی آنکھیں آکاش کی جانب اٹھ گئیں۔

زُلف و رُخ

(از جناب سید محمد بلگرامی ڈپٹی کلکٹر مونگیر)

باب اوّل ۔ عہد اکبری

ابوالفضل دکن میں تھا کہ شاہزادہ سلیم نے بغاوت کی ۔ اکبر نے ابوالفضل کو دکن سے آگرہ بلایا۔ شاہزادہ سلیم نے خیال کیا کہ یہ شاطر آگرہ پہنچا اور ہماری بازی مات ہوئی۔ اس لئے شاہزادہ کے اشارہ سے راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ نے ریاست گوالیار ضلع نرور موضع انتری میں ابوالفضل کا کام تمام کردیا۔ اور سر کاٹ کر شاہزادہ کے پاس الہ آباد بھیج دیا۔ جمعہ ۴ ربیع الاول سنہ ۱۰۱۱ ہجری۔

ابوالفضل اپنے زمانہ میں بہت بدنام تھا۔ اہل اسلام اُس کو ننگ اسلام سمجھتے تھے۔ چنانچہ میرزا عزیز اعظم خاں کوکہ نے تاریخ رحلت کہی

یَفعَلُ اللہُ مایشاء بحکم اللہ مایُرید   تیغ اعجازِ نبی اللہ سر باغی بُرید

اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور رسولؐ اللہ کا اعجاز تو دیکھو کہ تیغ نے ادھر باغی کا سر کاٹا اور اُدھر تاریخ قتل ہاتھ آگئی۔ یعنی اغی (۱۰۱۱)۔ اس کا جواب عالم غیب سے خود ابوالفضل نے اور عالم شہود سے شاہ ابوالمعالی لاہوری نے دیا۔ میر محمد عسکری بلگرامی اپنی تالیف صحائف شرائف میں لکھتے ہیں :۔

۱ گویند شیخ در خواب آمدہ گفت کہ تاریخ فوتِ من بندۂ ابوالفضل است۔ چرا در کارخانہ حق حیراں ماندہ فضلِ او وسیع است۔ کسے ناامید نہ شود۔"

ایک شخص نے (غالب میرزا عزیز کوکہ نے) ابوالفضل کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہا ہے۔ بھائی! ہمارے مرنے کی تاریخ بندۂ ابوالفضل (۱۰۱۱) ہے اس پر تم کو اتنی حیرت کیوں ہے؟ یہ اللہ کے کارخانے ہیں! اُس کے فضل کی انتہا نہیں۔ کوئی اُمیدوار نااُمید نہیں پھرتا۔

۲ از شاہ ابوالمعالی قادری کہ از خدا پرستانِ لاہور است آوردہ اند کہ گفت۔ من از کارہائے ابوالفضل انکار داشتم۔

شاہ ابوالمعالی قادری لاہوری کا بیان ہے کہ ابوالفضل سے ہم بہت بیزار تھے۔ لیکن ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضرت

نوٹ :۔ چونکہ اس مضمون میں مادہ تاریخ سے بہت کام لیا گیا ہے اس لئے ناظرین کی مزید سہولت کیلئے ذیل کا قاعدہ لکھ دیا جاتا ہے۔

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

(ادارہ)

شبے در خواب دیدم کہ در مجلس شفیع المذنبین علیہ السلام ابوالفضل حاضر گردید حضرتؐ جبہ مبارک را برروئے شیخ انداختہ در مجلس نشاند۔ و فرمود کہ ایں مرد در حیات خود چند روز مرتکب افعال بد گشتہ۔ اما ایں مناجات او کہ ابتدائیش این است

الٰہی نیکاں را بوسیلہ نبی سرفرازی بخشی۔
و بداں را بہ مقتضائے کرم خود دلنوازی کنی

سبب نجات او شدہ۔ آمرزش حضرت آمرزگار برائے نجات گنہگاراں خود بہانہ و وسیلہ می جوید۔ تقدس و تعالیٰ شانہ۔"

شفیع الاُمم کے دربار میں ابوالفضل حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے اپنا جُبّہ مبارک اُس کو عطا فرمایا۔ اور بیٹھنے کی اجازت دی۔ پھر فرمایا کہ دُنیا میں یہ شخص کچھ عرصہ تک گناہوں میں گرفتار رہا۔ لیکن حضرت آمرزگار کی رحمت تو بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک مناجات لکھی تو رحمتِ ایزدی کو بہانہ مل گیا۔ اور اس طرح اس کی نجات ہوگئی۔ وہ مناجات یوں شروع ہوتی ہے۔

خدایا! تیری رحمت سے کوئی محروم نہیں۔
نیک بندوں کو اُن کی نیکی بچالیتی ہے۔
اور گناہ گاروں کو تیری رحمت!

ابوالفضل کی رُسوائی قصّہ طلب ہے۔ اُس زمانہ میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک نے جنت اور دوزخ کی کنجیاں اپنے قبضہ میں کرلی تھیں۔ مذہبی امور میں اکبر بادشاہ تک ان دونوں کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ ملک میں کہرام تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ بات بات پر کفر کا فتویٰ۔ اور کافر بمعنی گردن زدنی! مچھوا ہر روز جال ڈالتا تھا۔ بیوقوف مچھلیاں ہر روز اُس کے جال میں تڑپا کرتی تھیں۔ مچھوے نے حسبِ معمول ایک دن جال ڈالا۔ قضا کار دو مچھلیوں نے اُس دن حرفت یہ کی کہ جال ہی لے بھاگیں۔ مچھوا مُنھ دیکھتا رہ گیا۔ یہ مچھلیاں آفت روزگار تھیں —— فیضی اور ابوالفضل!

فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کے دربار میں پہنچتے ہی مخدوم الملک اور عبدالنبی کا ٹاٹ اُلٹ دیا۔ ماہ رجب ۹۸۷ھ ہجری میں ایک محضر نامہ تیار کیا۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ ظلّ اللہ ہے۔ اولی الامر ہے۔ امام عادل ہے۔ مجتہد العصر ہے۔ وہ کسی کا پابند نہیں۔ اُس کا حکم سب پر بالا۔ اس محضر نامہ پر عبدالنبی کو دستخط کرنا پڑا۔ اور مخدوم الملک کو بھی! اس کے بعد ظلّ اللہ نے فتحپوری مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھائی۔ خطبہ فیضی نے لکھا۔ اور اس طرح شروع کیا ؎

بنام آں کہ مارا سروری داد | دلے دانا و بازوئے قوی داد
بود وصفش ز حدِّ فہم برتر | تعالیٰ شانہٗ۔ اللہ اکبر!

اس کے چند سال بعد اکبر نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کا نام دینِ الٰہی رکھا۔ اس دینِ الٰہی پر ایمان لانے والا اقرار کرتا کہ ——

"منکہ فلاں ابن فلاں باشم بہ طوع و رغبت و شوقِ قلبی از دینِ اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابرا و تبرّا نمودم۔ و در دینِ الٰہی اکبر شاہی درآمدم۔ و مراتبِ چہارگانہ اخلاص کہ ترکِ مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم"

اس دینِ الٰہی کی اشاعت کے لئے اکبر نے کشمیر میں ایک بت خانہ بنوایا۔ غالباً ۹۹۸ھ ہجری میں اس بت خانہ کا کتبہ ابوالفضل نے لکھا اور کون لکھ سکتا تھا؟ ابوالفضل کا قلم جادو کا قلم۔ ابوالفضل کا کلیجہ باگھ کا کلیجہ!

کتابۂ بُت خانۂ کشمیر کہ ابوالفضل نوشتہ

الٰہی بہ ہر خانہ کہ می نگرم جویائے تواند۔ و بہ ہر زبان کہ می شنوم گویائے تو

کفر و اسلام در رہت پویاں
وحدہٗ لا شریک لہ گویاں

اگر مسجد است بیادِ تو نعرۂ قدوس می زنند۔ و اگر کلیسا است بشوق تو ناقوس می جنبانند

گہ معتکف دیرم و گہ ساکنِ مسجد
یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ!

اگر خاصان ترا بکفر و اسلام کارے نیست این ہر دو را در پردۂ اسرار تو بارے نہ

کفر کافر را و دین دیندار را
ذرۂ دردے دل عطار را

ایں خانہ کہ بہ نیت ایتلافِ قلوب موحدانِ ہندستان خصوصًا معبود پرستان عرصۂ کشمیر تعمیر یافتہ

بفرمانِ خدیو ہفت کشور
چراغ آفرینش شاہ اکبر
نظامِ اعتدالِ ہفت معدن
کمالِ امتزاج چار عنصر

ہر خانہ خرابے کہ نظرِ صدق نینداختہ ایں خانہ را خراب سازد باید کہ نخست معبد خود را براندازد۔ چہ اگر نظر بر دل است با ہمہ ساختنی است۔ و اگر چشم بر آب و گل است ہمہ برانداختنی

خداوندا چو دادی کار دادی
مدارِ کار بر نیت نہادی
تو ای بر بارگاہِ نیت آگاہ
بہ پیش شاہ داری نیت شاہ

اے ہرجائی! تو کہاں ہے؟ ہر دل میں تیرا ہی شور ہے۔ ہر زبان پر تیرا ہی فسانہ! وہ کفر ہو یا اسلام۔ تیری راہ میں دونوں سرگرداں! تو واحد ہے۔ اس ایک کا کوئی ساجھی نہیں۔ یہی کفر کہتا ہے۔ یہی اسلام!

یا قدوس کا نعرہ بیت اللہ میں تیرے لئے ہے تو بیت الصنم میں بھی تیرا ہی سنکھ بج رہا ہے! عاشق نے کبھی یہ گھر جھانک لیا کبھی وہ گھر جھانک لیا۔ شاید تو یہاں ہو۔ شاید تو وہاں ہو۔ پروانہ شمع کا دیوانہ۔ دیوانہ کو مکہ اور کاشی کا ہوش کہاں؟ پروانہ کو معانی کا پروانہ سب شمع کی لَو میں وہ جائے گا جہاں چاہے گا

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند!

اے جانِ عالم! جو تیرے ہو چکے اُن کو اوروں سے کیا غرض کفر ہو یا اسلام۔ دونوں غیر۔ دونوں اجنبی۔ دونوں نامحرم۔ کفر و اسلام کے پاس وہ پاؤں کہاں جو تیرے بھیدوں تک پہنچ سکے۔ اور وہ ہاتھ کہاں جو تیرے چھوڑے ہوئے پردوں کو اٹھا سکے! اس لئے کافر کو مبارک کفر دیندار کو مبارک دین۔ عطار کا دل تجھ سے درد مانگتا ہے۔ زیادہ نہیں صرف ایک چٹکی!

ہر طرف جنگ ہی جنگ ہے۔ چار عنصر میں جنگ۔ ہفت جو میں جنگ۔ کفر و اسلام میں جنگ۔

ان عاشقانِ جنگ کو ہم آہنگ و ہم سنگ و ہم رنگ وہی کر سکتا جو روزِ آفرینش سے آفتاب و ماہتاب ہو۔ وہ چراغ آفرینش جلال الدین محمد اکبر ہے۔ چاند سورج کی طرح اکبر بھی صاحب ہفت کشور ہے خلق اللہ کے ایک چراغ ہے۔ یہ تینوں چراغ این و آں ہیں اور کفر و اسلام میں فرق نہیں جانتے۔ اسلئے فرمانِ اکبری یوں ہوا کہ ایک گھر ایسا تعمیر ہو جہاں ہندوستان کے واحد پرست اور خصوصًا کشمیر کے معبود پرست ایک نقطہ سکیں۔ یہ عبادت خانہ اسی نیت سے بنایا گیا ہے۔

اب جو حق پوش، و بد اندیش و خانہ خراب اس گھر کو ڈھانا چاہے

اُس کو چاہیئے کہ پہلے خود اپنا گھر ڈھا دے۔ کیونکہ یہ سارا جھگڑا ہے دل اور
آب و گل کا۔ دل چیر کے دیکھا جائے تو ہر دل بیت اللہ ہے۔ ہر دل منزل جاناں
ہے۔ اور صرف آب و گل پر نظر ہو تو خانہ کعبہ تک آب و گل ہے!

اے وہ جو دل دیکھتا ہے آب و گل نہیں دیکھتا! تو ہی جانتا ہے کہ
بادشاہ کی نیّت کیا ہے! اے وہ جو روح دیکھتا ہے قالب نہیں دیکھتا!
ہر کام کا اجر تو نے نیّت ہی پر رکھا ہے!

ابوالفضل نے اکبر کو خدیو ہفت کشور یعنی بادشاہ ہفت اقلیم کہا تو مطلب یہ کہ ہندوستان بذات خود ہفت اقلیم ہے۔ جس طرح آنکھ کی سیاہی میں آدمی کی چھوٹی سی تصویر نظر آتی ہے جس کا نام عربی میں انسان العین، فارسی میں مردمک اور اردو میں پتلی ہوا اسی طرح چشم بینا ہفت اقلیم کی تصویر اُس سیاہی میں دیکھتی ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ ہندوستان گویا چشم عالم ہے جب ہفت اقلیم کی تصویر اس پتلی یعنی ہندوستان میں نظر آتی ہے تو ثابت ہوا کہ ہندوستان کا بادشاہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہے۔

ابوالفضل کی طرح قطرہ میں دریا اور جزو میں کل کا تماشہ دیکھنے والا غالب بھی ہے۔ غالب کلکتہ کو ایک شہر نہیں بلکہ ملک قرار دیتا ہے۔ اور چونکہ اہل یونان نے آباد دنیا کو سات ہی حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس لئے غالب شہر کلکتہ کو ہفت اقلیم سے الگ کر کے اقلیم ہشتم قرار دیتا ہے ؎

غالبؔ کلکتہ باز جستم گفت — باید اقلیم ہشتمش گفتن!

خدیو ہفت کشور کی بحث لطف سے خالی نہیں۔ جہانگیر شاہجہاں عالمگیر اور شاہ عالم اس بحث سے خارج نہیں۔
امیر تیمور کی اولاد نے امیرزادہ ہونے کی وجہ سے اپنا لقب میرزا قرار دیا۔ مثلاً میران شاہ مرزا۔ محمد مرزا۔ ابوسعید مرزا عمر شیخ مرزا۔ اور بابر مرزا۔

بابر مرزا نے ۹۱۳ھ ہجری میں قندھار فتح کیا تو اپنا لقب مرزا سے بادشاہ کیا۔ اسی سال کابل میں ہمایوں پیدا ہوا۔ اس کے بیس برس بعد ۹۳۲ھ ہجری میں بابر بادشاہ نے ہندوستان فتح کیا تو وہ بادشاہ غازی ہوا۔

پھر ۹۷۷ھ ہجری میں خانقاہ چشتیہ فتح پور سیکری میں وارثِ تخت و تاج اکبری پیدا ہوا تو شیخ الاسلام حضرت شیخ سلیم چشتی نے اُس کا نام اپنے نام پر سلطان سلیم رکھا۔ اس نام سے لوگوں کو بہت دھوکا ہوتا تھا کیونکہ اُسی زمانہ میں ایک دوسرا سلطان سلیم ملک روم کا بادشاہ تھا۔ سلیم بادشاہ روم ۹۸۲ھ ہجری میں مرحوم ہو گیا پھر بھی شاہزادہ سلیم نے ۱۰۱۴ھ ہجری میں تخت نشینی کے وقت اپنا نام نورالدین اور لقب جہانگیر کر دیا۔ اکبر خدیو ہفت کشور تھا تو اُس کا بیٹا جہانگیر کیوں نہ ہوتا؟

سلیم جہانگیر ہو گیا۔ لیکن جہان بے نور تھا۔ مہرالنساء سورۂ نور کی صورت آئی تب اندھیرے سے اُجالا ہوا عالم میں نور پھیلا۔ ذرّہ ذرّہ چمک اُٹھا۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ اس لئے مہرالنساء نور جہاں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میزان العقد

یا میزانِ ابجد دونوں ہیں نورجہاں (۳۱۵) آب دیدۂ جہانگیر (۳۱۵) تھی!

جہاں گیر کا نام نورالدین تھا۔ مجنوں نے "نورالدین" سے نور چھین کر اور "جہاں گیر" سے جہان چھین کر اپنی مہرالنساء کو سونپ دیا۔ اس لئے مہرالنساء نورجہاں ہوئی۔ خود مجنوں کا بیان ہے کہ من سلطنت را بہ نورجہاں بیگم ارزانی داشتم۔ چنانچہ شاہی فرمان پر نورجہاں کی مُہر اور سکّہ پر نورجہاں کا نام ہوتا تھا۔

بیت مہر ؎ نورجہاں گشت بحکم الٰہ ہمدم و ہمراز جہانگیر شاہ

بیت سکہ ؎ بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

(۲) شاہزادہ خرم اپنی مٹھی میں ملک دکن لیکر پہنچا تو اس فتح و نصرت پر جہانگیر باغ باغ ہوگیا۔ خوشی میں جھروکے سے نیچے اُتر آیا۔ بیٹے کو گلے سے لگایا۔ اپنے ہاتھوں سے لعل و زمرد نچھاور کیا۔ اور جلنے والوں کو اور جلانے کے لئے شاہ جہاں خطاب دیا۔ مرزا خرم اس طرح شاہ جہاں ہوا۔

تقریباً دس برس بعد ۱۰۳۷ ہجری میں شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو بادشاہ روم سلطان مراد نے مبارکباد کے خط میں ایک چٹکی لی:-

"خطاب شاہجہانی باوجود بادشاہ روم، ایران و توران معنی ندارد۔ بچہ وجہ خود را شاہ جہاں قرار دادہ اند؟"

یعنی آپ کچھ خدائی فوجدار نہیں۔ آپ بادشاہ ہیں تو صرف ہندوستان کے نہ کہ سارے جہان کے! پھر آپ کو شاہِ جہاں کس نے کہدیا؟

اس فقرہ پر شاہجہانی دربار شہر خموشاں ہوگیا۔ شاہجہاں نے وزیر سلطنت یمین الدولہ آصف خاں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خموش! تب ملک الشعراء ابو طالب کلیم کاشانی نے علی ابن ابی طالب کے صدقہ میں یوں مشکل کشائی کی ؎

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکی ست شہ را خطاب شاہجہانی مُبرہن ست!

یعنی جو عدد ہند کے وہی جہان کے۔ دونوں ۵۹۔ اس لئے ثابت ہوا کہ شاہِ ہند شاہِ جہاں ہے!

یہ سُننا تھا کہ مُردے جی اُٹھے۔ شہر خموشاں چلا اُٹھا کہ ہند نے روم کو شکست دی۔ لاریب! اس کلیم کو کون پا سکتا ہے؟ یہ کلیم وہ ہے جس کے ہاتھ میں پہنچکر ؎ قلم گوید کہ من شاہِ جہانم! اب شاہِ جہاں کا کیا پوچھنا! اُسی وقت اُس نے کلیم کو سونے کے برابر تولا۔ اور پھر بادشاہ روم کو جواب دیا ؎

ہند و جہاں ز روئے عدد چوں برابر ست بر ما خطاب شاہ جہاں زاں مقرر ست!

اسی واقعہ کو یاد کر کے غالب دیباچۂ مہرِ نیمروز میں حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہ سے خطاب کرتا ہے اور خون کے آنسو بہاتا ہے:-

"قاآن شیوہ خاقانا و خواقین خدایگانا!

اگر چنانکہ بدورانِ تو اُم بروزگار فرزانہ جمشید بودمے جمشید روزگار را آفریں گفتے! و اگر بدانساں کہ ثناخوانِ شہریارم، فرخ فریدوں را ستودمے، فریدوں چرخ و ستارہ را گرد سر گشتے! دراں انجمن کہ زردشت آتش افروخت و زند آورد، اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے،

غالب اگر جمشید کے زمانہ میں ہوتا تو جمشید اپنی قسمت پر ناز کرتا۔ اور غالب اگر فریدوں کی مدح کرتا تو فریدوں کا دماغ عرش پر ہوتا۔

کلام غالب کی آگ؟ اللہ ری آگ! زردشت کی اُمت یہ آگ دیکھ پاتی تو ژند کو آگ میں جھونک دیتی۔ اور

آزر را ازبیم من زبانہ نہ زدے! از دلفریبیٔ بیان من کس بشنیدن ژند نپرداختے!........

سرت گردم! تو نیز بدیں گرمیٔ ہنگامہ بناز کہ ہچو غالب بندۂ آتشیں نوائے داری، اگر بہ اندازۂ ہنر دادِ التفات می دہی، جائے مردمکِ دیدہ بیں بازگزارد و در دل بہ رُوئے من بکشائے!

گویند در عہد جہانبانی حضرتِ صاحبقران ثانی بفرمانِ آں خسروِ دریا دل کلیم را سہ درہ بسیم و زر و لعل و گہر سنجیدہ اند۔ من آں خواہم دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش کوشش نہ رنجند۔ و یک بار گفتار مرا بہ کلامِ کلیم بسنجند!"

اپنے پیغمبر سے روگرداں ہوکر غالب کی اُمت میں داخل ہو جاتی! باقی رہا آزر۔ تو کوہ آتش فشاں کے سامنے دیا سلائی کا نام؟

بہادر شاہ! تجکو چاہیئے تھا کہ غالب کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتا سے

آج مجھ سا نہیں زمانے میں	شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنئے	ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے	ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد	قہر ہے گر کرو نہ مجکو پیار

ایک کلیم کاشانی تھا جس کو صاحبقران ثانی نے سونے کے برابر تولا۔ اور ایک غالب ہے جس کا کوئی گاہک نہیں۔ کوئی ایسا بھی نہیں جو ترازو کے ایک پلہ میں غالب کا کلام اور دوسرے پلہ میں کلیم کا کلام رکھ کر دیکھتا کہ پلہ کس کا بھاری ہے!

(۳۳) شاہزادہ اورنگ زیب ۱۰۲۸ھ ہجری میں پیدا ہوا تو کلیم کاشانی نے برقِ طور کے ایسی چمکتی ہوئی تاریخ کہی یعنی آفتاب عالم تاب (۱۰۲۸)

چالیس برس بعد ۱۰۶۸ھ ہجری میں داراشکوہ اور اورنگ زیب میں جنگ ہوئی۔ شاہجہاں آگرہ میں تھا کہ اورنگ زیب میدان جیت کر آگرہ پہنچا۔ اور شہر کے باہر ہی باغ نور میں ٹھہر گیا۔ شہر کے باہر ٹھہرنے کی وجہ یہ تھی کہ شاہجہاں داراشکوہ کو اپنا ولیعہد کر چکا تھا اور اب تک اُسی کا طرفدار تھا۔ اس لئے داراشکوہ کی شکست درصل شاہجہاں کی شکست تھی۔

باغ نور سے اورنگ زیب نے ایک عرضداشت شاہجہاں کو بھیجی کہ خدا شاہد ہے جو کچھ ہوا مجبوری میں ہوا۔ اس عرضداشت کو پاکر شاہجہاں نے اورنگ زیب کو اپنے پاس بُلا بھیجا۔ اور جواب کے ساتھ ایک تلوار بھی انعام کی۔ اس تلوار کا آنا غضب ہو گیا۔ اورنگ زیب نے اس انعام میں انتقام کی جھلک دیکھی۔ سمجھا کہ ہم پر قابو پانے کے لئے یہ طلبی اور انعام واکرام ہے۔ اسی بدگمانی میں اورنگ زیب نے قلعہ پر اپنا پہرا بٹھلا دیا۔

شاہجہاں نے جو تلوار بھیجی تھی اُس کا نام عالمگیر تھا۔ وہ تلوار بھی عجب فتنۂ روزگار نکلی۔ بھیجنے والے کو اُس نے قید کرا دیا۔ اور پانے والے کو عالم گیر کر دیا!

عالمگیر تلوار اورنگ زیب کو عالمگیر نہ بناتی تو بھی "آفتاب عالم تاب" سے عالم لیکر اور اپنے دادا "جہاں گیر" سے گیر لیکر اورنگ زیب عالم گیر ہو ہی جاتا!

عالمگیر کی رسم تاجپوشی دو مرتبہ ہوئی۔ اوّل بعجلت ۱۰۶۸ھ ہجری میں اور پھر باطمینان ۱۰۶۹ھ ہجری میں پہلے جلوس کی ایک خداداد تاریخ، تاریخ ولادت میں صرف م بڑھا کر ہاتھ آگئی۔ یعنی آفتاب عالم تابم (۱۰۶۸) دوسرے جلوس کی تاریخ ہوئی بادشاہ ملک ہفت اقلیم (۱۰۶۹)۔ یہ دونوں تاریخیں اصل میں ایک ہیں۔ آفتاب کی عالمگیری مسلم ہے تو آفتاب عالم تاب واقعی بادشاہ ملک ہفت اقلیم ہوا۔

اس کے آٹھ برس بعد سنہ ۱۰۷۶ ہجری میں شب دوشنبہ ۲۶ رجب کو شاہجہاں نے رحلت کی۔ تاریخ رحلت رضی اللہ (۱۰۷۶)
اس کے چند ماہ بعد ۱۱ ذیقعدہ کو پنجاہ سالہ جشن عالمگیری تھا۔ سالگرہ کے دن دشمن نے دشمن کا منھ دیکھا۔ یعنی عالمگیر کے دربار میں شیواجی[۵۹] مرہٹہ سلام کے لئے حاضر ہوا۔ سلام کے بعد ہی شیواجی نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ آٹھ دن کے بعد عالمگیر نے مجبوراً نظر بندی کا حکم دیدیا۔ اور شیواجی کے سر پر کوتوالِ شہر فولاد خاں کو مسلط کر دیا۔ لیکن اس نظر بندی کے ۹۹ دن بعد سلطنتِ مغلیہ ننانوے کے پھیر میں پڑگئی۔ وہ اس طرح کہ ۲۷ صفر سنہ ۱۰۷۷ ہجری کو شیواجی فولاد خاں کی آنکھوں میں دھول ڈالکر قید خانہ سے بھاگ نکلا۔ اور پھر جوگیوں کا بھیس بدل کر آگرہ سے متھرا اور متھرا سے الہ آباد بنارس ہوتا ہوا گیا پہنچا۔ گیا میں وشنو پد مندر کا درشن کر کے شیواجی پوری جگناتھ ہوتا ہوا دکن پہنچا۔ اور وہاں پہنچکر فتنۂ عظیم برپا کیا۔

شیواجی آگرہ سے بھاگا تو حافظ ہدایت اللہ نے تاریخ لکھی اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَر (۱۰۷۷) اس کی خبر آگ کی طرح ہندوستان سے ایران پہنچی تو شاہِ ایران سلیمان صفوی نے عالمگیر کو یہ خط بھیجا:۔

سلہ[۵۹] طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں حضرت سام۔ حضرت حام۔ اور حضرت یافث سے ساری دنیا آباد ہوئی۔ ان تینوں کی اولاد جہاں جہاں پہنچی اور پھیلی دنیا کا وہ حصہ اُنہی کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۔ حضرت حام بن نوحؑ کے چھ لڑکے — ہند، سند، حبش، زنج، بربر، نوبہ
ان میں سے ہند نے ملک ہند۔ سند نے ملک سندھ۔ اور باقی چار نے افریقہ میں ملک حبش۔ زنجبار۔ بربر اور نوبہ اپنے اپنے نام پر آباد کیا۔

۲۔ ہند بن حام بن نوحؑ کے چار لڑکے۔ ان میں سے دوسرے لڑکے بنگ نے ملک بنگالہ اور تیسرے لڑکے دکھن نے ملک دکن آباد کیا۔

۳۔ دکھن بن ہند کے تین لڑکے۔ مرہٹ۔ کنہر۔ اور تلنگ۔ مرہٹ نے ملک مرہٹہ۔ کنہر نے ملک کناری اور تلنگ نے ملک تلنگانہ آباد کیا۔
اس طرح مرہٹہ قوم مرہٹ کی یادگار ٹھہری۔ مرہٹ بن دکھن بن ہند بن حام بن حضرت نوح علیہ السلام۔

یہ اہلِ تاریخ کا بیان ہے جس کو غلام حسین سلیم زیدپوری نے اپنی تالیف ریاض السلاطین میں نقل کیا ہے مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سنہ ۱۸۹۰ء (ص ۱۸-۲۰)۔

توراۃ باب تکوین فصل دہم میں حضرت حام بن نوحؑ کے فرزند اکبر کا نام کُش ہے۔ یہ نام ریاض السلاطین میں ہند اور توراۃ میں کش ہے تو اس اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ ریاض السلاطین کا بیان لغو ومہمل ہے۔ بلکہ یہ غور و فکر کا مقام ہے حضرت نوحؑ کا پوتا ہند ملکِ ہند میں جس گلی سے آیا اُس گلی میں اُس کا نقشِ قدم آج تک موجود ہے۔ یعنی کوہِ ہندوکش
ہند + (و) + کش ہے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی!!

"........ دریں ایام از تقریر صادر و وارد بظہور پیوستہ کہ در ممالک ہندوستان اکثر جا مفسدانِ سرکش آں سلیمان وش را ناتواں و بے سرانجام پنداشتہ غبار آشوب بلند ساختہ اند .... سرگروہ آنہا سیوا نام کافرے ست کہ ہیچ کس شناسائے نام و نشانش ونمودہ الحال بے سرانجامی سامی باعث سرانجام آں گمنام شدہ۔ خروج نمودہ۔ اکثر قلعہ جات کوہ شکوہ بتصرف خود آوردہ۔ سپاہ آں سلطنت پناہ را بزیر تیغ بے دریغ کشیدہ۔ بسیارے راسپر نمودہ ملک را تاراج کردہ۔ دعوئ ہمسری آں والا دودماں دارد۔ و آں خلافت مآب پدرگیری را عالمگیری نام نہادہ۔ از کشتن برادران کہ وارثِ ملک بودند خاطر جمع کردہ سررشتہ قدردانی وجہانبانی و داد و دہش را از دست دادہ۔ بصحبت جماعتے کہ افسوں خوانی و وسوسہ شیطانی را شیوہ حق دانی می پندارند، مشغول اند ...."

اسی بہانہ شاہ ایران نے باز پرس کی کہ ایک پدر گیر و برادر کش کیونکر عالمگیر ہوسکتا ہے جب گمنام و بے نشان شیوا جی مرہٹہ تک اس کے قابو میں نہیں آتا!

عالمگیر نے اس کا جواب اسد خاں کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اور حمد باری تعالیٰ کے سلسلہ میں اپنی عالمگیری اس طرح جتائی تھی۔

"سبحان اللہ صاحب قدرتے کہ جمیع ذرات ہستی و موجوداتِ بلند و پستی پرتو آفتاب عالم تاب اوست ....."

چونکہ آفتاب عالم تاب، خود اورنگ زیب کی تاریخ ولادت تھی۔ اور آفتاب کی ہمہ گیری سے ایران بھی انکار نہیں کرسکتا تھا اس لئے حمد ہی میں عالمگیر نے اپنا کام نکال لیا تھا۔

۱۱۱۸ھ ہجری میں آفتاب عالم تاب روپوش ہوا یعنی عالمگیر نے رحلت کی تو تاریخ رحلت ہوئی۔ آفتاب عالم تاب من (۱۱۱۸) (۴) عالمگیر شاہزادہ محمد معظم کو بہادر شاہ کہتا تھا۔ بہادر شاہ ۱۱۱۹ھ ہجری میں تخت نشین ہوا تو تاریخ جلوس عالمگیری میں قم ای بڑھا کر اس نے خود اپنے جلوس کی تاریخ کہی۔ ما آفتاب عالم تابیم (۱۱۱۹) اور پھر خطاب "بہادر شاہ" سے شاہ بیکر اور اپنے باپ "عالمگیر" سے عالم لیکر وہ شاہ عالم ہوگیا۔

اسی شاہ عالم کا لڑکا عظیم الشان تھا جس نے رحلت عالمگیر کے تین ۳ سال پہلے ۱۱۱۵ھ ہجری میں پٹنہ کو عظیم آباد کیا عظیم آباد کی کیا بات ہے! یہ بات دلی اور آگرہ تک کو نصیب نہیں ———

عظیم آباد (۱۰۲۸) آفتاب عالم تاب (۱۰۲۸) ہے جس طرح اورنگ زیب کی تاریخ ولادت عظیم آباد ہے! ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ایں سعادت بزورِ ابجد ہست!

جلوس عالمگیری سے چند سال پہلے یعنی ۱۰۶۰ھ ہجری کے لگ بھگ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پٹنہ میں تجارت شروع کی اور لب دریائے گنگ گلزار باغ محلہ میں اپنی فیکٹری قائم کی۔ پٹنہ ۱۱۱۵ھ ہجری میں عظیم آباد ہوا۔ اس کے ستانوے سال بعد عظیم آباد میں گلزار باغ فیکٹری کے بالاخانہ پر شاہزادہ عالی گوہر نے تاج شاہی پہنا۔ لقب شاہ عالم (ثانی) ہوا۔ ۴ رجمادی الاول ۱۱۷۳ھ ہجری۔ تاریخ جلوس فضل ربانی (۱۱۷۳) اس کے پانچ برس بعد ۴ر محرم ۱۱۷۹ھ ہجری کو

بہار بنگال اڑیسہ کی دیوانی سوتے پہرے بھک کر کمپنی کے پاس چلی گئی۔ دلّی کا دیوالہ نکل گیا۔ آفتاب سلطنت لب بام تھا تو کوئی کس منہ سے اپنے کو آفتاب عالم تاب کہتا۔ اس لئے عالی گوہر (شاہ عالم ثانی) نے تبرکاً اپنا تخلص آفتاب کرلیا تھا۔ ۷ ذیقعدہ ۱۲۰۲ھ ہجری کو نمک حرام غلام قادر نے بادشاہ کی دونوں آنکھیں نوک خنجر سے بے نور کردیں۔ آفتاب نے اپنے زوال کا مرثیہ خود کہا۔ جس میں تین شعر یہ ہیں ؎

آفتابِ فلک رفعتِ شاہی بودیم ۔۔۔ بُرد در شام زوال آہ سیہ کاریٔ ما

چشمِ ما کندہ شد از دست فلک بہتر شد ۔۔۔ تا نہ بینیم دگر غیر جہانداریٔ ما

بود جاں کاہ زر و مال جہاں ہیچ و پوچ ۔۔۔ دفع از فضل الٰہی شدہ بیماریٔ ما

بابِ دُوم ۔۔۔ عہدِ عالمگیری

عالمگیر تخت پر بیٹھا تو شریعت نے طریقت اور ان دونوں سے جنگ شروع کردی۔ شنبہ ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ ہجری کو داراشکوہ گرفتار ہو کر دلّی آیا۔ اور قلعہ میں قید کیا گیا۔ علمائے شریعت نے وہی فتویٰ دیا جو عالمگیر چاہتا تھا۔ یعنی داراشکوہ کافر ہے اور واجب القتل ہے! اتنے میں محرم کا چاند ہوا ۱۰۷۰ھ ہجری عین چاند رات کو داراشکوہ کی کوٹھری میں جلاد پہنچا۔ جلاد نے اپنا کام کیا۔ داراشکوہ نے اپنا کام کیا۔

داراشکوہ عشق کا مارا تھا۔ اس کی آنکھوں میں معشوق۔ اس کے دل میں معشوق۔ معشوق اپنے گھر میں کسی اور کو آنے نہیں دیتا چنانچہ داراشکوہ نے جلاد کو نہیں دیکھا جلاد کی تلوار کو نہیں دیکھا۔ جلاد ننگی تلوار لئے سامنے کھڑا تھا۔ اور داراشکوہ؟ ۔۔۔ مجنوں لیلیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا ؎

روزے کہ شود اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۔۔۔ واں دم کہ بود اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ

من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات ۔۔۔ گویم صنما! بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ؟

وہ دن بھی آئے گا جب آسمان پھٹ جائیں گے۔ وہ وقت بھی آئے گا جب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ اُس دن اور اُس وقت بھری محفل میں ہم تیرا دامن پکڑیں گے اور پوچھیں گے کہ اے لیلیٰ! تیرے مجنوں کی گردن آخر کس گناہ پر ماری گئی

داراشکوہ کے بعد سرمد کی باری آئی۔ داراشکوہ سرمد کا معتقد تھا۔ اس لئے عالمگیر سرمد سے بدظن تھا۔ سرمد ستر پوشی نہیں کرتا تھا۔ عالمگیر نے علماء سے پوچھا علماء نے وہی کہا جو عالمگیر چاہتا تھا۔ یعنی سرمد بھی کشتنی ہے! چنانچہ قتل گاہ نے سرمد کی زیارت کی۔ جلاد سامنے آیا۔ حسب دستور آنکھوں پر پٹی باندھنے لگا سرمد نے کہا اس کی ضرورت نہیں۔ اور مسکرا دیا۔ مسکرا کر جلاد سے کہا ۔۔۔

"تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا می شناسم!"

پھر سرمد نے یہ شعر پڑھا اور تلوار کے سایہ میں گردن جھکا دی ؎

عریانیٔ تن بود غبارِ رہِ دوست آں نیزہ بہ تیغ از سرِ ما واکردند!

اس خونِ ناحق کی تاریخ "بود مقبول سرمدِ مقتول" (۱۰۷۰)۔ الغرض اسی طرح شریعت اور طریقت میں جنگ ہوتی رہی۔ طریقت کے بعد کفر کی باری آئی۔ بُت کدوں کو حکم ہوا کہ مسجدوں کے لئے جگہ خالی کرو۔ اکبر نے بُت خانہ بنایا۔ عالمگیر نے بُت خانہ ڈھایا۔ یہ ہوتی آئی ہے۔ آزر نے بُت بنایا۔ فرزندِ آزر نے بُت توڑا۔ اکبر نے بُت خانہ بنایا تو ابوالفضل نے کتابہ لکھا۔ ابوالفضل اکبرآبادی تھا۔ عالمگیر نے بُت خانہ توڑ کر مسجد بنائی تو عبدالعزیز نے کتابہ لکھا۔ عبدالعزیز بھی اکبرآبادی تھا۔ شیخ عبدالعزیز خلف شیخ عبدالرشید ——— تاریخ رحلت نور از چراغ عالم بُردند۔ چراغ عالم ۱۳۴۵۔ نور ۲۵۶۔ چراغ عالم بے نور یعنی ۱۰۸۹ھ ہجری ——— اکبرآبادی نے اکبرآبادی کا جواب لکھا۔ عبدالعزیز اکبرآبادی کی تحریر ابوالفضل اکبرآبادی کی تحریر کا جواب تھی:—

کتابہ مسجدے کہ بعد از انہدام بتکدہ بنا شد

معبود واجب الوجود کہ حقیقتش از ہمہ ماہیات بالاست۔ و ہُویّتِ او تمثال آیہ سُبحانَ رَبّیَ الاعلیٰ۔ اشارہ ابروئے عقلِ اسلام کیشاں در سجدہ بایں ماہیت است۔ و کفر منشاں را گاہ پرستش در حضور و غیبِ صنم سنگ بر شیشہ نیست ؎

زبُت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابروئے!
بحیرتم کہ دلِ برہمن زکفِ چوں شد؟

بنائے بیت المعمور مسجد نام تعمیر کعبۂ دل است و نہادِ دارالصنم نافرجام ننگِ آب و گل۔ پرستش گاہِ صفاکیشاں چو مروہ در پاکبازی است و خاکِ معبدِ بُت شناں از آب تیشۂ نمازی۔ چنیں زراست ناشناسے کہ ایں دو خانہ را ہم سنگ دیدہ دنیا آباد دیں خرابے ست کہ براز ایں دقیقہ نرسیدہ۔ اہل توحید را جز رموز ایماں اسرارے نیست۔ والحادرا در عالم عرفاں روز بازارے نہ۔

وہ کسی سے پوچھ کر نہیں آیا۔ وہ پوچھتا کس سے؟ وہ پوچھتا کیوں؟ کوئی اُس کو لایا نہیں۔ اُس کو "لاتا" کون؟ کوئی تھا کہاں؟ وہ خود آیا ہے وہ خود آ رہا ہے۔ اس لئے خدا ہے! وہ خود آیا اور اس شان سے آیا کہ ؎

مر اورا رسد کبریا و منی
کہ مُلکش قدیم است و ذاتش غنی
سعدی

جو خودی کا تاج پہنے آیا اور آنے میں کسی کا محتاج نہ ہوا وہ صاحبِ جبروت و جلال اپنی ہستی اور بقا میں کب کسی کا محتاج ہو سکتا ہے۔ ھُوَ الاَوَّلُ مگر اول کی ابتدا نہیں معلوم۔ ھُوَ الآخِرُ مگر آخر کی انتہا نہیں معلوم اسی ابتدا اور انتہا نے سب کچھ گھیر لیا۔ مگر دائرہ کا اور چھور نہیں معلوم اتنا معلوم ہے کہ ھُوَ البَاقِی باقی کچھ نہیں معلوم!

جو باقی وہی معبود۔ جو معبود وہی واجب الوجود۔ واجب الوجود وہ جس کے آگے کسی کا وجود نہیں۔ جس کا وجود کسی اعتبار سے محدود نہیں جس کی حقیقت ہر حقیقت سے بالا۔ جس کا آئینہ وحدت سُبحانَ رَبّیَ الاعلیٰ سجدہ میں نمازی اسی حقیقت کا اقرار کرتا ہے۔ بت کدہ بیں کا فر اس حقیقت سے انکار کرتا ہے۔

کفر کا ظہور ثنویت کا فتور۔ واجب الوجود کو چھوڑ نا لاموجود کو پکڑنا حق پوشی ہے۔ باطل کوشی ہے۔ کفر ہے۔ کفران نعمت ہے۔ کافر کا خدا بھی عجب

صلح کفر و اسلام از روئے نارسائی ست۔
وجو بائے مسجد و دیر ہرزہ گردہر جائی ؎

بسعیٔ تیشہ صنم خانہ باصفا گردد
شود چو پاک ز بُت جائے اصفیا گردد
مشو گرامتِ بُت خانہ مرا منکر
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

خدا ہے۔ بُت بنا بیٹھا ہے۔ ہل نہیں سکتا۔ کچھ کر نہیں سکتا۔ پھر بھی محمود ہے معبود
مسجود ہے۔ خدا کی شان کہ پتھر خدائی کر رہا ہے۔ پتھر کی خدائی پر ایمان لانے
ابو جہل! ابو جہل کون؟ جس کی عقل پر پتھر پڑے ہیں۔ جس کے سینہ میں دل نہ
پتھر ہے۔ جس کا دل ننگِ آب و گِل۔ جس کی روح قالوا بلیٰ کو بھول کر آج
حرم محترم میں ماتم کر رہی ہے ؎

سینۂ ما از محمد داغ داغ !	از دم او کعبہ را گل شد چراغ !
پاش پاش از ضربتش لات و منات	انتقام از وے بگیر اے کائنات
اے منات اے لات از یں منزل مرو	گر ز منزل می روی از دل مرو !

آدم کا دل؟ اللہ اکبر! کعبہ میں سنگ اسود ہے تو دل پر بھی ایک سیاہ
نقطہ ہے۔ دل کا یہی سویدا کعبہ کا سنگ اسود ہے۔ آدم کا دل کعبہ ہے بیت المعمور
ہے ملائکہ کی زیارت گاہ ہے۔ پاکی میں صفا مروہ ہے۔ تجلّی میں طور سینا ہے
جانِ عالم کی جلوہ گاہ ہے! — اس بیت المقدس میں اہرمن کیوں آیا؟ کعبہ میں
بُت کیوں آیا؟ دل میں کفر کیوں آیا؟ کفر آیا تو چور آیا۔ چور کا کالا منہ!

اسلام اور کفر میں صلح کیسی؟ طہارت اور نجاست میں صلح کیسی؟ سعادت
اور شامت میں صلح کیسی؟ نہیں ہو سکتی۔ صلح نہیں ہو سکتی۔ قیامت تک نہیں ہو سکتی
بیت اللہ بیت الصنم نہیں۔ دُولوا ایک سمجھنے والا حساب نہیں جانتا۔ جاہل ہے۔ دیوانہ
ہے۔ دیوانگی کی حد یہ کہ دائیں اور بائیں تک کی پہچان نہیں۔ دین بیچتا۔
دنیا خرید تا ہے۔ آج مسجد میں۔ کل بُت خانہ میں۔ مارا مارا پھرتا ہے۔ ڈانوا ڈول
ہے۔ بارہ باٹ ہے!

اللہ والوں کی شان؟ اللہ ری شان! ان کے آگے لات و منات
خدائی کرنا بھول جاتے ہیں۔ اللہ اکبر کی ضرب لات و منات کو پاش پاش
کر دیتی ہے ؎ "شکستِ بُت سے آتی ہے صدا اللہ اکبر کی!"
جَآءَ الْحَقُّ حق آگیا۔ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور باطل نیست و نابود ہوا
اِنَّ الْبَاطِلَ کوئی شک نہیں کہ باطل۔ كَانَ زَهُوْقًا ناپید ہونے ہی کے لئے تھا

عالمگیری مسجد کا کتابہ جو شیخ عبد العزیز اکبر آبادی نے لکھا وہ غور طلب ہے۔ بلاغت کا یہ عالم ہے کہ دریا کوزہ میں بند ہے
بات یہ ہے کہ عالمگیر اور عبد العزیز دونوں کے سامنے وہ کتابہ تھا جو عہد اکبری میں ابو الفضل بت خانۂ کشمیر کے لئے لکھ چکا
ابو الفضل کا دعویٰ تھا کہ طریقت کی ترازو میں کفر اور اسلام دونوں کا پلّہ برابر ہے۔ عبد العزیز نے دعویٰ کیا کہ شریعت کی ترازو میں

طریقت اور کفر دونوں کا پلّہ برابر ہے۔ عبدالعزیز نے جو کچھ لکھا اُس کی تشریح کے لئے دفتر چاہیئے اُس دفتر کے چند اوراق یہاں۔

(۱) سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔

عربی میں رَبّ بمعنی پروردگار۔ یہی لفظ سنسکرت میں رَبی ہو گیا۔ رَبی بمعنی آفتاب۔ مثلاً۔۔۔

(الف) ربندر ناتھ ٹیگور ——— ربی آفتاب۔ اِندر جس کی سبھا مشہور۔ ناتھ مالک۔ اور ٹیگور ٹھاکر۔

(ب) ربی بار ——— ربی آفتاب۔ بار دن۔ جو ربی بار وہی اتوار۔ سنسکرت اور ژند قدیم پارسی یعنی زبانِ دری میں ابت بمعنی آفتاب۔ اس لئے اتوار دراصل ابت + وار ہے۔

(ج) ربی نندنی ——— ربی آفتاب۔ نندنی لڑکی۔ اس سے مراد جمنا ندی۔

(د) ربی پتر ——— ربی آفتاب۔ پتر لڑکا۔

مہابھارت کا قول ہے کہ کنتی نام ایک کنواری تھی جس کو ایک دن ربی یعنی آفتاب کا جلوۂ خاص نصیب ہوا۔ اس جلوہ خاص کے اثر سے ربی اور کنتی کی جو اولاد ہوئی اُس کا نام کرن ہوا۔ سنسکرت کرن بمعنی کان۔ مثلاً کرن پھول۔ اردو زبان کو ربی کنتی اور کرن کی کہانی خوب یاد ہے۔ جس کو شک ہو وہ آفتاب کی کرن سے پوچھ لے سورج کی کرن سورج بنسی جس طرح انگور کی شراب دختِ رز۔

ماحصل یہ کہ عربی کا رَبّ سنسکرت میں ربی ہو کر پروردگار سے پروردہ، غیر متناہی سے متناہی، اور رَبُّ الْعَالَمِیْن سے ایک معمولی آفتاب ہو کر رہ گیا۔ آفتاب بے داغ نہیں۔ آفتاب کو زوال ہے۔ آفتاب کو گہن بھی لگتا ہے۔ اور رَبُّ الْعَالَمِیْن؟ لازوال۔ بے عیب لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ۔ پاک۔ برتر۔ اعلیٰ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ۵

آنکھیں جھپکانے کا ہو برقِ تجلّی کو مرض! کس طرح کوئی دکھا دے رُخِ روشن اُن کا؟ — منیر شکوہ آبادی

(۲) پرستگاہ صفاکیشاں چوں مژدہ در پاکبازی است :

ایک زمانہ میں مصر اور بابل دونوں کو خدائی کا دعوی تھا۔ مصر میں فرعون۔ بابل میں نمرود۔ فرق یہ تھا کہ فرعونیت نمرودیت سے ۱۰۶ قدم آگے تھی۔ نمرود (۳۰۰) فرعون (۴۰۶)۔ فرعونیت کا یہ حال کہ ملک کے کسی گوشہ میں حسن کو پناہ نہیں ملتی تھی۔ ہر صاحبِ جمال قانوناً فرعون کی ملک خاص تھی۔ کنواری ہوتی تو ماں باپ سے چھین لی جاتی۔ بیاہی ہوتی تو شوہر مار ڈالا جاتا۔ فرعونیت کی یہ چکی سب سے زیادہ قبطیوں کو پیس رہی تھی۔ قبط حضرت نوحؑ کا پوتا۔ قبط کی نسل جو مصر میں پھیلی ہوئی تھی وہ قبطی۔

انہیں فاقہ کش قبطیوں کے گھر ایک لڑکی تھی۔ صورت میں کوہ نور۔ سیرت میں کوہِ طور۔ عفّت میں دامنِ مریمؑ طہارت میں آبِ زمزم۔ رفعت میں ہفت اختر۔ منزلت میں سورہ کوثر! ——— فرعونیت کا ہاتھ آخر اس لڑکی تک پہنچا۔ اور یہ فرعون کے سامنے پیش کی گئی۔ خلوت میں اس لڑکی نے فرعون کو وہی جواب دیا جو صدیوں بعد اُسی مصر میں یوسفؑ نے زلیخا کو دیا۔ اس جواب سے فرعون کی آتشِ غضب بھڑک اُٹھی۔

یہاں مصر میں یہ آگ بھڑک رہی تھی اور وہاں بابل میں دوسری آگ بھڑک رہی تھی۔ بابل میں نمرود انگاروں پہ

لوٹ رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی خدائی میں بٹا لگ چکا تھا۔ ہر طرف شور تھا کہ ابراہیمؑ کا خدا واقعی خدا ہے جس نے ابراہیمؑ کو آگ سے بچا لیا۔ نمرود خدا تھا تو آگ نے نافرمانیاں کیوں کی؟ یہ سُن سُن کر نمرود بہوت تھا۔ سوچتا تھا کہ ابراہیمؑ کا قتل کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر چھری نے بھی آتش کی شاگردی کرلی تو پھر کیا ہوگا؟ چھری نے بھی چلنے سے انکار کر دیا تو ہم کہاں رہینگے؟۔ کاش کوئی صورت ایسی نکلتی کہ ابراہیمؑ اس مُلک سے خود ہی چلا جاتا۔ بارے وہ صورت یوں نکلی کہ ملک میں قحط پڑا۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت فرمائی اور پھر اپنی بی بی کے ساتھ مصر کی راہ لی۔ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی اُن کی چچیری بہن تھیں۔ ہاران کی بیٹی۔ آزر کی بھتیجی۔ روایت ہے کہ حُسن وجمالِ آدمؑ کا آدھا حصہ یوسفؑ کو ملا۔ اور چھٹا حصہ ہاران کی بیٹی کو ملا چنانچہ ہاران کی بیٹی یعنی حضرت ابراہیمؑ کی بی بی اسی دولتِ حُسن کے ساتھ مصر میں داخل ہوئیں۔

مصر آکر حضرت ابراہیمؑ کو فرعونیت کا حال معلوم ہوا۔ حضرت نے اپنی بی بی سے فرمایا کہ تم ہماری بہن بھی ہوتی ہو۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ ہماری جان یوں ہی بچ سکتی ہے۔ چنانچہ پوچھنے والے آئے تو یہی جواب دیا گیا۔ پوچھنے والوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بھائی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور اُن کی بی بی کو فرعون کی خلوت میں پہنچا دیا۔

خلوت میں آپ نے فرمایا کہ اے فرعون! پہلے ہم کو نماز پڑھ لینے دے۔ فرعون نہیں جانتا تھا کہ نماز کیا چیز ہے۔ فوراً اجازت دیدی۔ اور آپ نے نماز شروع کی۔ دیر کے بعد فرعون نے دیکھا کہ نماز کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ بے ادب نے ہاتھ بڑھایا۔ فوراً دونوں ہاتھ سوکھ گئے۔ سانس رُکنے لگی۔ منھ سے کف جاری ہوگیا۔ تب نمازی نے فریاد کی کہ اے اللہ! یہ ظالم مرگیا تو اس کے لوگ ہم کو جیتا نہیں چھوڑیں گے! نمازی کی دعا قبول ہوئی۔ فرعون اُسی وقت اچھا ہوگیا۔

اچھا ہوتے ہی فرعون نے پھر بے ادبی کی۔ ہاتھ پھر سوکھ گئے۔ سانس پھر رُکنے لگی۔ کف پھر جاری ہوگیا۔ نمازی نے پھر دعا کی۔ دعا پھر قبول ہوئی۔ فرعون پھر اچھا ہوگیا —— اچھا ہوتے ہی ظالم نے پھر بے ادبی کی۔ موت پھر دامنگیر ہوئی۔ نمازی نے پھر دعا کی۔ ظالم پھر اچھا ہوگیا۔

اب ظالم نے اپنے آدمیوں کو بلایا۔ حکم دیا کہ —— لے جاؤ اس عورت کو! یہ جادو جانتی ہے۔ ہماری جان کی گاہک ہے۔ شہر بدر کردو اس ساحرہ کو! اور ہاں خوب یاد آیا۔ اس سرکش کو بھی حاضر کرو جو آج تک رام نہیں ہوئی۔ وہی قبطی کی لڑکی! اسی ساحرہ کو دیدو کہ اپنے ساتھ اُس کو بھی لیتی جائے!

جلّ جلالہ! آسمان پر ایک چاند ہے لیکن فرعون کے محل سے اُس وقت دو۲ چاند نکلے! —— یہ دونوں چاند گہن سے نکل کر آفتاب کے پاس پہنچے۔ آفتابِ رسالت اُس وقت سجادہ پر جلوہ فرما تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نماز ختم کی تو ان دونوں کو دیکھا۔ اپنی بی بی سے پوچھا یہ لڑکی کون ہے؟ بی بی نے کہا کہ چلتے وقت فرعون نے یہ لڑکی ہمارے ساتھ کردی ہے۔ ہم نے اس لڑکی کو آپ کے لئے مباح کیا۔ گھر بے چراغ ہے۔ ہماری گود خالی ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہی لڑکی گھر میں چراغ جلائے گی!

وہ لڑکی بی بی ہاجرہؑ۔ اور چراغ کی تمنا کرنے والی بی بی سارہؑ۔ جو بی بی سارہ نے چاہا وہی اللہ نے چاہا۔ اللہ نے بی بی ہاجرہؑ کی گود بھردی۔ بے چراغ گھر کے لئے گوہرِ شب چراغ بھیج دیا۔ چراغ کا نام اسمٰعیلؑ!

کیسا قحط اور کہاں کا نمرود؟ بات یہ ہے کہ اللہ کی ایک فرماں بردار کنیز فرعون کے جال میں گرفتار تھی۔ اس کو جال سے چھڑا لینا کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اس کا استقبال کرنا ایک بڑی بات تھی۔ روئے زمین پر کس کا منہ تھا جو اُن کی پیشوائی کر سکتا؟ کون اس قابل تھا جو اس کے استقبال کے لئے بھیجا جاتا؟ اگر کوئی تھا تو وہ خلیل اللہ تھا۔ اس لئے اللہ نے اپنے دوست کو اپنی چہیتی کی پیشوائی کے لئے شہر بابل سے شہر مصر بھیجا۔ اللہ اللہ کیا پایہ تھا بی بی ہاجرہؑ کا!

اللہ نے بی بی ہاجرہؑ کو مصر سے بیت المقدس اور وہاں سے مکہ پہنچایا۔ اُس وقت مکہ غیر آباد تھا۔ ہتھیلی کی طرح صاف۔ بالکل چٹیل میدان۔ نہ سایہ نہ پانی۔ ایک دن گرمی کا یہ حال تھا کہ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ بی بی ہاجرہؑ کی گود میں شیر خوار بچہ تھا۔ بچہ پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ پاس ہی دو پہاڑیاں تھیں۔ صفا اور مروہ۔ بچہ کی حالت غیر ہوئی تو بی بی ہاجرہؑ اُس کو چھوڑ کر پانی کی تلاش میں صفا پر گئیں۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کہیں پانی نہ ملا۔ صفا سے بچہ کے پاس آئیں اور پھر پانی کی تلاش میں مروہ پر گئیں۔ وہاں بھی پانی نہ ملا تو بچہ کو دیکھتی ہوئی پھر صفا پر گئیں۔ اسی طرح سات مرتبہ آئیں اور گئیں۔ اب جو آتی ہیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بچہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور زمین سے پانی اُبل رہا ہے!

بھلا ایسی بھی بات تھی کہ ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کا لال ایڑیاں رگڑتا اور اللہ دیکھتا رہتا؟ زمین کو حکم ہوا کہ شق ہو جا۔ پانی کو حکم ہوا کہ باہر آ جا۔ زمین کی چھاتی پھٹ گئی۔ آب زمزم پھوٹ نکلا۔ زمزم نے اسمٰعیلؑ اور ہاجرہؑ کی پیاس بجھائی۔ زمین کیوں نہ پھٹ جاتی؟ زمزم[۵۱] کیوں نہ پھوٹ نکلتا؟ ابھی چھری کو صبر اسمٰعیلؑ اور عشق ابراہیمؑ کا امتحان لینا باقی تھا۔ ؎

ملکیان نازبین کہ جگر گوشۂ خلیلؑ ۔۔۔ در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند! ۔۔۔ عرفی شیرازی

---

۵۱ ہندوستانی اس پانی پر مرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۶ھ ہجری میں ایک ہندوستانی نے چاہِ زمزم میں کود کر جان دیدی۔ اُس کی لاش نکالنے کے لئے جدہ سے آدمی بُلائے گئے۔ تاریخ الحرمین الشریفین مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی۔ ص ۱۴۲۔

ہم نے واقعہ پڑھا تو خیال ہوا کہ اُس غریق چاہ زمزم کو آب رحمت کی کتنی تلاش ہوگی جو دنیا بھر سے منہ موڑ کر اُس نے زمزم سے چاہ کی۔ اور اس طرح اپنی پیاس بجھائی۔ یہ خیال آتے ہی بے اختیار منہ سے نکلا "جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی" اب اُس مرحوم کی قسمت اور چاہ زمزم کی کرامت دیکھئے کہ تاریخ رحلت بے دھڑک سامنے آگئی ؎

تاریخ لاجواب ہے! تاریخ لاجواب!

"جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی" ۱۳۵۰

(لا) جواب ۔ (لا) جواب ۲۴

۱۳۲۶ ہجری

بی بی ہاجرہؑ جو پانی کی تلاش میں سات مرتبہ آئیں گئیں تو حاجیوں کو بھی صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرنے کا حکم ہوا۔ صفا اور مروہ کی عظمت کا گواہ خود کلام اللہ ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہزاروں برس سے صفا اور مروہ کے میدان میں میلہ لگا ہوا ہے۔ اسی میدان میں شاہانِ مُلکِ عرفاں اور تاجدارانِ ملکِ فقر و تسلیم و رضا کے بستر لگے ہوئے ہیں۔ اسی میدان میں حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ ہیں۔ قدم قدم پر انبیاؑ و صفیا اور اولیا ہیں۔ یہی زمین آسمان ہے۔ گوشہ امن ہے وادیٔ ایمن ہے۔ دارالسّلام ہے۔ حد ہو گئی کہ اسی میدان میں خانہ کعبہ ہے۔ حجر اسود کے پاس بی بی ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔ مختصر یہ کہ "پرستش گاہ صفا کیشاں چوں مروہ در پاکبازی ست!" اہل صفا کی عبادت گاہ صفا اور مروہ کی طرح پاک اور مقدس ہے!

(۳) "چیپ از راست نا شناسے کہ ایں دو خانہ را ہم سنگ دیدہ"

وہ قیامت! وہ شہادت! وہ عدالت! وہ ہجوم! اور کہیں تم بھول جاؤ ---- وعدۂ دیدار کو! صفیر بلگرامی

ایک عاشق نے طورِ سینا پر دیدار کی تمنا کی۔ لن ترانی نے تجلی کی زبان سے کہا ہوش میں آ۔ اُس دن سے عاشقوں کی بستی میں کہرام تھا۔ عہد توریت میں عہد زبور میں عہد انجیل میں۔ تب عاشقوں نے قرآن سے پوچھا۔ قرآن نے جواب دیا (سورۃ الواقعہ)

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ .... جب قیامت آئے گی۔
لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ .... جس کا آنا ہرگز جھوٹ نہیں۔
خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ .... جو پست کرنے والی ہے۔ جو بلند کرنے والی ہے۔
اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝ .... جب زمین جھولا جھولے گی۔
وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ .... اور پہاڑ سرمہ ہو جائینگے۔
فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝ .... اور غبار کی طرح ہوا میں پھیل جائیں گے۔
وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ .... اُس دن تم تین گروہ ہو جاؤ گے!

اوّل۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اور آگے بڑھنے والے تو آگے ہی بڑھنے والے ہیں وہی تو مقرب بارگاہ ہیں۔

دوم۔ وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۝ اور داہنے ہاتھ والے۔ کیا کہنا ہے داہنے ہاتھ والوں کا۔

سوم۔ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ اور بائیں ہاتھ والے۔ کیا بُری گت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی ---

اس طرح قیامت میں تین صفیں ہوں گی۔ سب سے آگے عاشقانِ خدا۔ داہنے ہاتھ کی طرف اللہ کی فوج۔ اور بائیں ہاتھ کی طرف بتوں کی فوج۔

عاشقانِ خُدا وہ ہیں جن کے عشق کا امتحان لیا جاتا ہے بھوک سے۔ پیاس سے۔ چھری سے۔ آگ سے۔ طوق سے زنجیر سے۔ زہر سے۔ دار سے۔ رسن سے۔ دُنیا بھر کی مصیبتوں سے! یہ وہ مجرمانِ عشق ہیں جن کو محشر میں شرفِ حضوری اور

شربتِ دیدالضیب ہوگا۔ یہ وہ گنہگاران عشق ہیں جن کو حضوری اور دیدار کے لئے سب سے آگے جگہ دی جائے گی۔ محشر میں طورِ سینا نہیں تو لن ترانی کیسی؟ ؎

ہم عاشقوں کی عرش کے آگے جمی ہے صف! — محشر میں غل ہے "تیرے گنہگار آئے ہیں!" — صفیر بلگرامی

۵۱ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ اور اَصْحٰبُ الشِّمَالِ۔ داہنے ہاتھ والے اور بائیں ہاتھ والے۔ کیا کہنا ہے داہنے ہاتھ والوں کا۔ کیا بُری گت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو بیت اللہ اور بیت الصنم میں۔ ان دونوں میں جو فرق نہیں کرتا اُس کو داہنے ہاتھ اور بائیں ہاتھ کی تمیز نہیں۔ یعنی

"چپ و راست نا شناسے کہ ایں دو خانہ را ہم سنگ دیدہ!"

(۴) ؎ مشو کرامتِ بُت خانۂ مرا منکر — کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

یہ شعر چندر بھان کا ہے۔ چندر بھان برہمن لاہوری۔ شاگرد عبدالحکیم سیالکوٹیؒ اصل شعر یوں ہے ؎

ببیں کرامتِ بُت خانۂ مرا۔ اے شیخ — اگر خراب شود خانۂ خدا گردد!

---

۵۱ (۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ اُن کا عصا اژدہا بن جاتا تھا جس وقت یہ معجزہ عطا ہوا تھا اُس وقت عصا حضرتؑ کے داہنے ہاتھ میں تھا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (سورۂ طٰہٰ) | اور اے موسیٰ! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

(۲) قیامت میں نامۂ اعمال دیا جائے گا تو نیکوکار کو داہنے ہاتھ میں اور بدکار کو بائیں ہاتھ میں۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ (سورۂ حاقہ) | پھر جس کا اعمال نامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ (سورۂ حاقہ) | اور جس کا اعمال نامہ اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا

(۳) اول کسیکہ عَلَم بر جامہ کرد و انگشتری در دستِ چپ جمشید بود گفتندش چرا زینت بچپ دادی و فضیلت راست راست گفت راست را زینت راستی تمام است — (گلستاں باب ہشتم)

جمشید پہلا شخص تھا جس نے کپڑوں پر بیل بوٹے بنائے اور انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہنی۔ کسی نے پوچھا کہ داہنے ہاتھ کو چھوڑ کر تو نے بائیں ہاتھ کو زینت بخشی؟ جمشید نے جواب دیا کہ دستِ راست کی زینت خود اُسکی راستی ہے۔ کیوں اب کسی اور زینت کی اُس کو حاجت نہیں رہی۔

(۴) بزرگے را پرسیدند کہ چندیں فضیلت کہ دست راست راست خاتم در انگشت چپ چرا می کنند۔ گفت ندانی کہ اہل فضیلت ہمیشہ محروم اند — گلستاں باب ہشتم

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ داہنے ہاتھ کی بزرگی مسلّم ہے تو انگوٹھی بائیں ہاتھ میں کیوں پہنی جاتی ہے؟ بزرگ نے جواب دیا کہ دنیا اسی کا نام ہے۔ یہاں اہل فضیلت کو کوئی نہیں پوچھتا

(۵) چونکہ داہنے ہاتھ کی فضیلت اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ سے ثابت ہے اس لئے مسلمان بادشاہوں نے وزیر اعظم کے لئے خطاب یمین الدولہ مناسب سمجھا۔ مثلاً یمین الدولہ آصف خاں وزیر شاہجہاں۔

چندر بھان برہمن دارا شکوہ کا منشی تھا۔ دارا شکوہ ۱۰۶۹ھ ہجری دار الامتحان سے دار السلام کو سدھارا تو چندر بھان بھی آقا کے سوگ میں بنارس چلا آیا۔ اور پھر پاؤں توڑ کر بیٹھ رہا۔ سال رحلت ۱۰۷۳ھ ہجری۔ چندر بھان اپنے تخلص برہمن سے وہی کام لیتا تھا جو بعد میں حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے تخلص مومن سے لیا۔

دارد خیالِ روئے تو در دیدہ برہمن من ذرہ حقیرم و مہمانم آفتاب!	یہ کیوں کہو کہ برہمن آفتاب پرست ہے؟ یوں کہو کہ سلیمان چیونٹی کے گھر مہمان ہے۔ اور ذرہ کی زبان سے کہتا ہو تو یوں کہو کہ —— ایں خانہ تمام آفتاب ست!
بے جزو رہ بہ کل نتواں برد برہمن ہر جزو روزگار نمودار آں کل است!	سمندر کی تمنا ہو تو قطرہ میں فنا ہو جاؤ۔ ہر قطرہ اپنی جگہ پر معرفت کا سمندر ہے۔ برہمن اس راز کو جانتا ہے۔ اسی لئے برہمن قطرہ میں گم ہو کر سمندر سے جا ملتا ہے۔ اور کائنات کے ذرہ ذرہ کو مسجود سمجھتا ہے!
لازم آمد بسر ما خدمت بت برہمن محو کے گردد ہر آں نقشے کہ در دل نشست؟	برہمن کے دل پر بت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ نقش مٹ نہیں سکتا۔ پتھر کی لکیر ہے!

دارا شکوہ چندر بھان کو ایک مرتبہ شاہجہاں کے دربار میں لے گیا۔ شاہجہاں نے کہا —— "از گفتۂ خود شعرے بخواں"۔ چندر بھان نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم!	برہمن کا دل بھی بڑا کافر نکلا۔ بارہا ہم اس کو کعبہ کی زیارت کرا لائے۔ پھر بھی آج تک یہ برہمن کا برہمن ہی ہے!

یہ شعر سن کر شاہجہاں کو جلال آ گیا۔ حکم دیا۔ "کسے تواند کہ جوابِ ایں کافر برساند؟" بارے وزیر سلطنت نواب افضل خاں کو گلستانِ سعدی خوب یاد تھی۔ برجستہ جواب دیا ؎

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود   چوں بیاید ہنوز خر باشد!

باب سوم — عہد بہادر شاہی

بابر کے بھیس میں قیامت لاہور سے پانی پت پہنچی تو سلطان ابراہیم لودی بھی دلّی سے پانی پت پہنچا۔ پانی پت میں سیلاب سیلاب سے ٹکرایا۔ لاہور کا سیلاب دلّی کے سیلاب کو نگل گیا۔ پانی پت کی لڑائی بابر نے جیتی۔ اس جیت کی تاریخ — ابراہیم لودی شہید شد (۹۳۲)۔

ابراہیم لودی کے درباریوں میں شیخ محمدؐ راضی ابن شیخ محمد رضی قریشی بھی تھا۔ محمد راضی نے بابر کے خوف سے حصار فیروزہ میں پناہ لی۔ یہ حصار فیروزہ وہی ہے جس کا ڈانڈا سہسرام سے ملا ہوا ہے۔ سہسرام ضلع شاہ آباد میں شیر شاہ کا روضہ ہے۔ اور حصار فیروزہ میں فرید خاں سوری عرف شیر خاں عرف شیر شاہ بادشاہ دہلی پیدا ہوا تھا۔ الغرض شیخ محمدؐ راضی قریشی نے حصار فیروزہ میں پناہ لی تو اسی وجہ سے وہ حصاری مشہور ہوا۔ اور اسی حصار سے اس خاندان کی شہرت کا دائرہ دور اکبری و جہانگیری میں بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ عہد شاہجہانی میں اس خاندان کے چشم و چراغ داؤد خاں پر داراشکوہ کی نظر پڑی۔ داراشکوہ نے نواب داؤد خاں کو آگرہ اور دہلی کی خدمت راہداری اور متھرا مہابن وغیرہ جاگیرات خاص کی فوجداری سپرد کی۔

عہد عالمگیری[1] میں نواب داؤد خاں نے پندرہ سال تک صوبہ داری کی۔ اس صوبہ داری کی شان پٹنہ نے دیکھی۔ برہان پور نے دیکھی ناگپور نے دیکھی۔ الہ آباد نے دیکھی۔ آج الہ آباد ناگپور برہان پور اور عظیم آباد سے پوچھا جائے کہ داؤد کون تو چاروں یہی کہیں گے کہ داؤد نگر سے پوچھو۔

سنہ ۱۰۳۲ ہجری میں تلسی داس شاعر نے بنارس میں اور شاہ ارزاں نے پٹنہ میں انتقال کیا۔ ہندوستان میں اس وقت نورجہانی سکّہ چل رہا تھا۔ اس کے پورے چالیس سال بعد سنہ ۱۰۷۲ ہجری میں ضلع گیا میں داؤد نگر کی بنیاد پڑی۔ شہر اور قلعہ کی تکمیل سنہ ۱۰۸۵ ہجری میں ہوئی۔ یہ تیرہواں سال تھا اور تیرہ ۱۳ کی نحوست یہ کہ بانیٔ داؤد نگر نواب داؤد خاں نے اسی سال رحلت کی۔ داؤد خاں کی موت داؤد نگر کی موت اور داؤد خاں کا مرثیہ داؤد نگر کا مرثیہ۔ چنانچہ نواب عنایت اللہ خاں عرف نواب حمید خاں ثانی خلف نواب جیون خاں فرماتے ہیں (تاریخ داؤدیہ مولفہ سید محمد ناصر بلگرامی مطبوعہ آئینی پریس الہ آباد)

---

[1] خان بہادر سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے ایک مضمون بہار اوڑیسہ ریسرچ جرنل ستمبر ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تھا۔ حافظ سید عبدالرؤف اورنگ آبادی نے اردو میں ایک اچھوتا مضمون معارف اعظم گڈھ اکتوبر نومبر ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تھا۔ خان بہادر مرحوم نے مطبوعہ کتابوں سے اور حافظ صاحب نے فرامین اور قلمی بیاضوں سے مدد لی۔ یہ دونوں مضمون قابل قدر ہیں۔

۱ چہ دل بندی درین دنیا؟ کہ افسوں ست افسانہ! ہزاراں عاقل و فرزانہ را کردست دیوانہ!

۲ بزیر گردش گردوں چہ امید بقا باشد؟ کجا ماند سلامت در میانِ آسیا دانہ؟

۳ اگر آید دمِ اوّل ―― دمِ دیگر مجو از پس کہ آں بُد آشنا اوّل۔ در آخر ہست بیگانہ!

۴ قیاس از حشمتِ داؤد خاں کن کز سپاہِ او شدے آباد شہرے گر گذر کردے بہ ویرانہ!

۵ بسے شمشیرہا زد بر سرِ بنگالہ و دکھن کز و شد داستانِ رستمِ دستاں بہ افسانہ!

۶ چوں جاں بسپرد۔ ایماں بُرد در راہ جوانمردی
بتاریخش خرد گفتا۔ بایماں رفت مردانہ! ۱۰۸۴ھ ہجری

پانچواں شعر افسانہ نہیں۔ واقعہ ہے۔ ۱۰۶۹ھ ہجری میں عالمگیر نے اپنے بھائی سلطان شجاع کی سرکوبی کے لئے میر جملہ کو بنگالہ بھیجا۔ میر جملہ کی مدد کے لئے پٹنہ سے نواب داؤد خاں بھاگلپور اور کہل گاؤں ہوتا ہوا مالدہ پہنچا۔ سلطان شجاع کو میدان چھوڑنا پڑا۔ آخر وہ اپنی جان لے کر بنگالہ سے ملک اراکان پہنچا۔ لیکن راجہ اراکان ملک الموت سے رشوت لے چکا تھا اُس نے شجاع کو بال بچوں سمیت ایک کشتی میں بٹھا کر دریا میں غرق کرا دیا۔ چنانچہ وہ غریقِ دریائے رحمت اپنی پریشان حالی اور خانہ بربادی کی تصویر اپنے ہاتھ سے کھینچ کر ۱۰۷۱ھ ہجری میں دنیا سے چل بسا ؎

نمی دانم کہ گردوں چوں بکامِ من نمی گردد پریشانی اگر عیب ست زلفِ یار ہم دارد! شاہزادہ شجاع

جو حال بنگالہ کا ہوا وہی دکن کا ہوا۔ دکن میں نواب داؤد خاں کا ادنیٰ کارنامہ یہ تھا کہ ۱۰۸۰ھ ہجری میں خود شیواجی مرہٹہ کو دربار داؤدی میں سلام کے لئے حاضر ہونا پڑا۔ چنانچہ مشہور مورخ پروفیسر جدو ناتھ سرکار اپنی کتاب شیواجی (مطبوعہ ۱۹۱۱ء ص ۲۱۱/۲۱۲) میں اقرار کرتے ہیں:―

"THE ONLY OFFICER WHO MADE AN ATTEMPT TO UPHOLD THE IMPERIAI PRESTIGE IN DECCAN WAS DAUD KHA QURESHI DURING JAI SINGH'S MAR ATHA CAMAIGN OF 1665............ THE EMPEROR IN OPEN COURT HI GHLY PRAISED DAUD KHAN FOR HIS SPIRIT IN INVADING THE ENEMY'S CO UNTRY, REGARDLESS OF THE SMAL NESS OF THIS OWN FORCE ....

SHIVAJI AND HIS TIMES: J. SARK

۱۶۶۵ء میں راجہ جے سنگھ اور مرہٹوں میں جنگ ہوئی تو داؤد خاں قریشی ہی ایک ایسا شخص نکلا جس نے ملک دکن میں سلطنت مغلیہ کی آبرو رکھ لی۔ ....خود بادشاہ نے تعریف کی اور سرِ دربار فرمایا کہ صد آفریں ہے داؤد خاں کو کہ فوج اُس کے پاس اتنی کم۔ پھر بھی اُس نے مطلق پرواہ نہ کی اور دشمن کے ملک میں دلیری کے ساتھ بڑھ گیا۔

اسی طرح چوتھا شعر بھی افسانہ نہیں۔ واقعہ ہے۔ جمادی الاول ۱۰۷۲ھ ہجری میں داؤد خاں نے پلاموں کا قلعہ فتح کیا۔ بعد فتح یہ پٹنہ جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ شکار کے لئے ٹھہر گیا۔ اس جنگل کا نام انچھا تھا۔ یہاں کسی نے آکر خبر دی کہ حضور! علی بابا اور چالیس اسی جنگل میں رہتے ہیں! ؎

انچھا لانگھے اور بھدوہی ۔ تب جانو گھر آئے بٹوہی!

یعنی یہ شکار کی جگہ نہیں۔ یہ ٹھگوں کی راج دھانی ہے۔ انچھا اور بھدوہی کا راہی بٹوہی اپنا سر سلامت لے گیا تو جانو کہ موت کے چنگل سے چھوٹا۔ داؤد خاں قریشی تھا۔ قریشی کو غیظ آ گیا۔ غیظ میں سارا جنگل کاٹ کر میدان کر دیا۔ اور عالمگیر کو عرضداشت بھیجی تو یہ کہاوت بھی لکھ دی۔ بادشاہ نے فتح پلاموں کی خوشی میں انچھا گوہ اور منورہ تین ۳ پرگنے داؤد خاں کو انعام کئے۔ اور داؤد خاں نے مٹی جس کنوئیں کی تھی اُسی کنوئیں میں لگا دی۔ یعنی تینوں پرگنوں کی آمدنی اسی ویرانہ پر نچھاور کر دی۔

یہی ویرانہ آباد ہو کر داؤد نگر ہوا۔ یادش بخیر داؤد نگر کا ہر محلہ اُس وقت شاعر کا ایک دیوان تھا۔ اور اس طرح شہر داؤد نگر گویا کلیات داؤدی تھا۔ جس طرح ایک دیوان دوسرے دیوان کا تابع نہیں ہوتا اسی طرح داؤد نگر کا ایک محلّہ دوسرے محلہ کا دست نگر نہیں تھا۔ جس طرح دیوان میں غزلیں الف سے ی تک ہوتی ہیں اسی طرح ہر محلہ میں اہل حرفہ بھی الف سے ی تک آباد کئے گئے۔ ڈوم چمار وغیرہ کے لئے جگہ کلیات داؤدی کے حاشیہ پر نکالی گئی۔ اس ترتیب خاص میں داؤد نگر اپنی نظیر آپ تھا۔ اسی چہل پہل کو یاد کر کے کہنے والا کہتا ہے۔

قیاس از حشمتِ داؤد خاں کن۔ کز سپاہِ او ۔ شدے آباد شہرے — گر گذر کردے بہ ویرانہ!

نواب داؤد خاں کے بیٹے نواب حمید خاں نے ۱۰۹۲ھ ہجری میں اور پوتے نواب جیون خاں نے ۱۱۲۴ھ ہجری میں رحلت کی۔ نواب جیون خاں کے ۲ دو لڑکے۔ عنایت اللہ خاں عرف نواب حمید خاں ثانی۔ اور فقیر اللہ خاں عرف نواب احمد خاں مورخین ان کو نواب احمد خاں حصاری کہتے ہیں کیونکہ اُسی زمانہ میں ان کے ہمنام نواب احمد خاں بنگش فرخ آباد میں موجود تھے۔ نواب احمد خاں حصاری کا قیام عرصہ تک عظیم آباد محلہ مغل پورہ میں رہا۔ ۱۱۴۵ھ ہجری میں احمد خاں نے داؤد نگر کے متصل احمد گنج آباد کیا۔ اور بعد میں وہ وہیں مولا باغ میں مدفون ہوئے۔

داؤد نگر اور احمد گنج کی دولت کا شہرہ دور دور تھا۔ ۱۱۵۷ھ ہجری میں ایک عیّار شاطر بالاجی راؤ مرہٹہ نواب مہابت جنگ علی وردی خاں سے شطرنج سیاست کھیلنے کے لئے مرشد آباد جا رہا تھا۔ راستہ کاٹ کر بالاجی راؤ یکایک داؤد نگر پہنچ گیا۔ نواب احمد خاں نے غوث گڈھ میں پناہ لی۔ اور پچاس ہزار روپے صدقہ کر کے اپنے سر سے یہ بلا ٹالی۔

مری عقل اس جا پہ حیران ہے ۔ کہ یا رب یہ کیسا گلستان ہے!
کبھی ہے خزاں اور کبھی ہے بہار ۔ نہیں اک دبیترے پہ لیل و نہار!
میر حسن

گلستان داؤد نگر میں خزاں بندوبستِ دوامی کے وقت آئی۔ لارڈ کارن والس نے پرگنات انچھا گوہ منورہ پر جمع باندھ دی۔ اولادِ داؤد خاں نے سر پیٹ لیا۔ کہا کہ یہ شاہانِ مغلیہ کا عطیّہ ہے۔ بزرگوں کا تبرک ہے۔ قدیم معافی ہے اس پر سرکاری جمع کیسی؟ مگر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ تینوں پرگنے اس خاندان کے قبضہ سے نکل گئے۔ اور صرف تین پتیوں کیلئے

پانچ ٹکے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ یعنی سیر بھر نیلم الماس اور لعل کے بدلہ پاؤ بھر ستّو! چوتھی پشت میں اللہ کا نام! ؎

چہ دل بندی دریں دنیا کہ افسون ست و افسانہ — ہزاراں عاقل و فرزانہ را کردست دیوانہ!
بزیرِ گردشِ گردوں چہ امیدِ بقا باشد — کجا ماند سلامت درمیانِ آسیا دانہ؟

ہم باز آئے ایسی دنیا سے۔ اے بھائی! یہ مُردار دل لگانے کے قابل نہیں۔ یہ چھچھوندر ہے۔ سانپ ہے۔ بچھو ہے۔ افسوں ہے۔ افسانہ ہے۔ مکڑی کا جالا ہے۔ اندرائن کا پھل ہے۔ کامروپ کا جادو ہے۔ اہل ہوش اس سے پناہ مانگتے ہیں لیکن اس کا جادو ہوش والوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ درمیانِ آسیا دانہ! چکّی کے دو پاٹ۔ زمین اور آسمان۔ بیچ میں ایک مٹھی گیہوں۔ چکّی آٹھوں پہر چل رہی ہے صورت یہ ہے تو گیہوں کی خیریت معلوم!

گلستانِ داؤدنگر سے بہار جب روٹھ کر چلی گئی اور کلیات داؤدی کے اوراق جب پریشان ہو گئے تو بلبلیں بھی اس باغ سے کوچ کر گئیں اور اوراق پریشان بھی ہوا میں منتشر ہو گئے۔ مثلاً حضرت اکبر الہ آبادی اور لالہ وزیر مل۔

سیّد محمد زماں رضوی فوج بنگال میں صوبہ دار تھے۔ اور لارڈ کلایو کے ساتھ جنگ پلاسی میں شریک تھے۔ بعد فتح ان کو قرب داؤدنگر میں جاگیر ملی۔ ان کے بڑے لڑکے سید تفضل محمد رئیس داؤدنگر۔ عہد آصف الدولہ میں یہ داؤدنگر سے لکھنؤ گئے۔ اور پھر کانپور گئے۔ وہاں انہوں نے عہدۂ نظارت قبول کیا اور ۱۲۷۲ھ ہجری میں رحلت کی۔ سیّد مظفر علی مجنوں بلگرامی نے تاریخ رحلت کہی۔ اور کیا خوب کہی ؎ ”زہے برحالِ او فضلِ محمدؐ“ (۱۲۷۲)۔

سیّد تفضل محمد کے تین لڑکے۔ سیّد وارث علی۔ سیّد واصل علی۔ اور سید تفضل حسین۔

مولانا سیّد تفضل حسین کے دو لڑکے۔ سیّد اکبر حسین اکبر الہ آبادی اور سیّد اکبر حسن۔ مولانا سیّد تفضل حسین اور حضرت اکبر الہ آبادی دونوں کو حضرت مولانا شاہ محمد قاسم داناپوری سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ولادت اکبر الہ آبادی دوشنبہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ ہجری۔ رحلت حضرت شاہ محمد قاسم داناپوری پنجشنبہ ۱۷ شوال ۱۲۸۱ھ ہجری۔ اس طرح حضرت اکبر الہ آبادی نے آغاز شباب ہی میں بیعت کر لی تھی۔

مرحوم و مغفور داؤدنگر میں لالہ وزیر مل ایک ادیب تھا۔ فکر معاش اس کو بھی داؤدنگر سے بریلی لے گئی۔ اور وہاں عدالت اپیل میں اللہ نے اس کا سامان کر دیا۔ سال رحلت غالباً ۱۲۶۸ھ ہجری۔ اس ادیب نے اپنے خالو لالہ جواہر مل فدا داؤدنگری سے تعلیم پائی تھی۔ یہ تعلیم عہد بہادر شاہی کی تعلیم تھی۔ چنانچہ زمانہ کی گردش نے داؤدنگر کی جامع مسجد کو بھی نہ چھوڑا تو مسجد کی حالت دیکھ کر لالہ وزیر مل سے رہا نہ گیا۔ آخر اس کے قلم کو جنبش ہوئی:—

تحریر لالہ وزیر مل درباب جامع مسجد داؤدنگر	
جامع مسجد قصبہ داؤدنگر کہ از مدت بہ نیتِ نماز برپا بود۔ و دیوارش از غایت کہنگی برکوع آمدہ۔ قریب ہست کہ بسجدہ ہم رود۔ تاب آں ندارد	داؤدنگر کی جامع مسجد نماز کی نیت باندھے مدت سے کھڑی تھی۔ اس کی دیوار جو پیرانہ سالی کی وجہ سے رکوع میں تھی اب سجدہ میں آیا ہی چاہتی ہے۔ رکوع سے سر اٹھانے کی اس میں تاب کہاں

کہ بے پشتی امداد بلند اقبالاں قد قامت گویاں سر برآرد۔

چوں جائے کہ بارگاہِ احدیت اوست نمی داند تفاوتے درمیانِ دشمن و دوست و مغز و پوست در نخلستانِ عزتش خار و ثمر از یک نہال۔ و بکارخانۂ قدرتش ظرفِ طینتِ موافق و منافق ساختۂ یک کلال ز نّارِ ترسا و سبحۂ پارسا سرشتۂ یک رشتہ۔ و تخم کیفیتِ خداشناساں و نخلِ حقیقتِ رام پرستاں یک باغبان کشتہ — محرمانِ دیر و حرم و واقفانِ کعبہ و بیت الصنم در یک مقام راہ بر۔ ہندو و مسلمان چہ مدرسانِ بید و پران و تلاوتیانِ حدیث و قرآن در طریقِ حق پرستی بیک منزل بے سپر۔ شیخ خانقاہ و راہبِ صنم گاہ ہر دو بذکرِ آں یگانۂ مطلق۔ قرنائی ناقوس نواز و صدائی بانگِ نماز بیادِ آں احدِ برحق ہے

ہر ہمہ را روئے بدرگاہِ او
کام زبان آمدہ در راہِ او

سر بسر اندر طلبش در بدر
گرد رہِ کعبہ و بُت خانہ سر

عالم تمام از رخِ جانانہ روشن است!
از یک چراغ کعبہ و بُت خانہ روشن است!

جمیع مسلمانان اہلِ اسلام و ہنودان فرمان پذیر رام نظر بر کار خیر ساختہ۔ کعبہ و دیر را پرستش گاہِ معبود حقیقی دانستہ۔ بقدرِ استطاعت خود ہا امداد فرمایند۔ و از مرمت خانۂ خدا ابوابِ ثواب بر روئے صلاحیتِ خود کشایند۔ الٰہی توفیقِ خیر رفیق کناد۔

جب تک کہ قد قامت الصلوٰۃ کہنے والے سہارا دیکر اسکو خود نہ اٹھائیں۔

وہاں باغ میں ڈالی جھوم رہی ہے۔ یہاں کمہار کا چاک چکّر میں ہے۔ وہ کیوں جھوم رہی ہے؟ یہ کیوں چکّر میں ہے؟

مالی ایک ہی ڈالی سے رنگ رنگ کی چیزیں نکال رہا ہے۔ یہ کانٹا ہوگیا۔ وہ پھل۔ یہ کفر ہوگیا۔ وہ اسلام۔ یہ مشاہدہ کرتے ہی ڈالی جھوم گئی۔ وجد میں آگئی۔ سُبحان تیری قدرت!

کمہار ایک ہی چاک سے طرح طرح کے پیالے اُتار رہا ہے۔ یہ نمرود ہوگیا۔ وہ خلیل اللہ۔ یہ فرعون ہوگیا۔ وہ کلیم اللہ۔ یہ مشاہدہ کرتے ہی چاک کو حال آگیا۔ مستی میں ناچنے لگا۔ سُبحان تیری قدرت!

جو حال ڈالی اور چاک کا وہی زمین اور آسمان کا۔ کُنْ فَیَکُوْن کا تماشہ دیکھتے ہی کائنات وجد میں ہے۔ دنیا گھوم رہی ہے۔ آسمان چکّر میں ہیں۔ شش جہت سے آواز آرہی ہے۔ "سُبحان تیری قدرت!"

بس داؤد نگر کی جامع مسجد بھی بارگاہ ہے اُسی بے نیاز و یکتا کی جس کی نگاہ میں دشمن و دوست اور مغز و پوست دونوں ایک۔ اُسی ربّ العزّت کی جس کے باغ میں پھل اور کانٹے دونوں مہمانِ عزیز۔ اُسی صاحبِ قدرت کی جس کے کارخانہ میں ظروفِ کفر اور ظروفِ اسلام دونوں ایک۔

جو رشتۂ تسبیح و زنّار میں وہی ایزد پرست اور آتش پرست میں جس مالی نے خدا پرستی کا بیج بویا اُسی نے رام پرستی کا درخت بھی لگایا۔ دیر و حرم اور کعبہ و بیت الصنم کے جاننے والوں کی منزلِ مقصود ایک۔ بید و پُران اور حدیث و قرآن کا شاہدِ مقصود ایک! ہے

یہ تعلق ہو مبارک کافر و دیندار کو
ایک رشتہ ہے ہر اک تسبیح سے زنّار کو

مسعود اکبر رؤ

وہی یگانۂ مطلق ہے جس کا شور خانقاہوں میں اور بُت خانوں میں۔ وہی واحد برحق ہے جس کا بول بالا ناقوس ... اذان ... اُسی قبلۂ عالم کی تلاش میں رہروانِ دیر و حرم ...

خاک بسر ہیں - اللہ ری رخِ جانان کی تجلّی ! چوکھ جوت ہے !
عالم جگمگ جگمگ کر رہا ہے !

حرم و دیر میں ہے جلوۂ پُر فن اُن کا
دو گھروں کا ہے چراغ اک رخِ روشن اُن کا

اس لئے اہل اسلام اور بندگانِ رام سے عرض ہے کہ بیت اللہ اور بیت الصنم کو معبودِ حقیقی کی عبادت گاہ سمجھ کر اپنی حیثیت کے مطابق اس کارِ خیر میں شریک ہوں - اور خانۂ خدا کی مرمت کے وسیلہ سے اپنے لئے ثواب کا دروازہ کھولیں --

خدا اس کی توفیق سب کو دے !

تحریر بالا نہ زیر بحث - یہ چند فقرے تشریح طلب ہیں - اس تشریح سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ عارفان کس کو کہتے ہیں اور اہلِ معرفت کی پہچان کیا ہے -

(۱) جائے کہ بارگاہِ اہل بیت او ست کی واحد نقاد نے درمیان دشمن و دوست
کسی شیعہ نے لعن طعن کیا - تبرائی کی گرفتاری کے لئے مجمع ہوا - یہ مجمع سعد اللہ اور مجد الدین کے مشورہ سے ہوا -
یہ دونوں ایک عارف باللہ کے حلقہ بگوش تھے - عارف باللہ کو اس ہنگامہ آرائی اور خود اپنے مریدوں کی شرکت کا حال معلوم ہوا تو اُس نے دونوں کو ایک خط بھیجا :-

مکتوب عارف بنام غیر عارف

برادرم مجد الدین و فرزندم شیخ سعد اللہ بدانند کہ خبر مجمع شدن بندہائے الٰہی بگرفتار نمودن جوان رافضی مفصّل رسید - می گویند کہ این اجماع باستصواب شما بود - اگر حق است براہ باطل رفتہ آید - و اگر غلط است ذبیحت نسخہ ہستی شما اندگو نیست - چہ آن مسکین زبان دراز ہر چہ گفتہ بود اگر دروغ است واجب الرحم ست کہ منصب و منصب بے خبران است - و اگر راست ست پس سیاست برائے چہ ؟

شعر

راستی موجب رضائے خدا ست
کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

این ہمہ شما را چہ باید گفت کہ او را خود را دو تا دانستید -
چون مخلوق چنین شدہ آید معاف - باید داشت شمار احکم در نواصب و

تبرّا یا تو حق ہے یا ناحق - جائز ہے یا ناجائز - سچ ہے یا جھوٹ - اگر سچ ہے تو سچ بات پر رافضی کی گرفتاری کیسی ؟ اگر جھوٹ ہے تو ثابت ہوا کہ رافضی غریب حقیقت سے بے خبر اور اس لئے واجب الرحم ہے -

غضب ہے کہ تم نے اپنے کو اور اس رافضی کو دو سمجھا - اور ستم ہے کہ اپنی حد سے باہر پاؤں نکالا - تم ہوتے کون ہو شیعانِ علی و دشمنان علی میں حق و ناحق کا فیصلہ کرنے والے ؟ تمہارا کام تھا ہمکو پہچاننا - افسوس کہ یہی کام تم نے اب تک نہیں کیا - اب بھی وقت ہے کہ پہچان لو -

رد افض نکردہ ام۔ برائے خود در وجود آوردہ ام۔ مرا بشناسید در من گم مشوید۔ من کیستم کہ من بگویم۔ من گفتنم بیجاست۔ تو ئے و او ئے مقابل خود ندارم۔ ہرچہ کردی خوب کردی۔ کردید نمی گو یم کہ مخبر از دوئی ست۔ و ایں ہم نمی دانم کہ بہ کہ می گوید و چہ می گوید زیادہ ازیں چہ پوچ بگویم۔ دتا کجا یا وہ چا ویدہ باشم۔ خود کار بد کردن و نفریں دیگراں یعنی چہ۔ گاہے زبان را بہ سبّ صحابہ وا می کنم۔ وگاہے بگرفتار کردن خود می روم۔ وگاہے خود را بگرفتار کردن خود ملوم می سازم۔ دیوانۂ عشقم۔ ہرچہ خواہم بگویم۔ و ہرچہ خواہم بکنم۔ (چار شربت مصنفہ مرزا قتیل ص ۷۳۔)

تبرّا کون کرتا ہے؟ ۔۔۔ ہم کرتے ہیں!
تبرّائی کو گرفتار کون کرتا ہے؟ ۔۔۔ ہم کرتے ہیں۔
گرفتار کرنے والے کو ملامت کون کرتا ہے؟ ۔۔۔ ہم کرتے ہیں!
جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں۔ رافضی ہم۔ رافضی کے دشمن ہم۔ دشمنِ رافضی کے دشمن ہم۔ ہمارے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ ہمارے سامنے دوئی کا پردہ نہیں

۵ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

صوبہ الہ آباد کی حکومت شاہزادہ داراشکوہ کے ہاتھ میں آئی تو اُس نے ایک مکتوب حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کو بھیجا جس میں اٹھارہ سوالات تھے۔ مثلاً ۔۔

سوال سوم ۔۔۔ کدام علم است کہ او را حجاب الاکبر گفتہ اند؟
سوال ہشتم ۔۔۔ ظَلُومًا جَهُولًا در مدح انسان ست یا در مذمت؟
سوال دہم ۔۔۔ طالب را بعد از موت وصل ممکن باشد یا نہ؟
سوال دوازدہم ۔۔۔ تفرقۂ درد و عشق چیست؟
سوال پانزدہم ۔۔۔ غیر متناہی در متناہی چہ گونہ گنجد؟

آغاز مکتوب میں داراشکوہ نے لکھا تھا کہ صوبہ الہ آباد جو ہمارے ہاتھ میں آیا اس کی خوشی زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ آپ وہاں موجود ہیں۔ گذارش ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی اور بہبودی کا جو کام بھی آپ کے پیش نظر ہو اُس کو مرزا باقی بیگ اثر حاکم الہ آباد سے ضرور فرمادیا جائے۔ وہ آپ کے حکم کا ہمیشہ منتظر رہے گا۔

مکتوب کے اس حصہ کا جواب شیخ محب اللہ نے یہ دیا کہ شاہزادہ بلند اقبال کو کیا نہیں معلوم کہ اللہ رَبُّ الْعَالَمِينَ اور اللہ کا رسول رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِينَ ہے؟ اور کیا نہیں معلوم کہ از روئے کلام اللہ آسمان والے زمین والوں کے لئے ہر وقت مغفرت کی دعا کرتے ہیں؟ اور کیا نہیں معلوم کہ خلق اللہ اللہ کی امانت ہے؟ اور کیا نہیں معلوم کہ اللہ کی امانت میں ظل اللہ یعنی حاکم وقت خیانت نہیں کرسکتا؟ صورتِ حال یہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہزادہ بلند اقبال نے اللہ کی امانت میں خیانت کیوں کی؟ ظل اللہ نے کافر کو خلق اللہ کی بھلائی سے باہر کیوں کر دیا؟ اور کافر و مومن میں صرف مومن کی بہبودی کا خیال کیوں رکھا؟

مکتوب داراشکوہ اور جواب حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کی یہاں گنجائش نہیں۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

مکتوب داراشکوہ

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ

جامع علوم ظاہری و باطنی۔ حاوی مراتب صوری و معنوی۔ میاں شیخ محب اللہ را از محب فقرا دعا و سلام برسد۔ از گرفتن صوبہ الہ آباد بیشتر خوشحالی از وجود شریف ایشان است ہر کارے و مہمے کہ دراں رفاہیت مومناں باشد بہ باقی بیگ اشارتی نمودہ باشند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جواب شیخ محب اللہ الہ آبادی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ملاذ عارفان و معاذ جہانیان۔ عرفان پناہ۔ حقائق آگاہ ضابط احکام دینی و حاوی مراتب شرعی و یقینی عین الانسان و انسان العین۔ سلطان عالم صوری و معنوی برسریر سلطانی و منصۂ شہود و حقائق جلوہ گر باشند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

الحمد للہ کہ شاہزادہ این زمانہ صالح و عارف ربانی اند۔ و چوں ایں صوبہ بنام بندگان آنجناب عالی شد انبساط شکر سابق مضاعف گشت۔ الحمد للہ کہ ما محکوم عارف سبحانی شدیم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ونیز

شرف صدور یافتہ بود کہ ہر امرے کہ دراں رفاہیت مومناں باشد بہ باقی بیگ می گفتہ باشی۔ جزاک اللہ احسن الجزاء۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حق آن است کہ اندیشہ رفاہیت خلق خدا دامنگیر خاطر حکام باشد۔ چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا و دیعت خدا است۔ وسند ایں کہ صاحب آں مقام بہ ہر کسے صالح و فاجر و مومن و کافر مترحم باشد ترحم رسول خدا است۔ چنانکہ بیان یافتہ در فتوحات و وارد است در قرآن۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ بر سبیل عموم مثل رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ غالبًا افاضہ رحمت بر ہر کسے تحت مرتبۂ آں باشد واز حال بعضے ملائک در قرآن خبر دادہ و گفتہ :-

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ط

(۱) زنار ترسا و سبحہ پارسا سرشتۂ یک رشتہ :-

مرزا محمد رفیع سودا فرماتے ہیں ؎

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائی مسلمانی
نہ چھوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی!

اس شعر کا مطلب خواجہ امام الدین نے مرزا محمد حسن قتیل سے پوچھا تو قتیل نے جواب دیا :-

(۱) تمغا بمعنی زرے کہ گذربانان و راہداران بحکم حاکم از تاجران و دیگر راہ گذاران گیرند۔ در استعمال بمعنی سود و نفع۔

(۲) سلیمانی سنگے ست برنگ کبود کہ درمیان آں رگِ سفید باشد کہ آں را زناری گویند۔

غرض شاعر این ست کہ کفر و اسلام ہر دو در اصل یک است و فرق ظاہری نزدیک اہل تحقیق نا معتبر

ہرگاہ کفر ثابت شد، ہماں ثبوتِ کفر ثبوتِ مسلمانی ست۔ یعنی اسلام عین کفر و کفر عین اسلام است
ہر دو از ہم جدائی شوند۔ بنوعے کہ زنار از تسبیح سلیمانی منفک نمی تواند شد۔ ہمیں صورت کفر
از اسلام و اسلام از کفر جدائی گردد۔ شیخ با ایں ہمہ تقویٰ نتوانست کہ زنار از تسبیح سلیمانی جدا سازد"

مرزا سودا نے جو کچھ کہا اور مرزا قتیل نے جو کچھ سمجھا اُس کی ایک مثال یہ ہے کہ داہنا ہاتھ بائیں کو دھوتا ہے۔ اور بایاں ہاتھ داہنے کو دھوتا ہے۔ اسی طرح اسلام کفر سے اور کفر اسلام سے بے نیاز نہیں۔ رُخ کی بہار زلف سے۔ اور زلف کی بہار رخ سے۔ وہ رخ نہیں جس پہ زلفِ شبگوں کا سایہ نہیں۔ وہ ابراہیمؑ نہیں جو صنم کدہ کا پروردہ نہیں۔ وہ زلف نہیں جس کے پاس چاند سا مکھڑا نہیں۔ وہ فرعون نہیں جس کی گود میں موسیٰؑ نہیں۔ ماحصل یہ کہ اسلام عین کفر اور کفر عین اسلام ہے

وہ زلف و رُخ ہیں ایک ہماری نگاہ میں
بس رنگ کا ہے فرق سپید و سیاہ میں — منیر بلگرامی

یہ مطلع مطلعِ آفتاب ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ دلیل یہ کہ ابجد کے آئینہ میں سیاہ سپید ہے اور سپید سیاہ۔ دونوں ۶۷۔ اس لئے جو سپید وہی سیاہ۔ جو رُخ وہی زلف۔ جو اسلام وہی کفر۔ دونوں ایک۔ مگر شرط یہ ہے کہ دوئی کا رنگ باقی نہ رہے۔ دوئی کا پردہ بیچ سے اٹھا دیا جائے!

افسوس ۔۔۔۔۔ از جناب رضا مظہری مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ

جیئے جاتا ہے آدمی افسوس — بیکسی ہائے زندگی افسوس
ان کے کوچے سے بھی تو ہو آیا — نہیں لگتا کہیں یہ جی افسوس
دن کو آرام خبر کیا ملتا — رات کی نیند بھی گئی افسوس
بے نیازوں پہ ہوں کرم بر کرم — نہ ملے دادِ بندگی افسوس
اپنی صبحِ بہار کا انجام — ق — جانتی ہے کلی کلی افسوس
مسکرانے پہ پھر بھی ہے مجبور — کیا مصیبت ہے زندگی افسوس
میرے دل کو کوئی سمجھ نہ سکا — دوستی ہائے دوستی افسوس
میں نے چاہا تھا جس طرح جینا — نہ بنی ویسی زندگی افسوس
کس پہ دنیا میں اعتبار کروں — دل ہے وہ بھی شکستنی افسوس
سوجھتی ہی نہیں حقیقتِ حال — کس قدر کم ہے روشنی افسوس

کس سے کہئے رضاؔ فسانۂ دل
نہیں دنیا میں آدمی افسوس

فکرِ جمیل

(از علامہ جمیل مظہری الکاظمی ایم۔ اے پبلسٹی آفیسر گورنمنٹ بہار)

تجھے حق نہیں کہ خفا ہو تو مری بیدلی نیاز پر
میں لٹا چکا ہوں متاعِ دل ترے عشوہ ہائے مجاز پر

وہ حیاتِ عشق کی اک گھڑی کہ شبِ وصال کہیں جسے
سرِ شام ہی سے گراں ہے جو کسی چشمِ سحر طراز پر

ہے غلط یہ نوحہ گری اگر دلِ نوحہ گر پہ خفا ہو
جو پسند آئے وہ دھن بجا تجھے اختیار ہے ساز پر

کسی آستانۂ ناز پر پڑی ذلتوں سے ادا ہوا
وہ جو قرض تھا تری بندگی کا مری جبینِ نیاز پر

میں ادھر ادھر جو بڑھا رہا ہوں ہوس کے دستِ سوال کو
مری زندگی کا یہ طنز ہے تری شانِ بندہ نواز پر

میں جمیلؔ اب غمِ آرزو کی ہوس کروں بھی تو کس طرح
نہ وہ اعتبار ہے سوز پر نہ وہ اختیار ہے ساز پر

نوروز

ایرانی طرز معاشرت کا ایک دلکش افسانہ

از حضرت ہدف اجتہادی لکھنوی۔ سیاح ایران وعرب

یکم فروردین[1] کی صبح تھی، رات کو جشن نوروزی دیکھنے کیلئے زائد جاگنا پڑا تھا؛ نصف شب تک زینت شہر حسن و چراغان سے قالینوں سے سجے ہوئے بازاروں میں محو تماشہ رکھا اور پچھلے تک نغمہ ہائے شیرین کے ساتھ چنگ رباب کی سہیلی آوازوں نے مکانوں سے بلند ہو ہو کے بستر پر کروٹیں بدلوائی تھیں۔ مین دیر تک سونے کے بعد جاگا بھی تھا تو دیکھا کہ مجل[2] ہاشمی آپہنچا۔ اس کا لباس تو آج بھی روزانہ جیسا سادہ تھا۔ وہ فرنگی کوٹ پتلون اور پہلوی[3] ٹوپی جو وہ برابر پہنا کرتا تھا مگر چہرہ خلاف معمول بہت بشاش تھا۔

میں نے فوراً بستر چھوڑ کر مبارکباد دیتے ہوئے پرمسرت استقبال کیا، اس نے بھی جواب تہنیت دیا اور بڑھ کے میری داہنی باچھ کے سامنے بوسہ لیا، مین نے بھی ساتھ ہی ساتھ بائین باچھ کے پاس بوسہ لیا پھر رخ بدل کے اس نے بائین باچھ کے پاس اور مین نے داہنی باچھ کے پاس بوسہ لیا۔

جب ہم عید مل چکے تو مجل ہاشمی نے کھڑے ہی کھڑے کہا۔ "میں تم کو لینے آیا ہون، آج عید کا دن میرے یہاں گذرے گا"

مین نے سگریٹ کیس بستر پر سے اٹھایا، ایک سگریٹ نکال کے اپنے منہ میں لگائی اور سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اچھا چلتا ہوں، لو سگریٹ تو پیو"

اس نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال لینے کے بدلے میرے منہ کی سگریٹ لیلی اور کہا "سگریٹ پھر پینا، پہلے کپڑے پہنو"

مجل ہاشمی ایک خوبصورت، شیرین گفتار اور سادہ مزاج آدمی تھا۔ اس کی پرلطف گفتگو میں ظریفانہ چٹکلے دوسرون کو دعوت مسرت دیتے تھے۔ لیکن وہ خود ہمیشہ متفکر رہتا تھا۔ سننے والے اس کی باتون پر بے تحاشہ ہنس جاتے تھے مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آتی تھی، لیکن کبھی کبھی باتین کرتے کرتے اس طرح گفتگو کو بے ربط چھوڑ کے چل دیتا تھا جیسے کہین کچھ بھول آیا ہے۔

اس کی زندگی کا یہی ایک ایسا معمہ ہے جسے میں باوجود گہری دوستی کے حل نہ کرسکا تھا، آج وہ میرے یہان خوش خوش آیا تھا، میں نے تکلف مین خاطر شکنی محسوس کی اس لئے جلدی سے منہ دھویا اور بغیر کسی عذر کے ساتھ ہولیا۔

ہم نے راستہ میں سگریٹین سلگائین اور باتین کرتے ہوئے گلیوں سے بازار میں آئے، پٹے ہوئے بازار کی چھان سے نکل کر کھلی ہوئی سڑک کی دھوپ میں پہنچے وہاں سے گھوڑون کی ٹرام میں سوار ہو کے "کوچہ فارابی" کے سامنے اتر پڑے۔ اسی محلہ مین مجل ہاشمی کا مکان تھا جو باہر سے بہت ہی سادہ اور اندر سے نہائت شاندار!

ہم جس کمرہ میں جا کے بیٹھے وہ مردانہ بیٹھکا تھا، اس مین کاشانی[4] قالینون کا فرش بچھا تھا، دیوارون پر آسمانی رنگ پھرا ہوا تھا اور اس پر

---

[1] ایرانی سال کے پہلے مہینہ کا پہلا دن جو ہمیشہ ۲۱ مارچ کے مطابق ہوتا ہے [2] مجل مخفف ہے مجلو کا اور مجلو تابع مہمل ہے کچلو کا، کچلو اور کوچک کہتے ہیں ننھے، منے کو۔ ہاشمی خاندانی نسبت ہے جو ایرانیوں کیلئے ضروری ہے۔ [3] ایرانی بھجے دار ٹوپی جس میں ماتھے کی طرف انگریزی ٹوپی کیطرح سن شیڈ لگا ہوتا ہے۔ اس ٹوپی کو رضا شاہ پہلوی نے اختیار کیا اس لئے ان کے خاندان کے نام سے مشہور ہوئی یہ ایرانی نوجوانوں کی عام وضع ہے۔ [4] کاشان ایران کا ایک شہر جہاں کے قالین بہترین ہوتے ہیں۔

ہدف اجتہادی سیاح ایران

خوش منظر نقش و نگار بنے تھے۔ مناسب مناسب مقاموں پر ایرانی فن کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں "شاہنامہ[1]" کے مطابق واقعات رزمیہ و عشقیہ کی صورت کشی کی گئی تھی، آتشدان کی کارنس پر بیچ میں آئینہ ادھر ادھر ایک ایک آئینہ، لمپ، لالہ اور گلدان رکھے تھے۔ آتشدان کے طاق میں نرگس کا ایک گچھن گلدستہ رکھا ہوا نوروز کی خبر دے رہا تھا، اس گلدستہ میں ایک خوش رنگ کارڈ گھرا ہوا تھا جس پر نفیس و نازک بیل بوٹے بنے تھے اور سنہرے حرفوں سے لکھا تھا "ہمہ روز تو روز نو روز باد[2]"

میں نے گلدستہ کو مسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے کہا "اس گلدستہ پر ایک رات گذرنے کے بعد بھی کیف باقی ہے"۔

مچل باستی نے گلدستہ کو دیکھا اور جواب میں ایک بے ربط بات کہی "اس گلدستہ میں رات کے دستر خوان[3] پر یہ کارڈ نہ تھا اور جب صبح کو میں یہاں آیا ہوں تو اس وقت بھی نہ تھا"

میں نے اس کا تعجب دور کرنے کیلئے کہا "تمہارے جانے کے بعد کوئی عید ملنے آیا ہوگا، ملاقات نہ ہونے پر اپنی نشانی چھوڑتا گیا"

اس نے گلدستہ سے کارڈ نکالتے ہوئے کہا "تو آنے والے کا نام بھی ضرور ہوگا" اور کارڈ دیکھنے لگا۔

اس نے کارڈ کو پلٹ کے دیکھا، شائد سیدھی طرف نام نہ تھا، اس کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ کچھ لکھا ہوا ہے جس کی تصدیق اس کے چہرہ پر چھا جانے والی سفیدی نے کی مگر اس نے بغیر کچھ کہے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ زنانہ خانہ سے آواز آئی "آمچل[4]"

آواز دلکش اور رسیلی تھی اس کے چہرہ کی سفیدی سرخی سے بدل گئی۔ اور وہ اُٹھ کے اندر چلا گیا۔

اور تھوڑی دیر میں ایک کشتی جرمن سلور کی لئے ہوئے آیا۔ اسے میرے سامنے رکھ کے پھر چلا گیا، اس کشتی میں کئی چھوٹی چھوٹی بلورین تھالیاں تھیں کنول کے پھول کی ایسی ان میں پستے اور آخروٹ کی گری، نمک شکر میں لگ لگ[5] پکی ہوئی بادام کی گری جھلکوں سمیت نمک میں پکے ہوئے کدو کے بیج اور فندق[6] تھے، مچل باستی نے دوسری کشتی اسی طرح کی انہیں "کنول تھالیوں" سے سجی ہوئی لا کے رکھی جس میں ایرانی و فرنگی مٹھائیاں رکھی تھیں۔

اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "یہ نوروز کی ضیافت ہے، تم کو بالکل میری طرح کھانا چاہیئے"

"یعنی انتہائی تکلف کیساتھ"

"نہیں بھئی کھانے میں تو میں کبھی تکلف کیا نہیں کرتا"

"ایسا ہے تو بسم اللہ"

ہم دونوں میوہ مٹھائی کھانے لگے، وہ کھاتا جاتا تھا اور اپنی عادت کے موافق پُرلطف باتیں کرتا جاتا تھا مگر اس دن رنگ ہی اور تھا، بات بات پر مسکرا دیتا تھا، ہنسا پڑتا تھا، میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ خوشی تصنع کی نہیں بلکہ اس کا دل خوش ہے

---

[1] حکیم فردوسی کی مشہور مثنوی جو ایران قدیم کی منظوم تاریخ ہے [2] تمہارے سب دن نوروز ہوں (ترجمہ) [3] ایرانی اپنے نوروز کے دن دستر خوان کرتے ہیں جس پر مٹھائی، میوہ، نرگس کی بھجیا، تلی ہوئی مچھلی اور نرگس کا گلدستہ ضرور ہوتا ہے۔ تحویل آفتاب (در برج حمل) کے وقت پہلے سلامتی سال کی دعا مانگتے ہیں پھر آپس میں عید ملتے ہیں اور میوہ مٹھائی وغیرہ کھاتے کھلاتے ہیں۔ [4] "آ" مخفف ہے آقا کا ایرانی تقریباً ہر ایک نام کیساتھ آقا لکھتے ہیں اور آ بولتے ہیں۔ اردو میں آمچل کا مرادف میاں مچل آتا ہے۔ [5] پاگنا کسی چیز کو نمک یا شکر میں ہلکا ہلکا بھون لینا ہے۔ [6] فندق پہلے حرف کو زبر اور تیسرے پر پیش، دوسرا جزم تھا ساکن، ایک خاکی رنگ کا ایک چھوٹا سا پھل ہوتا ہے گول بیر کی طرح اسکا چھلکا سخت ہوتا ہے جسکو توڑنے سے گری نکلتی ہے، ہندوستان میں یہ پھل صرف دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ (صدف اجتہادی سیاح ایران دھرما)

میں نے مٹھائی کی ڈالی اٹھاتے ہوئے کہا "آپکل! آج میں تم کو بہت خوش پاتا ہوں"

اس نے بادام چباتے ہوئے جواب دیا "! اور میں غمگین کب رہتا ہوں"

میں نے مٹھائی کھاتے ہوئے کہا "ٹھیک! ذرا اپنی روزانہ کی حالت یاد کرو، آج سے پہلے کس دن تم خوش رہتے تھے"

"اس نے لڈو کے بیچ چھیلتے ہوئے کہا" لیکن آج تو عید ہے"

"میں نے مسکرا کے کہا" بات معقول ہے یا ہے وجہ اور ہی کچھ ہو"

وہ مسکرا کے رہ گیا، میں نے پھر کہا" اچھا ایک بات اور بتاؤ!"

اس نے بھی مسکرا کے پوچھا" وہ کیا؟"

میں نے بات چھیڑنا چاہی تھی کہ بارہ کی توپ چل گئی، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور زنانہ میں جاتے ہوئے بولا۔

ابھی ٹھہرو! پہلے کھانا کھا لیں پھر اطمینان سے کہنا"

اس نے اندر سے دسترخوان لا کے بچھایا اس کے بعد کھانا لا لا کے چُننے لگا۔ ایک بڑی قاب میں گھی پڑا خشکہ، ایک پلیٹ میں قیمہ جس میں چنے کی دال پڑی ہوئی، ایک پلیٹ میں آخروٹ کی پسی ہوئی گری کا سالن، مکھن، ایک قدح میں یخنی، ایک پلیٹ میں اوجھے کا کباب، ایک پلیٹ میں پنیر، مولی اور سبزی، ایک میں دوغ، ایک میں سکنجبین کا شربت اور ان دونوں میں لکڑی کے بڑے بڑے چالدار چمچے پڑے ہوئے، دو چار گز گز بھر کی لمبی خمیری روٹیاں اور چند خالی پلیٹیں تھیں۔

ہم نے ابھی پہلا نوالہ توڑا تھا کہ محمود خان منظی محل کے خانوں شان قدامت مآبی میں وارد ہوئے۔ کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا، انہوں نے ڈیوڑھی سے دسترخوان بچھا دیکھ کے کمرہ کا رخ کر دیا۔ میں ان کی صورت دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا، وہ جوتوں سمیت فرش پر آ گئے، صاحب سلامت تو ان کے آتے ہی آتے ختم ہوئی تھی، عید ملنے کی رسم ایک دوسرے کے بوسے لیکے ادا کی گئی اور ریلا مبالغہ پانچ منٹ تک تبادلہ مزاج پرسی کرنے کے بعد کھانا کھانے بیٹھے۔ محمود خان جوتا پہنے ہوئے پالتھی مار کے بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہوا۔

مجھے خود کھانے سے زیادہ انہیں کھاتا دیکھنے میں تفریح ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنی پلیٹ میں خشکہ لیا اس میں مکھن ملایا، کباب پر نمک، کالی مرچ اور خشک ترشی چھڑکی، ایک ٹکڑا توڑ کے خشکہ میں ملایا اور مٹھی سے نوالہ بنا بنا کے انگوٹھے سے منہ میں ٹھیلنے لگے، ہر دو تین نوالوں کے بعد کبھی دوغ کا ایک چمچہ بھر کے پی لیتے تھے کبھی سکنجبین کا، ہر نوالہ کے ساتھ پیاز اور مولی کھاتے جاتے تھے۔ ایک پلیٹ صاف ہوئی پھر خشکہ لیا اسی میں قیمہ ملایا اور روٹی کے نوالوں میں پیاز تو کے نوالے رکھ رکھ کے کھانے لگے۔ قیمہ کے بعد آخروٹ کا سالن لیا اور اسی طرح روٹی کے ساتھ کھاتے رہے۔

ہمارا کھانا ختم ہوا اور دسترخوان اُٹھتے ہی محمود خان کے سامنے تانبے کی ایک چوکور انگیٹھی لا کے رکھ دی گئی جس پر ایک دستہ بنا اور ایک مدک کی نگالی رکھی ہوئی تھی۔ محمود خان نے کمرچین کی جیب سے چھوٹی سی ڈبیہ نکال کے کھولی، اس میں سے بھورے رنگ کی افیون کی بتی نکالی اور ایک ٹکڑا توڑ کے مٹھی میں دبا لیا، پتلے لکڑی کی نگالی کے سرے پر لگے ہوئے چینی کے لٹو کو آگ پر گرم کیا پھر افیون کے ٹکڑے کو اس کے وسطی سوراخ کے پاس چپکا کے آگ پہ نرم کرتے رہے، اس کے بعد صدری کے جیب سے چاقو نکالا

له ایرانیوں نے تکلف کی حد کر دی۔ ۲ے خاص ایرانی کوٹ جو گھٹنوں تک لمبا ہوتا ہے اور اسکی کمر پر چُنٹ پڑی ہوتی ہے یہ قدامت پرستوں کا لباس ہے جو پہلوی ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں۔ (صدف اجتہادی)

سے کھول کے افیون کو الٹنے پلٹنے لگے۔ کبھی چاقو کی نوک سے پھیلایا کبھی اکٹھا کیا جب افیون خوب پک گئی تو پھر اسی سوراخ کے پاس چپکا دیا۔

افیون تیار ہو گئی تو دست[۱] پنے سے ایک بڑی چنگاری اٹھائی اور اسے پھونکتے ہوئے فرمایا:-

"آپ کے سر[۲] کی قسم اور اپنی جان کی قسم یہ اعلٰے حضرت[۳] چاہتے ہیں کہ ہم لوگ افیون پینا چھوڑ دیں، واللہ یہ محال کو ممکن بنانا چاہتے ہیں۔ اپنے باپ کی ارواح[۴] کی قسم ہم افیون چھوڑ کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ کو قسم ہے اپنے جد[۵] کی سچ بتائے کہ جب ہم زندہ نہ رہینگے تو یہ حکومت کس پر کرینگے"

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے جلدی جلدی چنگاری پر دو تین پھونکیں مار کے نگالی کے خالی سرے پر منہ رکھدیا اور افیون پر چنگاری۔ کھڑکے سٹر سٹر کرنے لگے۔

میں منتظر تھا کہ نگالی سے منہ اٹھے تو کچھ کہوں مگر انہوں نے ایک لمبا دم لگانے کے بعد دھوئیں کا ایک بڑا سا بقہ جو چھوڑا تو کمرہ افیون زار بن گیا۔ اور اس کی بدبو سے میرا دماغ چکرانے لگا۔

مجّل ہاشمی نے مجھے ناک بھوں چڑھاتے دیکھ کے کہا "آ چلو! میرے کمرہ میں چلکے بیٹھو!!" میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور محمود خان سے رخصت ہو کے زنان خانہ میں پہنچا، عورتیں اپنے اپنے کمروں میں تھیں اور جو کوئی صحن یا برآمدہ میں تھی بھی تو چھینٹ کی گھریلو چادر[۶] اوڑھے ہوئے، میں صحن کے چمن سے گذرتا ہوا کمرہ میں جا بیٹھا۔

(۲)

مجّل ہاشمی کے کمرہ میں بھی قالینوں کا فرش تھا، خوشنما رنگ و روغن پھرا ہوا تھا، مغربی و مشرقی دیوار دو پسر دو تصویریں آمنے سامنے لگی ہوئی تھیں، ایک میری، ایک مجّل کی، شمالی دیوار میں آمد و رفت کے دروازہ کے اوپر رضا شاہ پہلوی کی تصویر لگی تھی اور جنوبی دیوار میں شیشہ دار پٹوں کی ایک الماری تھی جس میں کتابیں وغیرہ رکھی تھیں الماری کے اوپر ایک خوشنما چوکھٹہ لگا تھا جس میں آبی رنگ کے ریشمی کپڑے پر مناسب مناسب رنگوں کے ریشم سے کڑھا ہوا نہایت خوشنما گلدستہ تھا، اس کے نیچے خوبصورت حرفوں میں "مجّل عفت الملوک منتظمی" کڑھا ہوا تھا۔

فرش پر ادھر ادھر تین چار گاؤ تکئے رکھے ہوئے تھے، سماور پہلے سے روشن تھا اور اس پر کیتلی رکھی ہوئی چار دم کھا رہی تھی، اسکے پاس ہی استکانوں کا صندوقچہ اور چینی کی چھوٹی سی خوبصورت کشتی رکھی تھی، "رزاق[۷] اکمی" کے کارخانہ کی وطنی سگریٹیں اور دیاسلائی تھی، میں نے کشتی میں سے ایک سگریٹ اٹھا کے سلگائی، مجّل نے شیشہ کی گلدانی[۸] بھی میرے پاس بڑھادی۔

میں نے صندوقچہ کھول کے دو استکان نکالے ان میں قند[۹] کے ٹکڑے ڈال کے چاء بنائی، ایک استکان مجّل کی طرف بڑھایا اور اپنے استکان کا قند گھولتے ہوئے گفتگو چھیڑی "ہاں آ مجّل! آج کی خوشی کا تو تم نے پہلو نکال لیا، روزانہ متفکر رہنے کی بھی وجہ بتا سکتے ہو؟"

---

[۱] یہ املا تلفظ کے لحاظ سے ہے [۲] قسم ایرانیوں کی نمایاں خصوصیات میں سے ہے۔ [۳] مراد رضا شاہ پہلوی۔ [۴] ایرانی اس جمع کو واحد کی بجائے بولتے ہیں۔ [۵] مراد رسول اللہؐ، یہ قسم سادات کیلئے مخصوص ہے کیونکہ وہ اولادِ رسول ہیں۔ ایرانیوں نے قسم میں بھی جدت نہ چھوڑی۔ [۶] یہ چادر عورتیں اپنے گھروں میں اوڑھتی ہیں اور اگر ضرورتاً کوئی ایسا شخص گھر میں آ جائے جس سے گہرے مراسم ہوں تو اسی چادر کا پردہ کافی سمجھا جاتا ہے۔ [۷] تہران کا ایک بڑا تاجر جسکی سگریٹیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ یہ سگریٹیں سلائی کی ایسی پتلی اور انکے اندر کاغذ کا پیپ یا ہوتا ہے انکا ایک سرا سنہرا بھی ہوتا ہے۔ ایرانی ہر قسم کی ملکی سگریٹ پیتے ہیں۔ یورپ کی کوئی نہیں پینا۔ (تہران پایہ تخت ایران ہے۔) [۸] سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے برتن کو کہتے ہیں۔ [۹] ایرانی تہذیب ہے کہ مہمان کی چاء سے ضیافت ضرور کرتے ہیں اور چاء میں شکر کے بجائے قند استعمال کرتے ہیں ایرانی کھانے کے بعد بھی چاء پینے کے عادی ہوتے ہیں اور ہمیشہ بغیر دودھ کے چاء پیتے ہیں۔ (صدف جتہادی)

وہ پھر مسکرایا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا "بھائی! حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی ایک معمہ ہے جس سے میں خود آج تک عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ میں اپنے معاملات پر خاموشی سے غور کرتا رہا نہ کبھی کسی سے میں نے ذکر کیا نہ کوئی میری ظاہری حالت سے اندازہ کر سکا۔ میں نے اپنے خود کو اس طرح سنبھالے رکھا کہ میری حالت کا اندازہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ تم پہلے شخص ہو جس نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے، واللہ میں تمکو اپنا دوست سمجھ کے آج سارا واقعہ بتاتا ہوں ممکن ہے تم کوئی مشورہ دے سکو، غور سے سننا۔"

اس نے سگریٹ اٹھا کے سلگائی، میں چائے پینے لگا۔ اس نے اپنی چائے کا قند گھولتے ہوئے کہا "جب کہ میں اپنی تعلیم ختم کر چکا ہوں تو میری خالہ چاہتی ہیں کہ اپنی بیٹی "بلقیس خانم"[1] کی شادی میرے ساتھ کریں۔ یہ لڑکی نیک ہے، خوش مزاج ہے مگر مجھے پسند نہیں، قرآن مجید کی قسم! اس کا بدنوارہ جسم، تھل تھل گوشت، کنتا رنگ، چپٹی ہری ناک، بڑا سا دہانہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پر عینک اور اس سے بڑھ کے ان پڑھ ہونا۔ وہ مجھے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی لیکن خالہ کے احسانات دیکھتے ہوئے انکار کرتے بھی نہیں بنتا"

اس نے چائے کا گھونٹ پی کے کہا "اور میرے خالو کی بھتیجی جو ہے "عفت الملوک"[2] اپنی جان کی قسم ایسی حسین کہ ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں ایک ضرور ہے، نیک مزاج، ہنس مکھ، کام کاج، پڑھی لکھی، مدرسۂ ناموس کے آخری سال میں تعلیم پا رہی ہے۔ اور مجھ سے فرانسیسی الگ پڑھتی ہے۔ اس کا شہابی رنگ، پتلا پتلا نقشہ، متناسب اعضا، بوٹا سا قد، دلکش رفتار، پیاری پیاری باتیں میرے دل پر ایسا اثر جمائے ہیں کہ جو بخدا کسی وقت بھولتی نہیں۔ ہنر مند ایسی کہ اس کی دستکاری کا ادنیٰ نمونہ یہ گلدستہ ہے، جو الماری کے اوپر لگا ہوا ہے، علاوہ اس کے میری طرح ملوک خانم کے بھی نہ باپ ہے نہ ماں صرف ایک دادی ہیں جو اس کا بار اٹھائے ہیں، آغا محمود خان متمول ہو کے بھی نہیں پوچھتے، بلقیس خانم کو تو کوئی خوبی نہ ہونے پر بھی اپنے باپ کی بدولت مجھ سے اچھا شوہر ملجائے گا۔ مگر خدا کی قسم ملوک خانم کو ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی اچھا شوہر ملنا مشکل ہے کیونکہ چچا کو بھتیجی کی پرواہ نہیں، رہیں دادی تو دہ بھی عورت ذات کیا کر سکتی ہیں"

میں سنتا رہا اور چائے پیتا رہا، وہ بھی بیچ بیچ میں چائے پیتا گیا اور کہتا گیا "تمہاری جان عزیز کی قسم مجھ سے دونوں کو محبت ہے گو ملوک خانم نے اپنی محبت کو کبھی ظاہر ہونے نہ دیا، پھر بھی میں خوب سمجھتا ہوں کہ مجھے چاہتی ہے، وہ روزانہ مجھ سے پڑھنے آتی ہے اور اسی کمرے میں دو دو گھنٹے میرے پاس تنہا بیٹھی رہتی ہے، مگر علاوہ سبق کے واللہ اور کوئی بات نہیں کرتی۔ صرف اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں ہیں جو اپنی غلط اندازی میں نہ معلوم کیا سے کیا کہہ جاتی ہیں، اور بلقیس خانم اپنی محبت کا مختلف طریقوں سے اظہار کیا کرتی ہے، رسول اللہ کی قسم وہ مجھ سے باتیں کرنے میں بہت زیادہ خوش رہتی ہے، اور اکثر مجھی سے باتیں کرتی رہتی ہے بلکہ باتوں باتوں میں ایسے ہوائی فقرے بول جاتی ہے جو محبت کے محرک ہوں۔

اس نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ملوک خانم اپنی بہن کی ثروت کا جواب نہیں دے سکتی۔ تمہارے سر کی قسم بلقیس خانم ہر وقت بنی ٹھنی رہنے کے علاوہ بازار سے میری ضرورت کی چیزیں بھی لا لا کے میری محبت حاصل کرنا چاہتی ہے مگر ملوک خانم کی سادگی و خاموشی میں اور ہی کشش ہے۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ جو بلقیس خانم کی طرح مجھے اپنا ممنون محبت بنائے لیکن مجھ پر اس کی پوشیدہ خدمت کا ان آشکار احسانوں سے زائد اثر ہے اپنے باپ کی ارواح قسم"

[1] اردو میں جس محل پر بیگم اور صاحبہ بولتے ہیں فارسی میں اس محل پر خانم بولتے ہیں [2] عفت الملوک کا عرف۔ (ہدف)

کہا "میں اتنا لاابالی واقع ہوا ہوں کہ جب اپنے کمرہ میں آتا ہوں تو کپڑے اتار کر یونہی ڈال دیتا ہوں، کتابیں الماری سے نکال کے پڑھتا ہوں اور اسی طرح کوئی کھلی کوئی بند ادھر ادھر چھوڑ دیتا ہوں، لکھنے بیٹھتا ہوں، لکھتا جاتا ہوں اور جو ورق خراب ہو جاتا ہے اسے پھاڑ کے یونہی فرش پر پھینک دیتا ہوں، قلمدان کہیں چھوڑتا ہوں کاغذ کہیں اور دوسرے کپڑے پہن کے باہر چل دیتا ہوں، جب واپس آتا ہوں تو یقین مانئے کمرہ کو ٹھیک پاتا ہوں، بالکل صاف، کپڑے کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے، تکئے قرینہ سے لگے ہوئے کتابیں وغیرہ اپنی اپنی جگہ پر

میرا استکان بھی خالی ہوگیا تھا، میں نے پھر چاے بنائی، اس نے قند گھولنے کے لئے چمچہ اٹھاتے ہوئے کہا "قرآن کی قسم میں سمجھتا تھا کہ یہ کام گھر کی ماما کرتی ہوگی لیکن ایک مرتبہ میں اسی طرح کمرہ کو گڑبڑ چھوڑ کے چلا گیا اور تھوڑی دیر میں سگریٹ کیس لینے کے لئے پھر واپس آیا تو دیکھا کہ ملوک خانم کمرہ کو درست کر رہی ہے۔ اس نے آہٹ پر مڑ کے دیکھا، پھر بت کعبہ اسی نگاہ سے جو میرے لئے مخصوص تھی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی، میں نے دروازہ میں کھڑے کھڑے کہا "زحمت نہ ہو تو سگریٹ کیس اٹھا دو" اس نے بغیر جواب دئے سگریٹ کیس اٹھایا، کھول کے دیکھا اس میں سگریٹیں نہ تھیں، الماری سے سگریٹیں نکال کے رکھیں، دیا سلائی کی ڈبیا کو ہلا کے دیکھا وہ بھری ہوئی تھی دونوں چیزیں مجھے لا کے دیدیں، ابھی اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں"

میں چائے پیتے پیتے مسکرایا، اس نے بھی چائے کا گھونٹ پی کے کہا "ہاں ہاں، دیکھنے میں اس کا یہ کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن بعض اوقات معمولی معمولی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں، اپنے جد کی قسم ملوک خانم کی جگہ پر بلقیس خانم ہوتی، تو وہ میرے سگریٹ کیس مانگنے پر یونہی اٹھا دیتی اور میں بھی بغیر دیکھے جیب میں رکھ لیتا لیکن وقت پر سگریٹ نہ نکلتی تو تکلیف ہوتی اور میرا واپس آکے سگریٹ کیس بھجانا بیکار جاتا۔ خدائے پاک کی قسم یہ ملوک خانم کی سمجھداری اور میری تکلیف کے احساس کی دلیل ہے کہ اس نے میری ایک بات پر کئی باتوں کو ملحوظ رکھا"

اس نے چاے پیتے ہوئے کہا "اور اسی وقت سے گذشتہ دنوں کی روداد بھی پیش نظر ہوگئی۔ مجھے یاد آگیا کہ میرا کمرہ انہیں اوقات میں درست رہتا ہے، جن میں ملوک خانم گھر میں رہتی ہے، وہ جس وقت مدرسہ میں ہوتی ہے اور میں کمرہ کو تلپٹ کر جاؤں تو یونہی پڑا رہتا ہے، تمہیں میرے سر کی قسم سچ کہنا کہ اس خاموشی میں کتنی محبت جھلکتی ہے"

میں پھر مسکرایا اور چاے ختم کرتے ہوئے کہا "بہت"

اس نے اپنے ہاتھ کی نہایت عمدہ اور خوبصورت انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا "دیکھو یہ انگوٹھی ملوک خانم کی ہے اور تمہارے جد کی قسم بڑی عقلمندی سے مجھ تک پہنچائی گئی ہے، ملوک خانم مدرسہ جانے کیلئے برابر مجھ سے وقت پوچھا کرتی تھی، میں نے ایک دن اس کو پڑھاتے میں کہا کہ "تم کو مدرسہ کے وجہ سے وقت معلوم کرنا پڑتا ہے، میرے پاس دو گھڑیاں ہیں ایک سونے کی ایک چاندی کی ان میں سے جو پسند ہو لیلو" وہ خاموش رہی، میں نے دونوں گھڑیاں اس کے پاس رکھ دیں، جب وہ پڑھکے جانے لگی تو گھڑیاں چھوڑتی گئی، میں نے ٹوکا بھی مگر اس نے انہیں مخصوص نگاہوں سے دیکھا اور چل دی، واللہ مجھے رنج ہوا مگر وقتی کیونکہ میں فوراً سمجھ گیا کہ اس طرح گھڑی لے لینا اس کے لئے مناسب نہ تھا۔

اس نے خالی استکان رکھتے ہوئے کہا "اس واقعہ کے دوسرے دن جبکہ میں خالہ کے پاس بیٹھا تھا اور بھی گھر کی عورتیں بیٹھی تھیں بلقیس خانم وغیرہ، اس وقت ملوک خانم کی دادی میرے پاس یہ انگوٹھی لئے ہوئے آئیں اور کہا ۔۔۔

"بیٹیا! ملوک کو مدرسہ کی وجہ سے گھڑی کی ضرورت رہتی ہے اور اسی کی قسم میرے پاس روپیہ نہیں، وہ ہے کہ ضد ین کر کر کے میری جان لئے لیتی ہے۔ تم اس انگوٹھی کو بیچ کے اس کی قیمت میں جیسی گھڑی ملے، لا دو۔"

میں نے انگوٹھی دیکھ کے کہا "یہ تو بہت اچھی ہے ایک گھڑی کے لئے اسے ضائع نہ کیجئے۔"

انہوں نے کہا" میں نے بھی یہی سمجھایا مگر وہ مانتی ہی نہیں"

میں نے کہا" آپ ان سے کہئے کہ یہ انگوٹھی تم پہنے رہو، میرے پاس دو گھڑیاں ہیں، میں ان میں سے ایک ان کو دے دونگا"

انہوں نے ملوک خانم سے پوچھ کے کہا" وہ اس پر بھی تیار نہیں"

میں نے کہا" اچھا وہ گھڑی سے انگوٹھی بدل لیں یہ تو ہو سکتا ہے؟"

انہوں نے ملوک خانم سے پوچھ کے کہا" اس پر راضی ہے اگر تمہاری خالہ کو منظور ہو"

خالہ نے کہا" گھڑی مجل کی ہے اور وہ خود بدلنا چاہتے ہیں اس میں میرا کیا نقصان ہے"

خالہ سے میں بھی کھٹکتا تھا مگر انہوں نے انگوٹھی قیمتی دیکھ کے فوراً رائے دیدی اور گھڑی سے انگوٹھی بدلی گئی، بلقیس خانم کا چہرہ اتر گیا مگر وہ خاموش رہی"

کہا" اس تبادلہ کے بعد ملوک خانم پڑھنے آئی تو میری سونے کی گھڑی اس کی گوری کلائی پر بندھی ہوئی تھی، اپنی جان کی قسم اس نے پہلے مجھے دیکھا پھر میری دونگلی[1] میں اپنی انگوٹھی پر نظر ڈالی اس کے بعد اپنی کلائی پر میری گھڑی کو دیکھا اور مسکرائی تمہاری جان کی قسم یہ پہلا موقع تھا جو وہ تنہائی میں میرے سامنے مسکرائی لیکن اس پہلی مسکراہٹ میں وہ سب کچھ کہہ گئی جو زبان سے کبھی نہ کہتی۔"

کہا" رسول اللہ کی قسم ملوک خانم نہ تو میری محبت خریدنا چاہتی ہے اور نہ مجھے اپنے طرز عمل سے ممنون بنانا چاہتی ہے لیکن پھر بھی معلوم اس میں کونسی قوت ہے جو میرے دل کو تسخیر کئے لیتی ہے واللہ بلقیس خانم اس کے بالکل برعکس ہے"

اس نے الماری سے دو تین کتابیں نکالیں اور ایک کتاب کھول کے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا" یہ شعر جو اس کتاب پر لکھا ہے، پڑھو[2]

بیا بردم از یں ولایت من و تو
تو دست مرا بگیر و من دامن تو

اس نے دو ایک کتابیں اور دکھائیں، ان پر بھی یہی شعر لکھا تھا اور سب کی ایک ہی تحریر تھی جیسے کوئی نو سکھیا لکھے

میں نے کہا" اس میں کیا بات ہے"

اس نے جواب دیا" ایک زمانہ سے یہ شعر میری مزید فکر کا باعث ہو گیا ہے اس لئے کہ ملوک خانم کا یہ خط نہیں۔ بلقیس خانم کو لکھنا نہیں آتا، گھر میں تیسرا کوئی شخص ایسا نہیں جس پر شبہ کیا جا سکے"

اس نے تین کارڈ نکالے اور مجھے دکھاتے ہوئے کہا

[1] اردو میں صرف دو انگلیوں کا نام ہے اور ایک انگلی کیلئے تو کوئی خاص امتیاز بھی نہیں اس لئے میں نے تین انگلیوں کے نام حسب ترتیب ذیل وضع کئے ہیں تاکہ وقت بیان جاتی رہے (۱) چھنگلیا (۲) دونگلی (۳) تنگلی (۴) چنگلی (۵) انگوٹھا" ارباب علم اگر ان ناموں کیطرف متوجہ ہوں تو میں وجہ تسمیہ بھی بتا سکتا ہوں۔ [2] ترجمہ شعر) آؤ ہم تم اس شہر سے چلے چلیں۔ تم ہمارا ہاتھ تھام لو اور ہم تمہارا دامن پکڑ لیں۔ میں نے محاورہ کے لحاظ سے ترجمہ میں صیغوں اور ضمیروں کے واحد و جمع کا لحاظ نہیں رکھا۔ اس شعر کو مطلع نہ سمجھا جائے ورنہ قافیہ غلط ہو جائیگا (حدف حبہاری سیاح ایران عربی)

دیکھو! یہ عید کارڈ ہے، وہی جو گلدستہ میں لگا ہوا تھا، اس کی پشت پر بھی یہی شعر لکھا ہے، خط بھی یہی ہے، ان میں سے ایک تو مجھے ٹرام پر ملا تھا، واقعہ تو بہت دن کا ہے مگر مجھے یاد ہے کہ ٹرام میں جس سیٹ پر میں بیٹھا تھا اس کے آگے کی سیٹ پر [illegible] تین بیٹھی تھیں اور یقیناً انہیں میں سے کسی نے میرے آگے [illegible] پھینک دیا ہوگا مگر بخدا میں نے پھینکتے کسی کو نہ دیکھا اور نہ کسی کو پہچان سکا کیونکہ پہلے سے اس کا گمان ہی نہ تھا"

کہا "دوسرا کارڈ حلوائی کی دکان میں ملا تھا، میں ایک [illegible] بازار میں سب سے بڑی جو مٹھائی کی دوکان ہے اس میں گیا اور دو تین قسم کی مٹھائیاں پسند کی تھیں کہ چند عورتیں دوکان میں آئیں اور چاہا کہ پہلے خود مٹھائی لے لیں، میں نے ان کی عجلت دیکھ کے حلوائی سے کہا کہ "پہلے انہیں کو دے دو" حلوائی نے مٹھائی دی اور وہ چلی گئیں، ان کے جاتے ہی میں نے دیکھا کہ مٹھائی کے میز کے شیشہ پر یہ کارڈ پڑا ہوا ہے، اسی طرف جدھر وہ عورتیں کھڑی تھیں، تمہارے سر کی قسم ان عورتوں کو بھی اپنی بے توجہی سے پہچان نہ سکا لیکن جس کے پاس بھی میرے کارڈ ہیں اس کا دست رس میری چیزوں تک ہے ضرور"

اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "یہ باتیں ہیں جو مجھے ہمیشہ متفکر رکھتی ہیں اور جس پر میں خلاف معمول خوش خوش دکھائی دے رہا ہوں وہ آج رات کا واقعہ ہے، واللہ میری زندگی کا پہلا واقعہ اور بالکل نیا"

وہ سگریٹ سلگانے لگا میں نے خیال کیا کہ سگریٹ سلگا کے بیان کریگا، مگر وہ گاؤ پر سر رکھ کے لیٹ گیا اور سگریٹ پیتا رہا

میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا "کیا رات کا واقعہ بیان کرنا مناسب نہیں" اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا "ہے تو ایسا ہی مگر میں تم سے یہ بھی کہدونگا" اور اٹھ بیٹھا۔

ہاتھ کی سگریٹ گلدانی میں رکھ دی اور کہنے لگا "کوئی گیارہ بجے رات کو نوروز کا دستر خوان اٹھایا گیا۔ سب اپنے اپنے کمرہ میں سونے چلے گئے، میں بھی اپنے کمرہ میں آ کے لیٹ رہا، دیر تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا مگر نیند نہ آئی۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور الماری سے ایک ناول نکال کے دیکھنے لگا۔ ابھی دو تین صفحے دیکھے ہونگے کہ کمرہ کا دروازہ کھلتا معلوم ہوا۔ میں کتاب سے نظر اٹھا کے دیکھنے لگا، دروازہ کا ایک پٹ چپکے چپکے کھلا اور نصف شب کو آفتاب[2] برج حمل میں داخل ہوگیا، میں نے دو ایک دفعہ آنکھیں جھپکا کے دیکھا تو دروازہ بند اور ملوک خانم چوکھٹ سے پیٹھ لگائے کھڑی ہے،

کہا "تمہارے سر کی قسم وہ اسوقت گلاب بنی ہوئی تھی مجسم گلاب، جس طرح اس کے چہرہ اور جسم کا رنگ گلابی تھا اسیطرح سر میں بندھے ہوئے ریشمی[3] رومال سے لیکے ریشمی سایہ اور جرابوں تک کا رنگ گلابی تھا، اب سب رنگوں نے مل جل کے وہ مناسبت پیدا کر لی تھی جو اس کے سینہ پر لگے ہوئے گلاب میں تھی"

کہا "اپنی جان کی قسم وہ نوروز تھی خاص میرا نوروز، وہ نہ آجاتی تو میری عید نہ ہوتی، میں ہرگز آج نوروز نہ مناتا، یہ میرے جسم پر جو نیا جوڑا تم دیکھ رہے ہو اسی کی بدولت ہے، اس وقت جو میرے دل کی حالت ہوئی بخدا میرے بیان سے باہر ہے، اتنا بتا سکتا ہوں کہ زور زور سے دھڑک رہا تھا"

---

[1] تہران کا سب سے بڑا بازار۔ [2] آفتاب سے ملوک خانم اور برج حمل سے کمرہ کا استعارہ، حمل آفتاب کے بارہ برجوں میں سے ایک برج ہے۔ جسوقت آفتاب اپنا سال بھر کا دورہ تمام کر کے اس برج میں داخل ہوتا ہے اسی وقت سے نوروز شروع ہو جاتا ہے [3] ایران و عرب کی عورتیں ایک بڑے رومال کو تکونا کر کے سر میں باندھتی ہیں۔ جسے فارسی میں "چارقطعہ" اور عربی میں "خمار" کہتے ہیں اب یہ وضع متروک ہوتی جاتی ہے۔

[4] موزے۔

(بدقت اجتہادی سیاح ایران و عرب)

کہا "اس سے پہلے ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا اس نے" میں نے گھبرا کے پوچھا "کیوں کیا بات ہے ملوک! تم اس وقت کہاں آئی ہو"

اس نے کہا "کچھ نہیں۔ یونہی چلی آئی تھی"

میں نے کہا "آؤ! سر آنکھوں پر، اس دن کی امید کب تھی"

"وہ بڑھی اور قدم بڑھاتے ہی اس کے چہرہ پر میری آنکھیں جم گئیں، نصف سے کم کھلا ہوا سینہ[1] اور بازوؤں تک کھلے ہوئے ہاتھوں پر برقی روشنی کی چھوٹ پڑی، وہ بھی چہرہ کی رشنے لگے، بال کے لٹکتے ہوئے سرے گیسوؤں کیساتھ دونوں شانوں پر لہرائے، گھٹنوں سے کچھ نیچے تک پھیلے ہوئے سایہ کے دامن میں آہستہ خرامی سے موجیں اٹھیں اور وہ میرے سامنے آ بیٹھیں، اللہ اس وقت جو میرے دل پر گذرنا تھی گذر گئی، اب مجھ میں بات کرنے کا یارا نہ تھا وہ مجھے دیکھ ہی تھی میں اٹھے سے اور تمہاری جان کی قسم محبت کی بجلیاں آنکھوں ہی آنکھوں دل پر گر رہی تھیں، آخر وہی بولی" میں صرف اتنا پوچھنے آئی ہوں کہ آج تم نے کپڑے کیوں نہیں بدلے[2] کیا کوئی ملال ہے یا نیا لباس نہیں ہے"

اپنی جان کی قسم مجھ پر اس کے اس احساس کا خاص اثر ہوا" اور میں نے کہا "کپڑے تو موجود ہیں مگر جب دل خوش نہ ہو تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا"

"آخر کیوں دل خوش نہیں ہے"

"یہ نہ پوچھو، اس کا تدارک تمہارے اختیار میں نہیں"

"پھر کس کے اختیار میں ہے"

"کسی کے بھی نہیں"

"ایسا تو ہو نہیں سکتا"

"ایسا ہی ہے"

"خیر ہو گا مگر تم مجھے بتا دو"

"حکم دیتی ہو تو سنو! قسم ہے تمہاری کہ خاک پاکی میں چاہتا ہوں کہ تم سے شادی کر دوں، اور خالہ چاہتی ہیں کہ اپنی بیٹی سی شادی کریں۔ اب نہ تو مجھے بھی مرضی کے خلاف کرتے بنتی ہے اور نہ خالہ سے انکار کرتے بنتی ہے"

"تمہیں اپنی خالہ کا زیادہ خیال کرنا چاہئے ان کا تم پر حق ہے اور بلقیس خانم بھی مجھ سے ہر طرح بہتر ہیں"

"مگر میں تمہاری محبت کو اپنے دل سے کیونکر نکال دوں"

"اس نے نظر نیچی کرلی اور کوئی جواب نہ دیا۔

"بولو اب کیوں چپ ہو!!"

"میں اس کا جواب ہی کیا دوں"

"جو کچھ سمجھ میں آتا ہو"

"یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مجھے بھلا دو"

"تمہیں بھلا دوں کہ اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ لوں"

"خدا نہ کرے، یہ کیسی باتیں کرتے ہو"

"تم ہی تو کہلواتی ہو"

"میں نے تو جو بات اپنے نزدیک تمہارے حق میں بہتر سمجھی بتا دی، تمہیں ناپسند ہے تو خود سوچو"

"ہاں میں خود سوچ لوں گا۔ اگر تم میری محبت قبول کرو"

اس نے کوئی جواب تو دیا نہیں قالین پر چھنگلی سے لکیریں بنانے لگی۔

"ملوک! تمہیں میری جان کی قسم ٹالو نہیں!! آج میری آئندہ زندگی کا فیصلہ تمہارے جواب پر ہے"

اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اٹھا کے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں"

---

[1] آجکل ایرانی عورتوں کا یہی لباس ہے۔ [2] ایرانی لڑکیاں اپنی شادی پر رائے زنی کرنے میں آزاد ہیں۔ [3] ہاتھ کے پاس کی انگلی، مسلمان اس کو کلمہ کی انگلی کہتے ہیں۔ تفریح سابق میں بیان ہو چکی۔ (ہدیٰ اجتہادی)

"جو تمہارے دل میں ہو وہ صاف صاف بتا دو، وقت و مصلحت کا خیال میرے حق میں زہر ہوگا"

دیکھو مچل، خدا کی قسم تم جو کچھ مجھ سے کہلوانا چاہتے ہو اس میں تمہاری بھلائی نہیں"

"نہو، مگر کہو تم وہی جو واقعہ ہے"

واقعہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہی دل سے اندازہ کر لو" ۔

"یعنی تم کو بھی میری محبت ہے"

ملوک نے گردن جھکالی، جسطرح ایسے موقع پر جھکا لی جاتی ہے، میں نے خوشی میں گلے لگا لینے کا ارادہ کیا اور رہ گیا، اس نے گردن جھکائے جھکائے کہا اب تو کپڑے بدلو گے؟"

"ہاں ہاں، مگر تم عید بھی ملو گی؟"

"کہیں مرد و عورت میں بھی عید ملی جاتی ہے؟"

"میں قاعدہ قانون تو جانتا نہیں، تم کو کپڑے بدلوانا ہے تو عید بھی ملنا ہوگی"

"یہ تو بیکار کی ضد ہے"

"جو کچھ بھی ہو"

ملوک خانم نے کوئی جواب نہ دیا، میں نے پیٹی سے جوڑا نکال کے پہننا شروع کیا اور وہ پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی، جب میں کوٹ بھی پہن چکا تو وہ کھڑی ہوئی اور اپنے سینہ پر سے گلاب نکال کے میرے کوٹ کے کالر میں لگا دیا، خاموشی کی محبت نمائی نے جذبات انگیزی کی، ابھی اس کے ہاتھ میرے سینہ پر سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ میں نے عید ملی، میرے کالر کے گلاب کی پنکھڑیاں بکھر گئیں اس کے چہرہ پر ہلکا ہلکا پسینہ آگیا۔ اور آنکھیں بند ہو گئیں ۔ وہ عید ملنے کے بعد ہی گردن جھکائے چلی گئی، اتنی شرما گئی تھی،۔

کہا" ایسی حالت میں کیسے ملوک خانم سے محبت نکروں، واللہ اس کو میرا خیال ہے، میری خوشی و رنج کا احساس ہے مگر وہ اپنے دل میں لئے رہتی ہے، بلقیس خانم میں قرآن کی قسم یہ بات نہیں، میں جانتا ہوں کہ ملوک خانم سے شادی کرنا اپنے تمام اعزاء سے بغاوت کرنا ہے، اور بلقیس خانم سے شادی کرنا میری آئندہ ترقیوں کا باعث ہے مگر میں اپنے دل کو کیا کروں، خدا کیلئے تم ہی کچھ بتاؤ"۔

میں نے کہا" سنو آمچل: میں نے لوان واقعات سے یہ سمجھا ہے کہ اس شعر میں ملوک خانم ہی نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، چاہے وہ کسی ہجولی[1] سے لکھوالیا ہو یا خط لگا کے خود لکھا ہو، تمہیں رات ہی کو یہ معمہ حل کر لینا تھا یا اب پوچھ لینا، یقین ہے کہ اتنی بے تکلفی کے بعد بتا دینے میں کوئی عذر نہ ہوگا"

اس نے کہا" خیر میں پوچھ لونگا لیکن تم بھی اپنے خیال کی کوئی وجہ بیان کر سکتے ہو"

میں نے کہا" ہاں، ایک تو یہ کہ ملوک خانم یہاں آتے رہنے کی وجہ سے تمہاری چیزوں پر آسانی سے تصرف حاصل کر سکتی ہیں"

اس نے بات کاٹ کے کہا" یہاں آنے کو تو بلقیس خانم بھی آتی ہیں"

میں نے کہا" دوسری وجہ میں اس کا جواب بھی ہے اور وہ یہ کہ بلقیس خانم کو اطمنان ہے کہ تم ہی سے شادی ہوگی حالانکہ انکو تم سے کوئی خاص محبت نہیں بلکہ وہ صرف تمہیں اپنے لئے ایک اچھا شوہر سمجھتی ہے اور ملوک خانم کو باوجود محبت کے

---

[1] ہجولی اور سہیلی، ان لفظوں کی معنویت میں تھوڑا تھوڑا سا فرق ہے لیکن آجکل کے اہل قلم دونوں لفظوں کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ہجولی وہ دوست عورت جو سن میں برابر ہو، سہیلی وہ ہم عمر عورت جو بطور دوستی ملازم ہو۔ (عدت اجتہادی)

اس کی امید بھی نہیں"

"پھر ملوک خانم نے اپنے خلاف رائے کیوں دی؟"

اسلئے کہ وہ اس میں تمہارا فائدہ سمجھتی ہیں جو پاک اور سچی محبت کی دلیل ہے"

"اچھا تو اب تمہاری کیا رائے ہے"

"رائے کو جو پوچھتے ہو تو وہی ہے جو ملوک خانم کی"

"مگر تمہاری جان کی قسم اس کو تو میرا دل گوارا نہیں کرتا"

تو پھر ملوک خانم جس طرح تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہیں وہی صورت اختیار کرو

"ہاں پھر اسکے سوا کوئی چارہ نہیں"

سارا دن انہیں باتوں میں گذر گیا رات ہونے لگی تو میں نے اجازت چاہی مچل بانتی کا تو اصرار تھا کہ شام کا کھانا بھی کھا کے جاؤں لیکن میں عذر کر کے چلا آیا۔

—— ۲ ——

نوروز کے بعد سے بارہ دن تک مچل بانتی سے ملاقات نہ ہوئی، نہ وہی آیا اور نہ میرا ہی جانا ہوا میری طرح احباب سے عید ملنے اور نوروز کی دعوتوں میں مصروف رہا ہوگا، تیرھویں دن ۱۰ بجے صبح کو میرے یہاں گھبرایا ہوا آیا اور اسی گھبراہٹ میں ایک چھوٹا سا لفافہ مجھے دیکے کہنے لگا:۔

آج "سیزدہ عید"[1] ہے۔ سب کے سب شہر کے باہر سبزہ دیکھنے گئے ہیں تم یہ ملوک کو وہاں جا کے دیدو"

وہ اتنا رہا سا تھا کہ بات بات پر جیسے رو دینا ہو

میں نے کہا "اور تم"

"مجھے نہ پوچھو"

"کیوں"

"یوں ہی"

"کچھ تو بتاؤ، آخر آج تمہاری یہ حالت کیا ہے"

بات یہ ہے کہ میں سوائے ملوک کے کسی سے شادی نہیں کرونگا، اپنے باپ کی قسم کسی اور سے شادی نہیں کرونگا اور خالہ نے عید رمضان اپنی بیٹی سے شادی کرنے کی فکر کر دی ہے"

"پھر ملوک خانم کیا کہتی ہیں"

"افسوس، نوروز کے بعد سے نہ ملوک میرے کمرہ میں آئی نہیں اور تنہائی میں ملاقات ہوئی"

"اچھا تو اسوقت گھبرائے ہوئے کہاں جا رہے ہو"؟

"طفلس[2] کسی سے بتانا نہیں، نہیں میری جان کی قسم"

"ہائیں، اتنی جلدی"

"ہاں اور کیا، عید اب کون دور ہے، چار دن میں رمضان ختم ہو رہا ہے"

"پھر بھی چندروز ٹھیرکے مشورہ تو کر لو"

"اب تو میں طے کر چکا"

"لیکن طفلس جانے سے کیا ہوگا"

"اس [illegible] سے چھوٹ جاؤنگا"

"مگر وہاں ملوک خانم نہیں ہونگی"

"تو بلقیس خانم بھی نہیں ہونگی"

"مچل! غلطی کر رہے ہو!"

"کچھ بھی ہو"

"اچھا ذرا دیر تو ٹھیرو!"

"ذرا بھی نہیں"

---

[1] ایرانیوں کا جشن سال نو۔ عید نوروز سے بارہ دن تک ایرانی آپس میں عید ملتے ہیں اور دعوتیں کرتے ہیں۔ تیرھویں دن شہر سے باہر سبزہ زار میں جا کے جشن بہار مناتے ہیں۔ جاڑے کی شدید برفباری سے ایران میں وحشتناک خزاں کا دور دورہ ہوتا ہے، مارچ کے مہینہ سے گل و سبزہ نکلے لگتا ہے، اسلئے بہار کی خوشی میں یہ جشن ۱۳ فروردین مطابق ۲ اپریل کو منایا جاتا ہے۔ [2] طفلس سرحد ایران سے قریب روس کا ایک تجارتی شہر جو ایک زمانہ میں ایرانیوں کا تھا اسی سے یہاں ایرانی آبادی زائد ہے۔

"کیوں؟"

"موٹر[1] تیار ہے"

مجل ہاشمی تنہا پیدل روانہ ہوا اور میں اس کے ساتھ ساتھ راستہ بھر سمجھاتا گیا مگر اس نے ایک نہ مانی، موٹر خانہ میں پہنچا تو واقعی وہاں موٹر تیار کھڑی صرف مجل کا انتظار تھا، وہ مجھ سے رخصت ہو کے موٹر میں جا بیٹھا اس کے بیٹھتے ہی موٹر روانہ ہوئی اور میں افسوس کرتا رہ گیا۔

میں دیر تک وہیں کھڑا رہا، مجھے مجل کے اس طرح چلے جانے کا بڑا رنج ہوا [illegible] انقلاب سے ایسا ست ہو گیا کہ [illegible] مدت تک یونہی کھڑا رہتا [illegible] دروازہ نمبر [illegible] [illegible] منایا جا رہا تھا [illegible] [illegible] جو [illegible] لوک خانم کو ڈھونڈا مگر [illegible] ایک نشان کی [illegible] ملوک خانم کو تلاش کر لینا میرے لئے مشکل تھا، مجبوراً اس دن واپس آیا۔

دوسرے دن مدرسہ ناموس گیا اور وہاں کی خادمہ ملوک خانم کے پاس اپنا (قاف) کارڈ بھجوایا، وہ فوراً دروازہ پر آ پہنچی۔

میں نے سلام کیا، اس نے بھی جواب میں "سلام علیکم" کہنے کے بعد پوچھا "آپ مجل کی کوئی خبر ہے؟"

"میں نے کہا انہیں کا خط ہے"

اس نے بڑے اشتیاق سے لفافہ لے کے کھولا اور خط پڑھنے لگی وہ پڑھتے پڑھتے کانپ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ لیجئے آپ اسے اپنے ہی پاس رکھئے"

میں نے خط اس کے ہاتھ سے لیتے وقت دیکھا کہ اس کے چہرہ کی رو بافتہ نقاب میں سے دو آنسو ڈھلک کے ریشمی سیاہ چادر پر گرے، اس نے رکتی ہوئی آواز میں پھر کہا "آپ کے پاس کوئی آ جائے تو [illegible]"

میں نے کہا "صبح سے دوپہر تک انگریزی سفارت میں رہتا ہوں"

اس نے کہا "تو کل کسی آنے والے کے منتظر رہئے گا، خدا حافظ"

میں نے بھی "خدا حافظ" کہا، وہ واپس گئی، میں مجل کا خط [illegible] ہوا گھر چلا آیا

(۴)

تقریباً ۹ بجے دن کا وقت ہوگا، میں اپنے بنگلے میں بیٹھا ہوا کتاب دیکھ رہا تھا کہ کان میں "سلام علیکم" کی صدا آئی، آواز پہچانی ہوئی تھی میں نے بھی جواب سلام دیا اور تشریف لائیے کہتا ہوا تعظیم کو کھڑا ہو گیا، ملوک خانم کمرہ میں آئی، میں نے مزاج پوچھا اس نے بھی پریشانی لیساتھ جواب دیتے ہوئے مزاج پوچھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں جواب دیتا ہوا دوسری کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ اس نے کہا "گھر بھر میں مجل کے غائب ہو جانے سے کہرام مچا ہوا ہے، سارا تہران چھان مارا گیا کہیں پتہ نہیں چلا، میں بتا نہیں سکتی بچی کو اطمنان

---

[1] [illegible] سے چند برس پہلے ایران میں ریل نہ تھی اور بڑے سے بڑا سفر موٹر سے ہوتا تھا۔ [2] تہران کی شہر پناہ کا ایک پھاٹک [3] ایرانی سلام جواب سلام ایک ہی ہے صرف کمس وکم مرتبہ کے جواب میں "علیک السلام" کہتے ہیں۔ [4] جبتک تمدن پوری طرح نہیں بدلا تھا ایرانی عورتیں کی نقابیں بالوں کی بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ [5] ایرانی عورتیں برقعہ کا سیاہ چادر اوڑھ کے گھر سے نکلتی تھی جو ریشمی بھی ہوتی تھی اور سوتی بھی یہ آگے سے گون معلوم ہوتی ہے اور اسکی نقاب الگ سے ہوتی ہے۔ [6] اس کمرہ میں فرنیچر لگا ہوا تھا۔ (ہدف اجتہادی سیاح ایران وعرب)

کیونکر ہو"

"میں نے کہا" معاملہ تو ٹیڑھا ضرور ہے۔"

"اور ٹھیک ٹھیک تو مجھے بھی نہیں معلوم، آپ کیا جانتے ہوں"

"آنچل نے تو آپ کو صاف صاف لکھ دیا تھا"

"مجھے تو یاد نہیں پڑتا شاید اس وقت اچھی طرح میری سمجھ میں نہ آیا ہو آپ بتا سکتے"

میں نے جواب میں خط نکال کے پڑھوایا۔

"عزیزہ ملوک،

[illegible]

[illegible] تم میری جان کی قسم [illegible]

[illegible]"

اس نے کہا "اس [illegible] وہ تو نہیں معلوم کہ کہاں گئے اور نہ کوئی [illegible] کی بتاتی ہے"

"[illegible] سمجھا جاسکے"

"میری قسمت پر تو میں کبھی نہ مانونگی کہ آپ کو بھی اسی قدر معلوم ہے، والدہ آپ بابت کچھ واقف ہیں، نہ بتائیں تو اس کی اور بات ہے"

"بہت تو نہیں، ہاں کچھ اور بھی معلوم ہے میں آپکو بتا سکتا ہوں اگر آپ اپنی ذات تک رکھنے کا وعدہ کریں"

"آپ کے جد کی قسم کسی سے نہ کہونگی"

میں نے بتایا کہ آپ کی بہنجی عید رمضان کے دن طفلیس [illegible] کی شادی آنچل سے کر دینا چاہتی تھیں اور وہ سوائے آپ کے کسی اور سے شادی کرنا نہیں چاہتے۔ اسی سبب سے وطن چھوڑ دیا۔

"اور گئے کہاں؟"

"طفلیس"

"اسے میرے اللہ اتنی دور"

"جی ہاں، میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے"

"طفلیس میں کس کے ہاں جا ٹھہرینگے"

"یہ مجھے نہیں معلوم اور شاید انہیں بھی نہ معلوم ہو، ممکن ہے وہاں پہونچ کے کوئی صورت نکالیں"

"آپ طفلیس جا سکتے ہیں؟"

"اگر آپ کہیں"

"ہاں میں آپ سے التماس کرتی ہوں"

"میں تیار ہوں آپ اپنا کام بتائیں"

اس نے اپنی سیاہ چادر کے اندر سے [illegible] کارڈ نکالا [illegible] اس کی پشت پر بائیں ہاتھ سے لکھا۔

"عزیز آنچل

جہاں [illegible] میں آخر دم تک تمہارا انتظار کرونگی

ملوک (بوساطت مادام کینزاف)"

اس نے [illegible] کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس پر [illegible]"

میں نے کارڈ [illegible] پہلے انداز [illegible] جو آنچل کو [illegible] مگر اب وہ کہاں تھا جو میرے خیال کی تصدیق کرتا۔ میں نے ملوک خانم سے اس کے متعلق گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک دوسری بات چھیڑ دی۔

"یہ مادام کینزاف کون ہیں"

"وہ [illegible] ہیں یہ میری استانی ہیں، دستکاری میں نے انہیں سے سیکھی ہے، آپ اطمینان رکھئے کہ ان کے ذریعہ سے جو خط بھیجینگے اس کی کسی کو خبر نہ ہوگی"

"آپ کو یقین ہے کہ یہ رازداری کر سکینگی؟"

"جی ہاں"

؎۱ ایرانی لڑکیاں اپنی شادی کی باتوں سے نہیں شرماتیں ایران کی یہی تہذیب ہے۔ ؎۲ خاوشتی ہیں۔ ؎۳ میڈم کینزاف ارمنی عورت۔ (یہاں)

میں نے کارڈ احتیاط سے رکھ لیا، ملوک خانم نے مجل کا خط اپنے پاس رکھ لیا، اس کی دلی پریشانی بات بات میں ظاہر ہو رہی تھی، میں نے چاہا کہ چائے بنا کے پلاؤں مگر وہ عذر کر کے چلی گئی اور میں سفر کی تیاری کرنے لگا

(۵)

طفلس ایسے آباد دنجارتی شہر میں کسی کو ڈھونڈ نکالنا آسان تو تھا نہیں، کئی دن تک ایرانی تجارت خانوں اور ہوٹلوں میں ڈھونڈتے رہنے کے بعد "ملک الکتاب"[1] کے کتب خانہ میں مجل ہاشمی سے ملاقات ہوئی، ملک الکتاب اس کے باپ کے دوست تھے وہ یہاں رہ کر فرانسیسی ناولوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر معمور ہوگیا تھا اور بہت اچھی حالت میں تھا۔

ہم دونوں بڑی گرمجوشی سے ملے، میں نے تہران کے حالات بتاتے ہوئے ملوک خانم کا کارڈ دیا، اس نے پڑھنے کے بعد مارے خوشی کے تحریر کو چوم لیا اور میرے کہنے سے مطابق کے کارڈوں کو اس کارڈ سے ملایا تو سب کا خط ایک نکلا۔

"میں نے بتایا کہ" یہ ملوک خانم کے بائیں ہاتھ کی تحریر ہے"

"اسے تعجب ہوا کہ" ملوک خانم کا یہ خیال تھا تو صاف صاف کیوں نہ کہدیا"

میں نے کہا" عورت جس بات کو برا سمجھتی ہے اس کو مجبور ہوئے بغیر ظاہر نہیں کرتی، ملوک خانم کو تو تمہاری محبت کا علم تھا مگر تمہارے ارادہ سے ناواقف تھیں، وہ اس خفیہ تحریک سے تمہارا ارادہ معلوم کرنا چاہتی ہونگی

لیکن میں نے اپنا ارادہ تو ظاہر کردیا تھا"

"اسوقت جبکہ دو ہفتے کے اندر کایا پلٹ ہوگئی۔ اس پر بھی معمہ حل ہوگیا

اس نے کھسیانی مسکراہٹ سے میری رائے کی تصدیق کی اور اسی وقت ملوک خانم کو خط لکھا جس کا جواب آنے کے بعد سے محبتانہ مراسلت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

دس مہینہ تک ملوک خانم کے خطوط افسانۂ محبت کو نتیجہ سے قریب کرنے گئے۔ اس کے خطوں نے بتایا کہ گھر کے حالات بدل چکے ہیں۔ مجل کی خالہ اس سے مایوس ہو کے بلقیس خانم کی شادی کا انتظام کر رہی ہیں۔ محمود خان نے اپنی بیٹی کی نسبت جہاں ٹھیرائی ہے وہاں سے شادی کی عجلت کیجا رہی ہے،

ان واقعات نے مجل کی طبیعت میں انقلاب پیدا کردیا۔ اب وہ ہر وقت خوش رہنے لگا، اور بلقیس خانم کی شادی ہوجانے کا انتظار کیا کرتا تھا کہ ایک دن کی ڈاک میں ایک سرخ لفافہ ملا" یہ ملوک خانم کا خط تھا جس میں پُر محبت شوخی اور نتیجہ خیز اختصار کی حد کردی تھی وہ۔

عزیزی مجل!

مبارک ہو، میں ابکی نوروز میں پھر تم سے عید ملونگی، فوراً آؤ"

تمہاری ملوک

اس خط نے مجل کو بے اختیار کر دیا، نوروز کا ابھی ایک مہینہ باقی تھا لیکن وہ دوسرے ہی دن روانہ ہوگیا، اور اپنا کام میرے حوالہ کرتا گیا۔

اب تہران سے مجل کا خط آئے تو معلوم ہو کہ نوروز محبت کیونکر ہوا۔

---

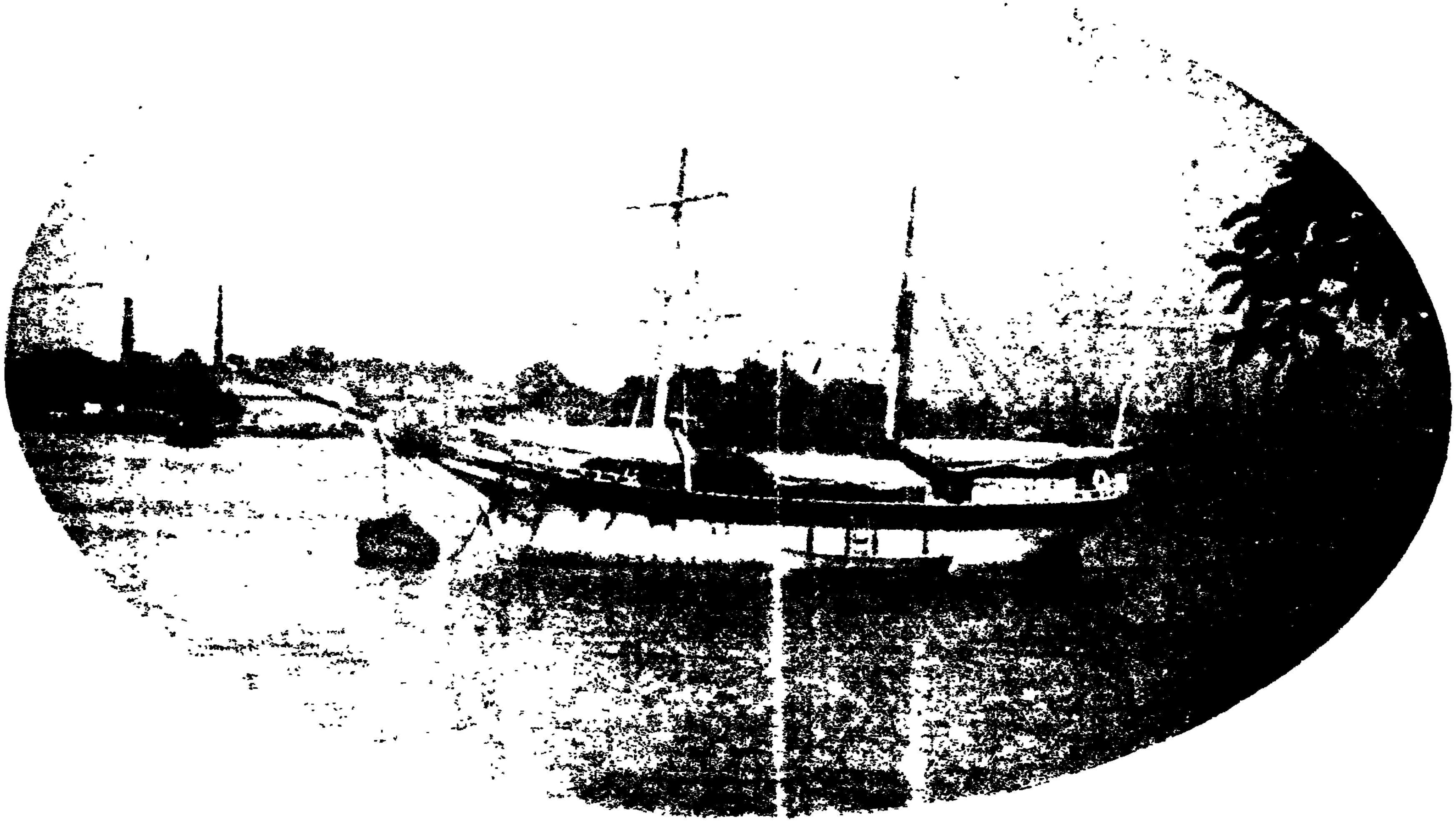
[1] خطاب ہے یعنی کتابوں کا بادشاہ ۔ (بہت اجتہادی سیاح ایران وعرب)

The SOHAIL.
GAYA

اَب ایرانی آرٹ



شیخ سعدی علیہ الرحمۃ



نقوش بہزاد

(از حضرت بہزاد لکھنوی)

آئی نہ راس عشق کی دنیا تو کیا ہوا
ہاں اور بڑھ گیا یہ تڑپنا تو کیا ہوا

اک دن وہ تھا کہ تم تھے تماشا مرے لئے
اب میں جو بن گیا ہوں تماشا تو کیا ہوا

دنیا کا رنگ اور رہے میرا ہے رنگ اور
ان کی طرف جو کر لیا سجدہ تو کیا ہوا

اپنی جگہ پہ مست ہے رنگ جمال یار
دیکھا تو کیا ہوا نہیں دیکھا تو کیا ہوا

ہمکو تو صرف اپنے تڑپنے سے کام ہے
دنیا جو دیکھتی ہے تماشا تو کیا ہوا

جلوہ کو ان کے رحمت دیدار کون دے
آنکھیں جو کر رہی ہیں تقاضا تو کیا ہوا

غیرو نہیں مست ہوں غیرو نہیں شاد و شاد
بہزاد گر نہیں کوئی اپنا تو کیا ہوا

رکشا

دنیا میں سواریوں کی جتنی قسمیں ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جس پر بلا خوف و خطر آدمی سوار ہو کر اطمینان سے عزت و آبرو کے ساتھ کہیں جا سکے۔ ہوائی جہاز پر چڑھئے تو ہر وقت روح پرواز ہونے کا خوف۔ بحری سفر کیجئے تو پہلے خطرہ کا صرف احتمال تھا مگر جرمن کے بھیتر مار سرنگوں کی بدولت اب تو غریق رحمت ہونے کا یقین کامل۔ ریل پر آئے دن ٹرینوں کے تصادم کے باعث جان کے خوف کے علاوہ بعض وقت عزت و آبرو کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ اتفاق ہی ہے کہ کبھی جلدی میں ٹرین چھوٹ جانے کے ڈر سے یا اکونمی کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی ٹکٹ نہ لے سکا تو ٹی۔ ٹی۔ والوں کی یہ کون سی انسانیت ہوئی کہ ساتھی مسافروں کے سامنے ٹکٹ پلیز ٹکٹ پلیز کہہ کر کسی بھلے آدمی کو بے آبرو کیا جائے۔ خدا جانے یہ کہاں سے علم قیافہ پڑھ کر آتے ہیں کہ چہرے کی گھبراہٹ چھپانے کے باوجود عموماً یہ اسی کو آکر دق کرتے ہیں۔ جس غریب کے پاس ٹکٹ نہو۔ اب اس کے بعد بھی ریل کو بھلے آدمیوں کی سواری کہئے تو آپ کو پورا اختیار ہے۔ اس سے تو ایک طرح موٹر کی سواری اچھی ہے۔ مگر اس میں بھی وہی ایکسیڈنٹ کا ہر وقت خوف بلکہ ریل میں ۲۰ فی صدی۔ تو موٹر میں ۶۰ فی صدی سے کم خطرہ نہیں۔ اس کے علاوہ ٹرینوں کے تصادم کی نوبت تو اسی وقت آتی ہے۔ جب سوئے اتفاق سے کوئی ٹرین اسی لائن پر دوسری جانب سے آرہی ہو۔ موٹر کی طرح یہ تو نہیں ہوتا کہ آج کسی دیوار سے جا کر ٹکرایا۔ کل کسی درخت سے جا بھڑا پرسوں راستہ میں بیل گاڑی کو ڈھونس مار دیا۔ باؤلے ہاتھی کی مانند جدھر منہ اٹھا کر لگائے رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جس کا لازمی نتیجہ موٹر کو ورک شوپ میں۔ اور موٹر نشیں صاحب کو ہسپتال میں پہنچانا ضروری۔ خیر ہوائی جہاز۔ ریل۔ موٹر کے بارہ میں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں جان عقل اور سمجھ نہ رہنے کے باعث جو حرکت نہ ان سے سرزد ہو جائے سب ممکن ہے۔ لیکن جاندار سواریاں از قسم گھوڑا ہاتھی وغیرہ ان میں تصادم اور جان کے خطرہ کا تو کوئی ایسا ڈر نہیں۔ اچھا صاحب سب سواریوں کی بندہ گاہ پہلے ہاتھی ہی کو لیجئے۔ لیکن جو شخص پہلے کسی ہاتھی پر نہ چڑھا ہو اسے سمجھا بوجھا کر کسی طرح سوار کرا دیجئے اور شرط یہ کہ ہاتھی پر بیٹھا کے اس کی دم والے رستے سے کس کر باندھئے نہیں۔ اور ہاتھی کو اسٹاٹ کر دیجئے۔ پھر دیکھئے۔ گرا۔ جان گئی۔ خدا کے لئے بچاؤ۔ کا واویلا کس طرح شروع ہو جاتا ہے۔ سوار کے ہاتھ میں نہ لگام نہ پاؤں میں رکاب اس پر ہاتھی کی محشر خرامی گویا پہاڑ پر بیٹھے ہوئے بھونچال میں گرفتار اللہ ہی پیر منا رہے ہیں۔ اس کو لوگ کہتے ہیں۔ شاندار سواری۔ البتہ گھوڑے کی سواری کو ہاتھی کی سواری سے نسبتاً کم خطرناک آپ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کی کاندھی لینتک پر آپ زور سے باگ کھینچی اور وہ الف یعنی الف کھڑا از بر ہو گیا۔ توب کی طرح چاروں شانے چت اور پیٹھ زخمی ہونے پر ب کے پیٹھ پر ایک نقطہ بھی ہو گیا۔ اور اگر گرنے کے خوف سے آپنے کہیں باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور برق رفتار گھوڑے کی سرپٹ چال میں ران اچھی طرح نہ جم سکا تو وسعت کرتے ہیں شہسواری میدان جنگ میں۔ کے بدلے رکاب میں پاؤں پھنس جانے کے باعث ۶ سر کے بل کوچہ جاناں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر آپ کہیں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونے کے بدلے بگی یا ٹم ٹم میں جوت کر اس سے سواری کا کام لیا جائے تو جہانتک مشاہدہ کا تعلق ہے یہ تدبیر بھی زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہوتی گھوڑے کی شرارت کی وجہ سے اگر کسی بگی کا بم ٹوٹا تو بگی سوار کو لئے دئے نالے کے اندر۔ سوار صاحب نیچے اور

گاڑی اور یہ کبھی کشتی پر سوار کبھی سوار بر کشتی کی مثل کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اور گھوڑے صاحب ساز سے بندھے بندھائے ناچ رہے ہیں۔ چت لیٹے آسمان کی طرف پاؤں اُٹھائے قدم کی چال مشق کر رہے ہیں۔ یہ تو ہوئی بگی کی چشم دید حالت۔ اب کرایہ کی ٹمٹم کی آپ بیتی کہانی سُنئے گا تو اندازہ لگ جائے گا کہ اس نامعقول سواری میں آدمی کو کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یکّہ بانوں کی کھینچا تانی میں شامت اعمال سے اگر کسی یکّہ بان کے آپ ہتھے چڑھ گئے اور اس نے آپ کو کھینچکر تنہا اپنی ٹمٹم پر بیٹھا لیا تو پہلے تو آپ کے علاوہ اور دوسری سواری بیٹھانے کے لئے گھنٹوں اسی ٹمٹم پر اِدھر اُدھر آپ کو چکر دیتا پھریگا اس کے بعد اگر اڑیل گھوڑے سے واسطہ پڑا تو پھر گھنٹوں آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے میں آپ کا وقت صرف ہوگا۔ اور پھر اگر کس کس کر مسلسل چار پانچ ڈنڈے کھانے کے بعد یکایک ٹمٹم کو لئے دئے اُٹھا پٹخ کرتا ہوا بے تحاشا بھاگا۔ تو اب گرنے کے خوف سے لاکھ آپ رُو کو تھامو کا شور مچا رہے ہیں۔ مگر پھر کاہے کو کسی کی سُنے۔ اور اگر یکّہ بان کی پوری قوت سے باگ کھینچنے پر جو گھوڑے نے الف لیا تو پھر آپ کی خیر نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس تجربہ کے بعد اگر کسی یکّہ بان نے مُفت یا اُلٹا اور مجھ ہی کو کرایہ دیکر ٹمٹم پر سوار ہونے کو کہا تو ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ خلاصہ یہ کہ ہوائی جہاز۔ دریائی جہاز جنگلی جہاز (ہاتھی) یعنی ان آبی بادی کامی جہاز سے لیکر ریل موٹر بگی ٹمٹم۔ کوئی بھی ایسی سواری نہیں جس پر سوار ہوکر صحیح الدماغ اور محتاط انسان صحیح سلامت منزل مقصود تک پہنچ جانے کا یقین رکھے۔ البتہ رکشا بقول میرے ایک کفایت شعار دوست کے صرف رکشا ہی ایک ایسی شریف سواری ہے جو ہر طرح کے خطرہ سے محفوظ ہونے کے علاوہ اکونمی کے لحاظ سے بھی غریب بلکہ شریف پرور سواری ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر کسی کے ساتھ اسباب اور سامان ہو تو پیدل چلنے سے بھی رکشا کی سواری زیادہ سستی پڑتی ہے۔ اسلئے کہ اپنے سر پر آپ کا سامان لادکر لیجانیوالا قلی جتنی مزدوری آپ سے طلب کرے گا۔ اس سے کہیں کم اُجرت پر رکشا قلی آپکے اسباب اور سامان کو مع آپکے لادکر جہاں کہئے پہنچا دینے کو تیار۔ اور اسباب کی تعداد اور وزن کی بھی قید نہیں۔ جس قدر رکشا میں اوپر تلے رکھنے کی گنجائش ہو آپ کے سمیت اس میں لادکر پہنچانے کو موجود۔ اور اس کے ساتھ اسباب کی نوعیت اور قسم کی بھی شرط نہیں۔ گھر کا برتن باسن چولھا چکی جلاون کی لکڑی کوئلہ بلکہ چارپائی تک رسّی سے باندھکر اس پر خود بھی آرام سے بیٹھے ہوئے چلے جائیے۔ باربرداری کی باربرداری۔ سواری کی سواری۔ اب اس سے بڑھکر کم خرچ بالانشیں دوسری سواری اور کیا ہوسکتی ہے۔ ریل کی طرح کوئی خاص وقت کا تعین نہیں نہ اس کا کوئی خاص اسٹیشن جہاں پہنچکر گھنٹوں وقت کا انتظار کیجئے۔ جس وقت اپنا جی چاہے گھر بیٹھے پکارا اور وہ آپکے دروازے سے اُٹھا لیجانے کو تیار۔ موٹر گھوڑا گاڑی ٹمٹم کا بھی جس تنگ گلی میں رسائی نہو ان مشکل راستوں کو اس میں بیٹھکر نہایت آسانی سے طے کیجئے اس سے بڑھکر اور کوئی سہل الممتنع سواری ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملے گی۔ نہ گھوڑے کی دولتیاں جھاڑنے کا خوف نہ جانور کے دانت کاٹنے کا ڈر نہ الف کھانے کا احتمال۔ ایک آنہ دیجئے اور شہر کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک ہو آئیے۔ اور اگر آنہ دوآنہ بھی رکشا کا کرایہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تو نیا اگر نہیں ایک سکنڈ ہینڈ ہی رکشا اپنے اصطبل میں باندھ دیجئے۔ اور مزدور قسم کا ایک ایسا ملازم رکھ لیجئے جو دن بھر آپ کا اور سب کام کرتا رہے۔ اور جب ضرورت پڑے تو اُسے رکشا میں جوت کر بلا خرچ جہاں جی چاہے مارے مارے پھرئیے۔ نہ شوفر کا مشاہرہ نہ پٹرول کا خرچ نہ کوچبان کی ضرورت نہ سائیس کی حاجت نہ دانہ گھاس کی فکر۔ ان خوبیوں کے علاوہ ایسی سُبک رفتار سواری کہ اس کی ربڑ ٹائر پہیا پیچ بچھی ہوئی سڑک پر جس وقت گذرتی ہے تو سوار کو دھوکا ہو جاتا ہے کہ کسی سواری پر جا رہے ہیں۔ یا آرام کرسی پر گھر بیٹھے سنیما کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ مکانات۔ دُوکانیں۔ اور راہ چلنے

لوگ غرض بازار کا بازار سامنے سے گذر رہا ہے۔ ربر ٹائر پہیا، ہڈ، مڈگارڈ، سیٹ کا گدا ان لوازمات کے ساتھ گویا نیو موڈل کا دَن سیٹر موٹر ہی سمجھئے۔ ہڈ اٹھا کر اگر سامنے اس میں کوئی تولیہ یا چادر باندھ دیجئے تو زنانہ سواری کے لئے محمل لیلےٰ سے کم نہیں۔ اور ہڈ گرا دیجئے تو ہوا دار تا مدان کا لطف۔ غرض یہ ایسی معجون مرکب سواری ہے جس میں بہت سی سواریوں کی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں بلا خرچ یا کم خرچ ہونے کے سبب جہاں شخصی اعتبار سے یہ نفع بخش سواری ہے وہاں ہزاروں بے روزگار مزدوروں کی روزی کا سامان ہونے کے باعث ملکی فلاح کے لحاظ سے بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ مہاتما جی میری بات مانیں۔ یا کم از کم اس پر غور کریں تو میں صاف صاف اُن سے کہنے کو تیار ہوں۔ کہ ملک کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لئے لوگوں کو چرخہ چلانے کے بدلے رکشا چلانے کے کام میں لگا دیں۔ تو جتنی دیر میں جتنی قیمت کا سوت آدمی چرخہ چلا کر نکالے گا۔ اتنی ہی وقت میں اس سے زیادہ رقم رکشا چلا کر پیدا کر لے سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے مہاتما جی سے میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رکشا جیسی سودیشی سواری چھوڑ کر سودیشی پرچار کے لئے بدیشی موٹر پر کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور اگر کہیں جلد پہنچنے کی ایسی ہی ضرورت پیش آجائے تو رکشا کو موٹر کے پیچھے باندھ کر اس پر جہاں جی چاہے جائیں۔ گو اس میں آپ کو پہنچانے والی تو بدیسی طاقت ہوگی مگر کہنے کو تو ہوگا کہ بیٹھے ہوئے ہیں دیسی سواری پر۔ مختصر یہ کہ کم خرچ۔ آرام دہ۔ سودیشی۔ خطرہ سے محفوظ ہونے کے باعث یہ مجموعہ خوبی رکشا ہر حیثیت سے جامع و مانع سواری ہے۔ انہیں وجوہ کی بنا پر میں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ رکشا چھوڑ کر کسی اور سواری پر سوار ہونا تو خیر اُس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا حرام مطلق۔ چنانچہ جب کبھی سیر و تفریح کی غرض سے شام کو نکلا تو رکشا پر۔ کچہری چلا تو بغل میں بستہ دبائے ہوئے رکشا پر۔ کچہری کیا کلکٹر صاحب کی زیارت کے لئے ان کی کوٹھی پر پہنچا تو رکشا پر۔ حکیم یا ڈاکٹر کے یہاں گیا تو ٹھوکر سے پھوٹ جانے کے خیال سے قارورہ کی شیشی ہاتھ میں لئے۔ رکشا پر۔ کسی پبلک میٹنگ یا کسی لیڈر کے جلوس میں شرکت کا موقع ملا تو لوگوں کے موٹروں سے کاندھے میں کاندھا ملائے میرا رکشا بھی مجھے لیڈرانہ شان سے لئے جا رہا ہے لیڈرانہ شان اس لئے کہا کہ اور لیڈروں کی گاڑیوں کو تو صرف جلوس کے موقع پر آدمی کھینچتے ہیں۔ اور یہاں جلوس اور تنہائی کی قید نہیں۔ ہر وقت رکشا کا آدمی کھینچنے کیلئے تیار۔ اور یہ ممکن نہیں کہ جس کی گاڑی آدمی کھینچے اس پر لیڈری کی کیفیت نہ طاری ہو۔ البتہ اگر کوئی بھاری لیڈر ہے تو گاڑی کھینچنے والوں کی تعداد ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کا کتنا وزن ہے۔ اور مجھ جیسا خادم ملک جو لیڈری کی ابتدائی منزل طے کر رہا ہو۔ اس کی گاڑی یعنی رکشا کھینچنے کے لئے شروع شروع ایک ہی [illegible] کافی ہے۔ اگر میری لیڈری کی رفتار یہی رہی اور کسی نے اس چلتی گاڑی میں [illegible] روڑا نہیں اٹکایا۔ تو رفتہ رفتہ آئندہ سیکڑوں کیا [illegible] لوں کو اپنی گاڑی میں نہ جتوا دوں پورا تو مجھ لیڈر نام نہیں۔ اب آپ [illegible] سواری [illegible] خوبیوں کے علاوہ انسان کو آدمی سے لیڈر بنا دے اُسے چھوڑ کر [illegible]

شامت سوار ہوئی [illegible] اپنے شہر [illegible] بلکہ باہر سفر میں بھی اس مفید عام [illegible]

نہیں چھوڑنا لیکن [illegible]

[illegible] ایسے ناخوشگوار واقعات پیش [illegible]

تجربات ایسے حاصل ہوئے جنہیں [illegible] سواری [illegible] ضروری ہے تاکہ اس مفید عام سواری میں جو کچھ نقائص رہ گئے ہیں انہیں دور کرنے بغرض رفاہ عام اسے اور زیادہ کارآمد سواری بنانے کی کوشش ہو جائے رانچی کے سفر کا قصہ [illegible]

ایک خاص ضروری کام کے سلسلے میں بھائی فضلو [illegible] مولوی فضل الرحمن ڈپٹی مجسٹریٹ رانچی سے ملنے کے لئے گیا تھا علی الصباح [illegible]

موٹر بس میں بیٹھ کر تقریباً ڈھائی بجے دن کو رانچی پہنچا۔ لاری سے اتر کر حسب عادت جو رکشا والے کو بلایا تو بجائے ایک کے پانچ چھ رکشا والوں نے آکر گھیر لیا۔ ان میں سب سے مضبوط اور مشٹنڈے رکشا قلی کو لاری کی چھت سے اور اسباب اتار کر اپنے رکشا پر رکھنے کو کہا بقیہ سامان ٹیفن کیریر، ہینڈ بیگ، چھتری، گرمی کے خیال سے پانی سے بھری ہوئی صراحی اور جنگلی سفر کے باعث بندوق یہ سب چیزیں جو نیچے ساتھ تھیں۔ ان سب کو ایک ایک کر کے خود اتار کر باہر کیا۔ قلی نے پہلے بستر کا ہولڈال اتار کر رکشا کی پاؤں دان پر رکھا۔ اس کے بعد چمڑے کی پیٹی سیٹ پر اور اس پیٹی کے اوپر سوٹ کیس رکھ کر کہا آئیے سرکار۔ بیٹھئے! میں نے دیکھا کہ رکشا پہلے ہی اوور لوڈ ہو چکا اب ہینڈ بیگ، ٹیفن کیریر، لوٹا صراحی، چھتری، بندوق وغیرہ یہ سب چیزیں کدھر رکھی جائیں۔ اور پھر خود میں کہاں بیٹھوں؟ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ قلی نے پھر کہا **رکشا قلی** ۔ سرکار بکسوا پر آکے بیٹھ رہا --- میں --- یہ لوٹا اور صراحی؟ قلی --- ای دونوں کے اک اک ہاتھ میں لے لیل جائے۔ میں (ٹیفن کیریر کی طرف اشارہ کرکے) اور --- یہ؟ قلی --- اکرا اپن گودی میں دھر دیں۔ اور بندوق؟ قلی --- دونوں جنگھیا پر سوتا کے رکھ دیل جائے --- اس کے بعد ہینڈ بیگ کے لئے پوچھنا ہی فضول تھا۔ یقینی دانت پکڑے رہنے کا مشورہ دیتا۔

میں ہینڈ بیگ اور ٹیفن کیریر کو سامنے بستر پر رکھا اور ایک ہاتھ میں لوٹا دوسرے ہاتھ میں صراحی لئے بغل میں چھتری دبائے سیٹ پر جو پیٹی تھی بلکہ پیٹی پر جو سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ اس پر آکر بیٹھا اور دونوں پاؤں بستر کی گٹھری پر پھیلا کے قلی سے کہا۔ بندوق کو دونوں ران پر لٹا دے۔ غرض ایک ہاتھ میں لوٹا دوسرے ہاتھ سے رکشا کے بازو پر صراحی رکھ کر مضبوطی سے اس کی گردن تھامے بغل میں چھتری دبائے دونوں زانوں پر بندوق رکھے بایں ہیئت کذائی جو روانہ ہوا تو یہ معلوم کیوں دونوں جانب کے دوکاندار اور راہگیر میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ چند ہی قدم راستہ طے کیا تھا کہ ڈھالواں سڑک کی چڑھائی کی طرف جو قلی نے زور لگا کر کھینچنا شروع کیا تو پیچھے کی جانب جھک جانے کی وجہ سے ٹیفن کیریر لڑھک کر جھنانک کی آواز کے ساتھ سڑک پر دور تک کا سرشتہ اور ان میں جو کھانے کی چیزیں تھیں سب سڑک پر ادھر ادھر منتشر ہو گئیں۔ انتہائی غصہ میں قلی کو جب ڈانٹ کر کہا کمبخت دیکھتا نہیں ٹیفن کیریر گر گیا۔ اور کھانے کی کل چیزیں تحس نحس ہو گئیں۔ ان سب کو چھوڑ کر مجھے زبردستی آگے کھینچے لئے جا رہا ہے۔

ڈانٹ کی کرخت آواز سن کر گھبراہٹ میں رکشا کے بم کو زمین پر رکھے بغیر اسی بلندی میں چھوڑ کر ٹیفن کیریر اٹھانے کے لئے جو دوڑا اور رکشا پیچھے کی جانب الٹا تو میرا سر نیچے اور پاؤں آسمان کی طرف --- بندوق زانو سے کھسک کر گردن میں اٹکی ہوئی --- لوٹا ہاتھ سے چھوٹ کر کئی قدم کے فاصلہ پر --- صراحی ٹوٹ کر اس کی گردن ہاتھ میں --- اور دائیں جانب کی شیروانی اور پائجامہ کا حصہ صراحی کے پانی سے شرابور --- وہ تو خیریت ہوئی کہ رکشا کے پیچھے کی جانب کے دونوں ڈنڈے نے الٹنے سے روک لیا۔ اور جیسے کوئی آرام کرسی پر سر نیچے اور پاؤں اوپر کئے لیٹ جائے میں کئی منٹ تک الٹا لٹکا رہا۔ ورنہ قلا بازیاں کھاتا ہوا رکشا سے کئی قدم کے فاصلہ پر کراہتا نظر آتا۔ اب بجائے اس کے کہ مجھے اس بے بسی کے عالم میں دیکھنے کے ساتھ ہی لوگ دوڑ کر میری دستگیری کر کے سر اور بازو پکڑ کر رکشا پر پھر سیدھا بیٹھا دیتے اور الٹا لگے سب ہنس ہنس کر آوازے کسنے۔ ایک نے کہا۔ سرکس میں گھوڑے پر بیٹھ کر قلا بازیاں کھانے کا تماشا تو بہت دیکھا مگر رکشا پر سر نیچے اور پیر اوپر کا کرتب آج ہی دیکھنے میں آیا۔ دوسرے نے ارشاد فرمایا ہمیں ان کے رکشا پر ٹنگے رہنے سے زیادہ ان کے ٹیفن کیریر گرنے اور کھانے کی چیزوں کے برباد ہونے کا افسوس ہے --- تیسرے نے گوہرافشانی کی --- کھانے کی چیزوں کے برباد ہونے سے

زیادہ صرف صراحی ٹوٹ جانے کا ہے ---- چوتھے نے زہر اُگلا کہ صراحی ٹوٹنے سے زیادہ ہمیں غم پانی بہ جانے کا ہے مختصر یوں کہ یہ بر جراحت جملے اُس وقت تک سُنتا رہا جب تک اس رُکشا قلی نے پلٹ کر دو ایک راہگیروں کی مدد سے مجھے رُکشا پر سیدھا نہ بیٹھا لیا۔ مزید مضحکہ خیز جملوں کی بوچھار سے بچنے کے لئے ٹیفن کیریر کو اُلٹا سیدھا جلدی سے رُکشا پر رکھ کر قلی کو فوراً چل دینے کی تاکید کی۔ چنانچہ بے تحاشا وہ لے کر وہاں سے بھاگا اور آگے جا کر سڑک کے نشیبی حصہ کو اسی رَو میں نہایت تیزی سے طے کر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک موٹر کے ہورن کی آواز آئی اب گھبراہٹ میں رُکشا موڑنے کے بعد نشیب کی وجہ سے اُس کا موشن تو وہ روک نہ سکا۔ رُکشا لئے دیئے ایک تنبولی کی دوکان سے اس طرح جا کر ٹکرایا کہ کتھا اور چونے کی ہانڈی ٹوٹ جانے کے علاوہ پان کے کچھ پتے دوکان سے گر کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اس پر غصہ میں دوکان سے کود کر تنبولی رُکشا قلی کو مارنے کے لئے دوڑا تو وہ سر پہ پاؤں رکھ کر اس طرح بھاگا کہ پھر مڑ کر ادھر دیکھا تک نہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے سمجھا کہ یقینی یہ نزلہ اب میری طرف رجوع ہوگا۔ چنانچہ جیسے ہی اس نے یہ کہنا شروع کیا۔ بڑے رُکشا پر چڑھنے والے بنے ہیں۔ رُکشا قلی اگر اندھا تھا تو تمہاری آنکھ تو ---- یہ جملہ پورا کرنے بھی نہ پایا تھا کہ جلدی سے میں نے پان کی بٹی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ---- بھائی صاحب! آٹھ آنے کا پان بنا کر تو اس بٹی میں بھر دیجئے۔ ایک آنہ سے زیادہ پان کی گنجائش جس بٹی میں نہ ہو اُس کے لئے آٹھ آنے کی پیشکش بیکار تھوڑے ہی جا سکتی تھی۔ قدرے دھیمے لہجہ میں اس نے کہا۔ اور یہ چونا کتھہ اور پان جو برباد ہو گیا اس کا دام کون دیگا؟ میں نے کہا اس واجب بات میں کس کو عذر ہو سکتا ہے۔ قلی اگر بھاگ گیا۔ تو اس کی طرف سے میں دینے کو تیار ہوں۔ یہ کہکر فوراً جیب سے ایک روپیہ نکال کر دکان پر پھینکا۔ اور کہا ان سب کا دام جوڑ کر لینے کے بعد جو بچے اُسی کا پان بنا کر بٹی میں بھر دو۔ اب غصہ کے بجائے پان بناتے ہوئے ہمدردانہ لہجہ میں اس نے پوچھا کہ یہ داہنی طرف آپ کی شروانی کس طرح بھیگ گئی۔ خفت کے خیال سے رکشا کے اُلٹنے اور صراحی ٹوٹنے کا واقعہ تو کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ جلدی میں کہدیا۔ دیکھتے نہیں کہ گرمی کسقدر پڑ رہی ہے۔ پسینہ سے شروانی کیا بعض وقت ٹوپی تک بھیگ جاتی ہے۔ اس پر اس نے ہنس کر کہا۔ مگر صرف داہنی طرف شروانی کا تھوڑا ہی سا حصہ بھیگا ہوا ہے۔ اس بے ڈھب جرح کا جواب کیا تھا۔ فوری طور پر اور تو کچھ نہیں سمجھ میں آیا۔ ٹالنے کے لئے کہا۔ بائیں جانب پسینہ چلکر پہلے خشک ہو چکا۔ تب اب ادھر داہنی طرف پسینہ چلنا شروع ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ صرف ایک روپیہ میں تنبولی کی خفگی کو دور کر کے نہایت ہی خیر و خوبی کے ساتھ اس معاملہ کو رفت و گذشت کیا۔

اس کے بعد اس کی فکر ہوئی کہ قلی تو بھاگ گیا اب رُکشا پر مجھے مع سامان کے کھینچکر لے کون جائے۔ سامنے اِدھر اُدھر تلاش کرنے پر ایک قلی ملا بھی تو دوسرے کا رُکشا اِس ڈر سے لیجانے پر تیار نہیں کہ چوری کا مقدمہ نہ چل جائے۔ تنبولی نے کہا کہ کچھ دور آگے جا کر موٹر پر بیٹھیوں قلی اور رُکشا ملیں گے۔

اب اس رُکشا پر کل سامان چھوڑ کر اگر قلی کی تلاش میں کسی طرف جاتا ہوں تو ان سب اسباب کے غائب ہو جانے کا خوف تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد یہ سوچکر کہ اپنا شہر تو ہے نہیں۔ غیر جگہ کو پہچانے گا۔ بسم اللہ کہکر موٹر تک پہنچانے کے لئے جو خود ہی رُکشا کھینچکر لے چلا تو ہر طرف سے طرح طرح کے پھر آوازے شروع ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ بیچارے سے رُکشا اچھی طرح کھینچا نہیں جا رہا ہے۔ جانور بیمار معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کسی نے فرمایا۔ تو بھیجدو ایسے گھوڑے ہسپتال میں۔ ایک مسخرے نے کہا۔ بڑا شوقین قلی ہے۔ کام کرتا ہے رُکشا کھینچنے کا اور ڈٹائے ہوئے شروانی پائجامہ ماشاء اللہ انگریزی بوٹ بھی پاؤں میں ہے۔ ایک اور دوسرے زندہ دل نے گہر افشانی کی کہ دیکھتے نہیں بندوق۔ فوج سے نکالا ہوا کوئی سپاہی

معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ایک بیہودے نے ہنسکر کہا۔ توپ سے نکالا ہوا نہیں۔ بلکہ کانکے[۵] سے نکالا ہوا کوئی سنکی ہے یہ تیر و نشتر کی طرح چبھتے ہوئے جملے سنکر غصہ میں جی تو چاہا کہ کارتوس نکالنے اور بھرنے میں دیر ہوگی۔ جلدی سے بندوق پھینک کر ایسا نشانہ لگاؤں کہ کمبختوں کی ٹانگ ہی ٹوٹ جائے۔ مگر پھر سوچا کہ اگر نشانہ نہ لگا تو ان سب کی ٹانگ ٹوٹنے کے بدلے کہیں میری بندوق ہی نہ ٹوٹ جائے مجبوراً جی ہی جی میں ان سب کو برا بھلا کہتا ہوا کسی طرح خود کھینچکر رکشا کو موٹر تک پہنچایا۔ اس جگہ پہنچکر میں نے سوچا کہ اول تو اتنے سامانوں کے ٹھسم ٹھس بھر جانے کے سبب میرے بیٹھنے کی گنجائش نہیں۔ دوسرے بہ دقت تمام اس میں اپنے آپ کو اٹا یا بھی تو پھر ہر وقت چیزوں کے لڑھک لڑھک کر گرنے کا خوف۔ ایک رکشا والے کو بُلا کر کہا۔ تم اپنے رکشا پر مجھے لے چلو اور ساتھ ہی ایک دوسرا قلی بھی اپنی معرفت بندوبست کرو۔ جو اس رکشا کو کھینچکر ساتھ لے چلے۔ اس نے کہا چار آنہ پیسہ نکالئے تو دونوں رکشا ہم اکیلے کھینچکر لیجا سکتے ہیں۔ میں نے یہ سوچکر کہ دو قلی علٰحدہ علٰحدہ اگر رکشا کھینچکر لیجائینگے تو ممکن ہے۔ اس میں سے ایک سامان لئے دئے رکشا کو ادھر اُدھر گلی میں گھسادے تو اب میں رکشا پر بیٹھا ہوا کہاں کہاں اُسے تلاش کرتا پھرونگا۔ میں نے نہایت ہی فراخ دلی کے ساتھ مطلوبہ مزدوری منظور کرلی۔ قلی خدا جانے کہاں سے ایک رسّا لے آیا۔ اور اپنے رکشا کے پیچھے اس رکشا کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد مجھے اپنے رکشا پر بٹھا کر لیچلا۔

چند ہی قدم چلا تھا کہ یکایک دل میں خیال آیا کہ میں سامنے سیدھا رُخ بیٹھا ہوا جا رہا ہوں اور پیچھے رکشا سے کوئی کل سامان ایک ایک کر کے اُٹھالے جائے۔ تو چوری کی نالش کس پر کرونگا۔ یہ خیال آتے ہی فوراً اُچک کر پیٹھ پھیر کے اُلٹا رُخ بیٹھ گیا۔ تاکہ کل چیزیں نگاہوں کے سامنے رہیں۔ اب آپ ہی کہئیے کہ اس کے سوا ان چیزوں کی حفاظت کی اور کیا صورت تھی۔ مگر شہر کے بیہودے لونڈوں کی پھبتیوں سے خدا ہر عزت و آبرو والے کو بچائے۔ الٹا رُخ رکشا پر مجھے جاتے ہوئے دیکھکر سب نے دل لگی شروع کر دی۔ ایک مردود نے کہا۔ دیکھو نا منھ پھیر کے بیٹھا جا رہا ہے۔ بڑا شرمادہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے بدتمیز نے کہا۔ جیسے کسی جانور کی دم پکڑ کر الٹا کوئی گھسیٹے لئے جا رہا ہو۔ بیچارے کو زبردستی رکشا والا پیچھے کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہے۔ ایک اور مسخرہ نے فقرہ کسا۔ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جُتتے ہوئے سب نے دیکھا ہے۔ دو رکشا میں ایک آدمی جُتا ہوا آج ہی دیکھنے میں آیا۔ ان پھبتیوں سے عاجز آکر غصہ میں رکشا سے اُتر پڑا اور پیچھے والے رکشا کو آگے اور آگے والے کو جس پر میں بیٹھا تھا۔ اُسے رسّے سے باندھکر "آگے مال گاڑی اس کے پیچھے پرزرو گاڑی" رکشا پر سیدھا سامنے رُخ بیٹھکر جب نکڑ پر پہنچا اور ڈپٹی پاڑہ کی طرف لیجانے کے لئے سڑک عبور کر کے ایک پتلی گلی کی طرف مڑکر جیسے ہی قلی نے رکشا کو زور لگا کر کھینچا تو اگلا رکشا گلی کے اندر۔ اور اس کا دُم چھلاّ میرا خاص رکشا گھوم کر اس کے پیچھے ہو لینے کے بجائے ترچھا ہو کر تھوڑی دور تک گھسیٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی ایک بائیں جانب کی پہیا نالی میں گر جانے کی وجہ سے قریب تھا کہ یہ رکشا اپنی داہنی ٹانگ اُٹھا کر مجھے گود میں لئے دئے زمین پر کروٹ لیٹ جائے ——— میں الٰہی خیر کہتا ہوا فوراً رکشا سے کود پڑا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ گلی کے کونے کی ایک دیوار سے جا لگا۔ ورنہ اُلٹ جانے کے بعد رکشا کی سب ہڈی پسلی اس طرح چور ہو جاتی کہ اس پر بیٹھ کر جانے کے عوض اس کی لاش سر پر لاد کر لیجانے کی نوبت آتی ——— میں نے غصہ میں ڈانٹ کر جب قلی سے کہا۔ کہ کمبخت ابھی تو نے میری جان ہی لی تھی ——— تو معذرت کے بدلے وہ اُلٹا لگا مجھی پر بگڑنے "تُو ر اپنے جان ہی کے پڑل ہو ہمرا رکشا چور ہو جائت ہل او کر کچھ پھکر نہ ——— ہم باج (باز) رہی ایسن رکشا کھیچے سے" یہ کہکر اپنا بندھا ہوا رکشا لگا کھولنے لیجئے اب

---

[۵] رانچی کا پاگل خانہ۔

لئے لینے کے دینے پڑ گئے۔ دل میں کہا۔ کہ اگر یہ قلی بھی کہیں داغ مفارقت دے گیا۔ تو ڈپٹی پاڑہ تک پھر خود رکشا کھینچکر لیجانے سے
ہا۔ لونڈوں کی پھبتیوں کے علاوہ بھائی نصلو مجھے رکشا کھینچتے ہوئے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ مجبوراً اپنے غصہ کو واپس لیکر لگا قلی کی
ر خوشامدیں کرنے۔ آخر بہزار دقت دوہری مزدوری اور انعام کا وعدہ کرکے کسی طرح لے چلنے پر اُسے راضی کرنے کے بعد قلی اور میں
ونوں نے زور لگا کر پہیا کو نالی سے نکالا۔ اور آگے آگے وہ کھینچکر پیچھے پیچھے میں دونوں ہاتھوں سے رکشا ٹیل کر لیجا۔ ڈپٹی پاڑہ کے
یب پہنچکر رکشا پہ نہایت ہی شان کے ساتھ میں بیٹھ رہا۔ ایک چھوٹی سی خوشنما کوٹھی کے سامنے رکشا رک کر قلی نے کہا لیجئے اُتریئے
ر ہری مزدوری اور انعام دیجئے۔ سامنے غالباً ڈپٹی صاحب کا ملازم تھا۔ انکا مہمان سمجھ کر لگا ادھر وہ میرا سامان اُتارنے۔ اوراِدھر
شا کھول کر قلی نے پورے ایک روپیہ کا مطالبہ شروع کیا۔ حساب کی تفصیل پوچھنے پر معلوم ہوا کہ طے شدہ مزدوری ۲/ دو رکشا کھینچنے کی
وہری مزدوری ۴/ر۔ نالی سے پہیا نکالنے کا معاوضہ چار آنہ۔ وہاں سے رکشا ٹھیلتے ہوئے جو میں پیدل ساتھ آیا اس کا انعام
ار آنہ ۴/ر میزان کل مبلغ ایک روپیہ۔ ان سب کاموں کو یقینی اس نے انجام دیا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ اس حساب میں عُذر کرکے
نوٹیں ہیں کرتا۔ میں نے مطلوبہ رقم دے کر اُسی کو غنیمت سمجھا کہ فرار شدہ قلی کی مزدوری کا بھی اس نے مطالبہ نہیں کیا۔ ایک روپیہ
بولی کے نقصان کا معاوضہ۔ ایک روپیہ اس قلی کی مزدوری۔ صرف دو روپیہ میں بغیر گرے اور چوٹ کھائے کسی طرح خیر و خوبی کے
ساتھ جائے قیام پر پہنچ جانے کے بعد اسے گراں سواری کہنا مناسب نہیں۔ اور پھر گھوڑا گاڑی پر اشرف المخلوقات ہونے کے باعث
دمی گاڑی کو بہرحال فوقیت ہونی چاہیئے اور اگر موٹر پر بھی آتا تو صرف ایک ہی ٹیکسی کا اس سے کم رقم نہ لیتا۔ اور یہاں خدا کے
ضل سے دو دو رکشے سواری میں ساتھ تھے۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد آرام کرسی پر دراز ہو کر کچہری سے نصلو بھائی کے آنے کے
نظار میں تسلی کے لئے دل سے ہی باتیں کر رہا تھا کہ برساتی میں موٹر آکر رُکا۔ موٹر سے اُترنے کے ساتھ ہم دونوں کی نظریں جیسے ہی
یک دوسرے پر پڑیں لپک کر ایک دوسرے کے گلے لپٹ گئے۔ اس معانقہ بازی کے بعد ملازم کو ناشتہ چائے کے لئے کہکر مزاج
رسی کے درمیان میں جو ان کی نظر اس لاوارث رکشا پر پڑی تو پوچھا۔ کیا اسی رکشا پر آئے ہو۔ پھر اسے روکے رکھنے سے کیا فائدہ
پنے آدمی سے کہا۔ اس رکشا قلی کو بُلا کر پیسے دیکر جانے کو کہو۔ میں نے کہا۔ اس کا قلی ہی ہوتا تو کاہیکو آج اتنی مصیبتوں کا
سامنا کرنا پڑتا۔ اس سلسلہ میں رکشا کے کُل واقعات از اوّل تا آخر کہہ ڈالے۔ اس پر دیر تک قہقہہ لگانے کے بعد انہوں نے
ہا۔ جو کچھ ہو۔ رکشا کا مضمون تو ہاتھ آگیا۔ ہوائی جہاز۔ ریل سکنڈ ہینڈ موٹر۔ ہاتھی۔ کرایہ کی ٹمٹم پر خامہ فرسائی کر ہی چکے۔
ب کی رہے تمہارے مضمون کا عنوان رکشا ——

(رامپوری)



ادیب جمیل حضرت شعلہ



محمد عمر شاداني



بلبل بهار جناب سردار ڪابري گياوي

رکشا والا

(از بلبل بہار حضرت سریہ کابری مینائی گیاوی)

دوپہر گرمی کی۔ لو کا وقت ہے جلتے ہیں پاؤں
جسم ہے ڈوبا پسینے میں نہ سایہ ہے نہ چھاؤں

ہاتھ میں رکشے کی ڈانڈی زرد صورت بدحواس
بھوک کی تکلیف سے سوکھا ہوا چہرہ اداس

مردنی چھائی ہے چلنا دو قدم دشوار ہے
اس پر اتنا بوجھ جس پر زندگی خود بار ہے

ضعف سے ابھری ہوئی ہیں ہڈیاں چرم استخواں
اک شبیہ ناتوانی جسم میں رگ رگ عیاں

سامنا اک اک قدم پر سیکڑوں آفات کا
پھولتی ہے سانس نقشہ عالم سکرات کا

پنڈلیاں سوجی ہوئی چھالوں سے چھالے پاؤں میں
کتنے چکر گردش قسمت نے ڈالے پاؤں میں

ہر قدم پر ڈگمگاتا تھرتھراتا کانپتا
گرتا پڑتا تلملاتا سانس لیتا ہانپتا

ٹھوکریں کھا کھا کے گرپڑتا ہے سائے کی طرح
دوڑتا جاتا ہے لیکن چارپائے کی طرح

ٹھیس لگ جاتی ہے تو اک چوٹ کھا جاتا ہے دل
ڈبڈبا جاتی ہیں آنکھیں تلملا جاتا ہے دل

اتنی محنت اور اس پر فاقہ مستی سے نڈھال
جھکتے جھکتے جھک گیا دھیمی ہوئی جاتی ہے چال

درد کی شدت سے مشکل دونوں ہاتھوں کا سکوڑ
تن گیا ہے بند بند اکڑا ہوا ہے۔ جوڑ جوڑ

نیل چھالوں کی طرح اک اک ہتھیلی میں پڑے
کھنچتا جاتا ہے تہ در تہ پسینے چیتھڑے

چلتے چلتے کیوں نہ فرطِ لاغری سے ڈگمگائے
پیٹ بھر خود کھائے تو کیا بال بچوں کو کھلائے

چند لمحوں کے لئے گویا غلامِ زر خرید
یہ مشقت اور اس پر چار پیسوں کی امید

آبلے تلووں کے کہتے ہیں سنبھلنے کے لئے
پیٹ کی تکلیف دق کرتی ہے چلنے کے لئے

ہو گئی انسان کی حیواں سے بدتر زندگی
مفلسی میں آدمی رہتا نہیں ہے آدمی

کہہ دیا دل نے مرے صبر و سکوں کو خیرباد
دفعتاً آیا کسی کا مطلع برجستہ یاد

زندگی در گردنت افتاد باید زیستن
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

اولاد پیدا کرنے کی ترکیب

ایک ہندوستانی ڈاکٹر کا عجیب و غریب کمال

ہندوستان میں ایسے ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جن کے پاس سب کچھ ہے۔ مگر اُن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ اور وہ اولاد کے لئے ہزاروں جتن کرتے ہیں۔ مگر ناکامی ہوتی ہے۔ اس ضرورت کو سائنس والے سالہا سال سے محسوس کر رہے تھے۔ اور اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح کوئی ایسی ایجاد کی جائے جس کے ذریعے انسان اولاد کی پیدائش پر قابو پاسکے۔ چنانچہ برسوں کی لگاتار کوشش اور تجربے کے بعد آخر کار سائنس نے ایک کروٹ بدلی اور ان لوگوں کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ سائنس کا یہ زندہ کارنامہ کئی سال سے تجربہ کیا جارہا ہے اور ہر جگہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اولاد پیدا کرنے کی ترکیب

سائنس کے اصولوں پر ایک خاص دوا تیار ہوئی ہے ہندوستانی زبان میں اس دوا کا نام محافظ اولاد ہے اور یہ میں عجیب اثر یہ ہے کہ یہ دوا مسلسل سات رات تک عورت کو کھلائی جاتی ہے ان سات دن میں وہ مرد سے بالکل علیحدہ رہتی ہے۔ ٹھیک آٹھویں رات عورت مرد اس پرہیز کو توڑ دیتے ہیں (یعنی عورت مرد ایک جگہ ہوتے ہیں) تو اسی رات حمل رہ جاتا ہے۔ اور ٹھیک نو مہینے بعد ایک جیتا جاگتا بچہ عورت کی گود میں ہوتا ہے۔ تجربہ کے دوران میں بھی اس عجیب دوا کی بدولت ہزارہا عورتوں کے ہاں اولاد ہونی شروع ہوگئی ایجاد کرنے والے کو اپنی اس ایجاد پر بڑا فخر ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس نے دُنیا کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ لہٰذا اس اعلان کے ذریعہ اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ اگر کسی عورت کے ہاں اولاد نہ ہوتی ہو تو اسے چاہیئے کہ مسلسل سات رات تک "محافظ اولاد" کی ایک ایک خوراک استعمال کرے اور ان سات دنوں تک مرد سے بالکل علیحدہ رہے اور ٹھیک آٹھویں رات یہ پرہیز توڑ دے تو نو مہینے بعد اس کی آرزو پوری ہوجائے گی اور اس کی گود میں یقیناً بچہ ہوگا۔ محافظ اولاد کی ایک شیشی میں ایک عورت کے لئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے اور اس شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے جسے ضرورت ہو

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ ایس۔ آر۔ بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی۔ پی پارسل منگانے سے سات آنے محصول لگتا ہے۔

فردوسی اور اسدی

از جناب محمد طاہر رضوی پروفیسر پریسیڈنسی کالج۔ کلکتہ

فردوسی اور اس کے شاہنامہ کی تدوین کے سلسلہ میں بلاشبہ اب تک مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے دلچسپی لی۔ اور اپنی تازہ بہ تازہ تحقیق سے شائقین علم و ادب کو روشناس کیا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ فردوسی کی وفات سے لیکر اس وقت تک یعنی ہزار سال کی مدت میں شاہنامہ اور اس کے ناظم کے متعلق چند مستقل باتیں جو محض غلط فہمی کی بنا پر لوگوں کے دماغ میں جگہ پا چکی تھیں۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہی رہیں۔ اور محققین کی جماعت قطعی طور پران غلط فہمیوں کے دور کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ ذیل کے مقالہ میں ہم اپنے ناظرین کی توجہ ایک ایسے امر کی جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں جو فردوسی اور اس کے کارنامہ کے متعلق ایک عام عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے اور جس کے قائل تقریباً مشرق و مغرب کے سارے محققین خود ہی ہیں۔

فردوسی کی وفات کے بعد سے آجتک یہ خیال لوگوں کے درمیان بالعموم پھیلا ہوا ہے کہ اسدی طوسی (جس کا مختصر تذکرہ ہم بعد میں کرینگے) اپنے ہم شہری فردوسی کا اُستاد تھا۔ اور نیز یہ کہ شاہنامہ کے آخری چار ہزار ابیات اور داستان حملۂ عرب کو فردوسی کی خواہش پر ایک بہت ہی قلیل مدت میں اسدی نے نظم کیا تھا۔ اور جو بعد میں فردوسی ہی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ تذکرۂ دولتشاہی کو پیش نظر رکھکر مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم میں اس کے متعلق ایک بڑی لمبی داستان بھی تحریر فرمائی ہے۔ خوش عقیدہ مستشرقین نے تو اس سلسلہ میں یہاں تک ستم ظریفی کی ہے کہ ایک ہی شخصیت یعنی اسدی طوسی مصنف لغات الفردوس اور ناظم گرشاسپ نامہ و قصائدِ مناظرہ کو دو ناموں کے ساتھ پیش کر کے ایک ہی کی تصنیفات دو ہستیوں سے منسوب فرما دیا۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس مقام پر زمانہ موجودہ کے ایک مایہ ناز ایرانی ادیب آقائی بدیع الزمان خراسانی کی مشہور عالم تصنیف "سخن و سخنوران" کی مدد سے اسدی کے متعلق کچھ بیان کر کے مذکورہ بالا غلط فہمی کے وجود میں آنے کا سبب تحریر کریں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس موضوع کو تحقیق کی روشنی میں ایک تفصیلی بحث کے اندر لائیں ——— ابونصر علی بن احمد اسدی طوسی ناظم شاہنامہ کا ہموطن اور تقریباً ہمعصر تھا۔ فردوسی کی طرح اس نے بھی گرشاسپ نامہ جیسی ایک بلند پایہ رزمیہ مثنوی نو دس ہزار اشعار میں لکھکر اپنے نام کو بقائے دوام بخشا ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے

ز ہر گونہ دلہے فگندند بن	پس آنگہ گشادند بندِ سخن
کہ فردوسی طوسی پاک مغز	بداد ہاست داد سخن ہائے نغز
بہ شہنامہ گیتی بیاراستہ است	بدان نامہ نام نکو خواستہ است
تو ہمشہریِ او و را ہم پیشہ ای	ہم اندر سخن چابک اندیشہ ای
بدان بہرہ از نامۂ باستان	بنظم آر خرم یکی داستان

اسدی کا یہ کمال کچھ کم نہیں کہ شاہنامۂ فردوسی کے طرز پر اُسنے قدیم تاریخ ایران کے ایک ایسے حصہ کو گرشاسپ نامہ کی شکل میں نظم کیا جسے فردوسی کے قلم نے عمداً یا سہواً چھوڑ رکھا تھا۔ یہ مثنوی امیر ابودلف حکمران نخجوان اور اس کے وزیر کے اشارہ پر چند سال کی مدت میں لکھی گئی۔ جس کا کہ خود اسدی طرح ذکر کرتا ہے ؎

همی بد سر جود و بنیاد دین	گرانمایه دستور شاه زمین
محمد مه جود چرخ هنر	سماعیل حسنی مرادرا پدر
برادرش والا ابراهیم راد	گزین جهان گرد مهتر نژاد
بگماز یکروز نزدیک خویش	مرا بر ده مهتر نشاند ز پیش
بسی یاد نام نکو مانده شد	بسی دفتر باستان خوانده شد

× × × × × × × × × × × × × × ×

× × × × × × × × × × × × × × ×

دبیری آورد دمی من پیام	گذین دو جدا او وی نیکنام
که گوید همی شاه فرهنگ جوی	بنام من این نامه را باز گوی

اصل میں داستانِ گرشاسپ نثر میں موجود تھی۔ جس کا مصنف چوتھی صدی ہجری کا مشہور شاعر ابوالمؤید بلخی تھا۔ اسدی نے اسی کو نظم کا جامہ پہنایا۔ اور ۴۵۸ھ ہجری یعنی شاہنامۂ فردوسی سے پورے اٹھاون برس بعد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

بعض تذکرہ نویسوں نے فردوسی اور اسدی کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ جہاں تک بلاغت کا تعلق ہے اسدی کو ناظم شاہنامہ پر ترجیح ہے۔ آئندہ جاکر ناظرین شاہنامہ کو اندازہ ہو جائیگا کہ اسی خام خیالی نے ایک وقت میں اسدی کو فردوسی کا اُستاد تک بنا دیا۔ ہم اس پر بعد میں بحث کرینگے۔ مگر اس جگہ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ فصاحت و بلاغت کے سلسلہ میں اسدی تو خیر ایران کا کوئی شاعر بھی دور سے آخر تک فردوسی پر ترجیح بھی پا سکتا۔ بقول ابن الاثیر شاہنامہ "قرآن العجم" ہے اور اس کا ناظم شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کے خیال میں "خدائے سخن" تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ فردوسی کا اصل مقصد نظم شاہنامہ سے ایرانی قومیت اور فارسی زبان کا زندہ کرنا تھا۔ اس کے برعکس اسدی نے اپنے گرشاسپ نامہ میں محض داستان سرائی بطور احسن کرنے کی سعی کی ہے۔ ہاں مبالغہ کا بادشاہ تھا۔ اور اگر یہی معیار کمال شاعری کا ہو تو اُسے فردوسی پر یقیناً ترجیح دی جاسکیگی۔ اسدی نے اپنی مثنوی میں بیشمار غیر مانوس اور ناشنیدہ الفاظ و محاورات کا استعمال کیا ہے جو خود اس کے زمانہ میں متروک ہو چکے تھے۔ برخلاف اس کے فردوسی کے شاہنامہ میں اس طرح کا سقم کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملسکتا۔

اسدی کا دوسرا کارنامہ لغات الفرس کی تالیف ہے۔ جس میں اُس نے فارسی الفاظ کی تشریح کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے اشعار بطور مثال جمع کئے ہیں۔ گرشاسپ نامہ اور لغات الفرس کے دیکھنے سے تو ظاہر ہے کہ ان کا مصنف فردوسی کا اُستاد ہو نہیں سکتا کیونکہ اول الذکر مثنوی میں وہ خود ہی فردوسی کا تذکرہ اپنے پیشرو کی حیثیت سے کرتا ہے۔ اور اپنی لغات میں فردوسی کے شاہنامہ سے جگہ جگہ اشعار بطور مثال پیش کرتا ہے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہو سکتی ہے وہ اسی قدر کہ دونوں تقریباً ہمعصر تھے۔ اب رہا تمیز

مثنوی بالشان کا م جس نے اسدی کے نام کو بلند کیا اور جس کے سبب محققین بھی مغالطہ میں پڑے ۔ وہ اس کے چار مشہور معروف قصائد مناظرہ کا اُس کے قلم سے تکمیل پانا ہے اور بلاشبہ فارسی شاعری میں اس طرح کی نظم کا موجد اسدی کے سوا اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا ۔ ان چاروں قصائد کی تفصیل یہ ہے :-

مناظرۂ آسمان و زمین ۔ مناظرۂ مغ و مسلمان ۔ مناظرۂ نیزہ و کمان اور مناظرۂ شب و روز ۔ چنانچہ ان کی باہمی بحثوں سے اسدی نے حقیقتاً اپنے کمالِ شاعری کا ثبوت دیا ہے

مستشرقین نے دولت شاہ سمرقندی جیسے چند غیر ذمہ دار تذکرہ نویسوں کی روایت کا اعتبار کر کے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اسدی نام کا ایک شاعر واقعی فردوسی کا اُستاد تھا ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھکر کے کہ اسدی مصنف لغات الفرس اور ناظم گرشاسپ نامہ تو اس کی خود اپنی تحریروں کی بنا پر اُستادِ فردوسی ہو نہیں سکتا ۔ اپنی نئی تحقیق پیش کیا کہ قصائدِ مناظرہ لکھنے والا احمد بن منصور اسدی طوسی پدرِ ابونصر علی بن احمد اسدی مصنف لغات الفرس و ناظم گرشاسپ نامہ تھا ۔

یہاں پر محققین سے ایک عجیب فروگذاشت ہوئی ۔ قصائدِ مناظرہ کے مصنف نے اپنے قصیدۂ نیزہ و کمان کو امیر شجاع الدولہ منوچہر ابن شاور شدادی حکمران آنی کے نام سے معنون کیا ہے ۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

نامور میر اجل والا منوچہر اصل ملک   تاجِ شاہان، شجاعِ دولت و فخرِ تبار
خسروا از خدمت بندہ نیامد سر لیک   دیر شد تا دور م از ما و ای دیار دمگسار
لالہ بودم روی و قیر این موی لیکن گشت چرخ   زیر خیری لالہ ام بنہفت و زیر برف قار

امیر منوچہر ۴۵۶ھ ہجری میں اپنے باپ کی طرف سے آنی کا حکمر مقرر ہو کر آیا اور تقریباً بتیس سال تک فرمانروائی کی ۔ ظاہری شہادت کا خاطر رکھتے ہوئے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اسدی نے آنی کا سفر اختیار کیا تھا ۔ اور یہیں پر اُس نے اپنا قصیدۂ مناظرۂ نیزہ و کمان نظم کر کے میر منوچہر کی خدمت میں پیش کیا ۔ اور اُس سے صلہ کا خواستگار ہوا ۔ اب گرشاسپ نامۂ اسدی کی تاریخ تکمیل یعنی ۴۵۸ھ ہجری کو پیشِ نظر رکھکر امیر شجاع الدولہ منوچہر کے دورِ حکومت آنی (سنہ ۴۵۶ھ لغایت سنہ ۴۸۶ھ) کو دیکھا جائے تو صاف پتہ چلجائیگا کہ جس اسدی کے نام گرشاسپ نامہ منسوب ہے وہی قصائدِ مناظرہ کا بھی مصنف ہے ۔ اس کے علاوہ مثنوی گرشاسپ نامہ اور قصائدِ مناظرہ کے ادبیات کا مقابلہ کیا جائے تو ایک ہی قسم کی تشبیہات کا استعمال ایک قطعی ثبوت پیدا کر دے گا کہ دونوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے ۔ مثلاً

زمین است چون مادرِ مہر جوی   ہمہ رستنی ہا چو پستان بروی
بچہ گونہ گون خلق چندین ہزار   کشان پرورانده ہمی در کنار   (گرشاسپ نامہ)

بچو مادر سیت زمین مر ورا چو پستانِ نبت   چو بچہ جانوران اور گرفتہ شان بکنار   (مناظرہ)

ہمو عرصہ گاہیست شیب فراز   معلق بجا بنانش گسترده باز
بچو جائے نماز است گفتہ است لیست   ہمہ در نماز از برش ہر چہ ہست

انڈراست مردم دو تا چارپائی نگون رستنی کہ نشستہ بجائی (گرشاسپ نامہ)

نمی است از پئ خلقان یکی بساطِ بسیط میانِ چرخِ معلق بقدرتِ جبار
زمین نماز گہی شد کہ بینی از ہر او ہمہ جہان بہ نمازِ خدا و استغفار
بہائمان برکوعند و آدمی بقیام نشستہ کہ بہ تشہد بسجدہ در اشجار (مناظرہ)

ہمو قبلۂ ہر فرشتہ است راست بدان کز گلشن بود آدم چو خاست (گرشاسپ نامہ)

ز بہست قبلہ کہ از معنی گِل آدم فرشتگانش بدہ ساجد انبیاز وار (مناظرہ)

گر آتش بہ آمد بر مغ چہ باک از آتش بد ابلیس و آدم ز خاک
ببین زین دو تن بہ کدامین کس است ہمازین دو بہتر نشان این بس است
ز آتشِ ابلیس آدم ہم از زمین دراصل نگر کزین دو کہ بہ ایزد آن ہمانگار مناظرہ

" اب ہم اپنے اس مختصر مقالہ کو آقائی بدیع الزمان خراسانی کی تالیفِ لطیف سے چند سطور متعلق بہ اسدی و فردوسی نقل کرتے ہوئے ختم کیا چاہتے ہیں ۔ اور اسدی طوسی کے استادِ فردوسی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ سابقین علم و ادب کی مزید تحقیقات پر چھوڑتے ہیں ۔ آقائے موصوف فرماتے ہیں :۔

واشتباہِ بعضی تذکرہ نویسان کہ اسدی را اُستادِ فردوسی گفتہ اند ممکن است کہ از این جہت رخ دادہ کہ از منتصبی شنیدہ یا در نوشتہ ہان او دیدہ اند کہ اسدی استادِ فردوسی یعنی برتر و بمنزلۂ استاد است و آنان بی تامل جواب و نظر در تواریخ این عبارت را بمعنی حقیقی پنداشتہ و بغلط رفتہ اند ۔ گذشتہ از این کہ قدمای تذکرہ نویسان و مورخین با اہمیتِ مطلب ابداً معترض ذکر آن نشدہ اند و اُستادی اسدی نسبت و فردوسی نغمۂ ناراستی است کہ از سازِ دولت شاہ برآمدہ است حتیٰ نظامی عروضی دعوی گویا اسدی را نمی شناختہ و بدین جہت از وی نام نبردہ اند "

سعیٔ خام!

(از جناب سعید احمد اعجاز)

چاندنی کے ساز پر   ہے محبّت نغمہ گر
میرے دل کا اہتزاز   بن گیا ہے روحِ ساز!
راگنی کو لے کے دُور   جا رہی ہے موجِ نُور
بھیجتا ہوں تیرے نام
موجِ نسیمیں پر پیام
آہ لیکن سعیٔ خام!

جس طرح بچہ کوئی   ناؤ اپنی کاغذی
آب جو میں چھوڑ دے   اور توقع یہ کرے
ناؤ اُس کی جائے گی   اور کھلونے لائے گی
مادرِ مرحوم سے   شہرِ نامعلوم سے

پھر کنارِ جوئبار   وہ سراپا انتظار
کشتیوں کو دُور سے   دُور سے آتے ہوئے
دیکھتا ہو تا بہ شام

قطعہ

مستمندانہ بادشاہی ہے — خاکسارانہ کجکلاہی ہے
حال کا غم نہ خوف مستقبل — صبر و تسلیم و مست حالی ہے
بغض و کینہ و رشک و آز نہیں — راستی کی زبان عادی ہے
ہمت و سعی و شرم و خود داری — سیر چشمی و بردباری ہے
منصفی و خلوص و حسن پسند — سینہ آئینۂ الٰہی ہے
دامن دل اغدار پاک و صاف — فیض جام طہور ساقی ہے
او ستادانہ درد مندانہ — سعی کسب معاش جاری ہے
حسب حاجت فلوس و سیم و زر — ہم پہ بس سی جیب خالی ہے
مادر ہستیں سے سہیم — نوشدارو ئے آسمانی ہے
خاص ہیں غیر ہیں خود ہیں — چند سے لطف زندگانی ہے
گھر کے اندر سکون کی دنیا — جنت ارضی و سماوی ہے
دل دفینہ ہزار حسرت کا — فکر گنجینۂ معانی ہے
فارسی کا دقیق شاعر تھا — دسترس فلسفہ میں کافی ہے
ابتلا انقلاب ہنگامہ — پردۂ راز در بیانی ہے
پیر تعلیم ذوق شوق خلش — فضل پروردگار شافی ہے
مصلحت راز نکتہ باریک — فرط ارزانی و گرانی ہے
خود فراموش کسمپرس اختر — جام جم خاک کیمیائی ہے

نگراں :- اختر حسن ہومیوپیتھ ، ایم اے ، بی ، ال ، ایم ، ڈی ، ایچ

باغی ادیب کا خط

جناب "مش" مظفرپوری

روح نواز شبلی!

تمہاری ناراضگی میرے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔ تمہاری بے اعتنائیوں نے میرے نازک محسوسات کو جو ٹھیس پہونچائی ہے اس کی شدید اذیتوں کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں تم کیوں ناراض ہو گئے ہو۔ مگر میرے عزیز دوست! اب میری طبیعت میں وہ پہلی سی رنگینی اور رومانیت باقی نہیں رہی۔ اب وہ جذبہ مٹ چکا ہے۔ جس کے ماتحت میں تمہیں دلچسپ اور طویل خطوط لکھا کرتا تھا۔ پہلے ہر آواز میرے لئے ایک نغمہ ایک موسیقی تھی لیکن اب ہر قدم پر یتیموں کی آہیں۔ بیواؤں کی سسکیاں اور دم توڑتے ہوئے انسانوں کی چیخیں، میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں۔ ہر جگہ مصیبت و افلاس کی لاشیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہر طرف موت کا اژدھا منہ پھاڑے ہوئے حیات سوز زہر اگل رہا ہے حسن چیتھڑوں میں لپٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔ جوانی گندگیوں میں لوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے —— آہ! یہ جگر خراش نظارے میرے دکھے ہوئے دل کے رستے ہوئے زخم پر نمک پاشی کرتے ہیں —— رگوں میں خون کھولنے لگتا ہے۔ مگر شبلی! ہم کتنے مجبور ہیں۔ دل دکھتا ہے۔ مگر زبان سے آہ نہیں کر سکتے۔ دبائی ہوئی آہوں کی پیہم سوزش سے دل سلگتا رہتا ہے۔

بعض رسائل میں میرے رنگین و رومانی —— بلکہ کسی حد تک عریاں اور فحش افسانے پڑھکر تم ضرور تعجب کرتے ہو گے کہ میری ذہنیت اور تحریر میں کتنا فرق ہے۔ مگر تم میری گھناؤنی مجبوریوں سے واقف نہیں ہو۔ کیا بتاؤں کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔ اس پست اور سوقیانہ طرز سے خود مجھے نفرت ہے۔ اور یہ رویہ میں نے عارضی طور پر اپنے ضمیر کو کچل کر اختیار کیا ہے یہ سرپھرے طبقہ والے میری خوب تعریف کرتے ہیں —— خدا ان ننگ قوم نوجوانوں میں ترقی پسند ادب کا ذوق پیدا کرے۔ یقین جانو شبلی کہ میرے ان افسانوں کا پلاٹ مشاہدات نہیں بلکہ مصنوعات پر مبنی ہے۔ ورنہ میرے مشاہدات تو اتنے المیہ اور دردناک ہوتے ہیں کہ میرے آتشین عزائم شعلوں کی مانند بھڑک اٹھتے ہیں۔

چند مہینوں سے طبیعت بہت اداس ہے۔ چند روز ہوئے ایک ایسا سنگین مشاہدہ ہوا ہے جو ہمیشہ کیلئے میری لوح دل پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا ہے۔ یقیناً یہ مشاہدہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نیا نہیں مگر موجودہ نظام کے سنگین عبرت کا ایک زبردست نمونہ ضرور ہے۔ ایسے واقعات آئے دن ہماری نظروں کے سامنے ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں۔ مگر ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان واقعات سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ میں تو اس معاملہ میں بعض انقلاب پسند ادیبوں کی طرف سے بھی شاکی ہوں

اپنا سارا دن تو شورانگیز ماحول میں گزرتا ہے۔ مگر شام ہوتے ہی کسب سکون کیلئے ساحل دریا کیطرف نکل جاتا ہوں حسب معمول آرمینی گھاٹ اور ایڈن گارڈن کی سیر کر کے واپس ہو رہا تھا۔ رات نے دن کی روشنی کو اپنے تاریکی میں سمیٹ لیا تھا۔ البتہ باغ کی روشن

سڑک کے دونوں کناروں پر جابجا گیس بتیاں جگمگا رہی تھیں ۔ ایک دبلا پتلا آدمی میرے سامنے سے آرہا تھا۔ اس کے شانے کمان کی طرح خم کھا کر جھکے ہوئے تھے ۔ کمزور اس قدر کہ ہر قدم ہانپ کر اٹھا رہا تھا۔ وہ چل کیا رہا تھا رینگ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھکر میری تمام توجہ اسکی طرف مبذول ہو گئی ۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ پھر قریب پہونچتے ہی وہ کھانسنے لگا۔ اس کے کھانسنے کی آواز اتنی دلخراش تھی گویا اس کا کلیجہ کٹ کر گر جائے گا۔ ہر لحظہ اسکی کھانسی کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے گیس بتی کا کھمبا پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے کلیجہ تھام کر کھانسنے لگا۔ کھانسی نہ تھمی پر نہ تھمی ۔ اور وہ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔

میں اس کے پاس کھڑا تھا۔ کھانسی رکتے ہی پھولتے ہوئے سانسوں کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے پانی بہہ نکلے تھے۔ اس کے سیاہی مائل یاس انگیز چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی ۔ دھنسی ہوئی بے رونق آنکھوں میں ایک خاموش التجا تھی ۔ ایک دبی ہوئی پکار تھی۔ ہونٹ پیپل کی سوکھی ہوئی بیجان پتیوں کی طرح کانپ رہے تھے ۔ اس کے ہونٹوں کی لرزش میں ایک درد بھری فریاد تڑپ تڑپ کر ڈوب جا رہی تھی۔ گیس کی روشنی میں اس کے بے ترتیب بالوں پر جمے ہوئے گرد و غبار صاف نظر آرہے تھے۔ لباس کی بوسیدگی عریاں ہو رہی تھی۔ جسم اور جان کے مابین کشمکش جاری تھی۔ جسم زندگی کی گرفت سے نکل کر نجات حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مگر زندگی اس سے چمٹی ہوئی تھی ——— ——— موت اس سے پرے ، سرمایہ داری کے عفریت سے ہمکنار یہ تماشہ دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

شبلی کاش تم محسوس کر سکتے کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی ۔ شدت احساس سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔

اس نے سر سے پاؤں تک مجھے بغور دیکھا اور اس کی نگاہیں میرے چمکتے ہوئے جوتے پر جم کر رہ گئیں ۔ نفرت و حقارت کی چند دھندلی شکنیں ایک لمحہ کیلئے اس کی پیشانی پر ابھریں اور مٹ کر رہ گئیں۔ نہ جانے اس نے مجھے کیا سمجھا۔

آپ بہت کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ شاید کوئی بہت پرانا مرض ہے آپکو" میں نے ہمدردی کے لہجہ میں اسکو مخاطب کر کے کہا۔

اس نے سر اٹھا کر میرے چہرے کو دیکھا۔ نفرت اور طنز کے مبہم تبسم کی نمو اس کے زرد ہونٹوں پر پھیلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اُف! اس کا چہرہ کتنا خشک اور بے رونق تھا! ——— ——— یقین جانو شبلی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تازہ اور گرم لہو کی ایک بوند بھی اسکے جسم میں موجود نہ تھی ——— آہ! بیچارا مدقوق انسان! وہ اکھڑی ہوئی کمزور آواز میں بولا" جس کے جسم کے لہو کی ایک ایک بوند انسانیت کے درندوں نے چوس لیا ہو وہ کمزور نہیں تو کیا رستم بنے گا۔

اس کا ایک ایک لفظ میرے دل میں کانٹا بنکر چبھ گیا ہے۔ اس کے ہر لفظ سے روداد غم کا خون ٹپک رہا تھا۔ اسکی مظلومیت اور بیکسی کو بے نقاب کر رہا تھا۔ اس کے طرز گفتگو سے اس کے تعلیمیافتہ ہونے کا پتہ مل رہا تھا۔ وہ ایک بار کھانسنے کے بعد وہ پھر بولا۔ تم تو دوسری دنیا کے باشندے معلوم ہوتے ہو شاید یہاں کا طور طریقہ ابھی تمہیں معلوم نہیں ۔ ہم مدقوق ہیں۔ اس دنیا والے ہم سے بات کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں دیکھکر ان کو گھن آتی ہے اور اندر ہی اندر ان کا دم گھٹنے لگتا ہے کہ کہیں ہمارا روگ ان کو نہ لگ جائے"

یہ کہہ کر وہ دو تین بار پیہم کوششوں کے بعد لڑکھڑا لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا۔

بیکسی اور مظلومیت کی زندہ لاش کو دیکھکر میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ دل سینے میں بیٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بیدرد زمانہ کے زہر آلود نشتروں سے زخمی ہستی سسک سسک کر مفلسی کے دامن میں منہ چھپا رہی تھی۔ سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کی چٹان تلے زندگی

اور انسانیت کچلی جا رہی تھی ——— سامراج کا شیطان مغرور ہو کر قہقہہ لگا رہا تھا۔ انسانیت کا فرشتہ بلبلا رہا تھا ——— ظلم اور مظلومیت کا دلخراش تصادم! نہ جانے ایسی کتنی ہی ہستیاں سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں مجروح پرندے کی مانند پھڑپھڑا کر دم توڑ دیتی ہیں۔ دنیا ہی میں جہنمی عذابوں کا مشاہدہ کر لیتی ہیں۔

"آپ ہسپتال میں کیوں نہیں داخل ہو گئے۔؟"

"یہ ہسپتال ہمارے لئے نہیں بنائے جاتے۔ ایک ہسپتال ہی پر کیا منحصر ہے۔ دنیا میں ہمارے لئے کوئی بھی جگہ نہیں"

"سرد ہوا آپکے لئے بہت مضر ہے اسطرح رات کو کیوں چکر کاٹ رہے ہیں؟"

"تمہارے ڈاکٹروں نے تازہ اور اچھی ہوا میں گھومنے کی تاکید کی ہے اسی بہانے میں موت کو ڈھونڈتا رہتا ہوں"

اسے پھر کھانسی شروع ہو گئی، اور کھانستے کھانستے پھر بیٹھ گیا۔

"آپکے متعلق میں کچھ جان سکتا ہوں؟"

"کیا اس قدر جان لینا کافی نہیں کہ میں صفحۂ ہستی پر رینگنے والا ایک انسان ——— نہیں کیڑا ہوں"

"آپکی زبان سے ایسی باتیں سنکر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے"

"ہا ہا ہا" وہ ایک کمزور ہنسی ہنسکر کہنے لگا "کیا تم میرا مذاق اڑانے کیلئے آئے ہو ——— ہونہہ! دکھ اور تم امیر لوگ!"

"آپکی تعلیم کے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں"

"تمہاری یونیورسٹیوں کی تمام ڈگریاں میں نے حاصل کر لی تھیں"

"مجھے اپنی کوئی خدمت کرنے کا موقع دیجئے"

"اب مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں۔ موت میرا آخری علاج ہے"

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پکارا مگر وہ جاتا رہا ——— میں ہر روز ایڈن گارڈن میں اس کو ڈھونڈتا ہوں۔ مگر نہ جانے وہ کہاں چلا گیا۔

کاش! تم چاندی کے ٹکڑوں کی خاطر ضمیر فروش نہ بنتے! ———

تمہارا "ش م"

دل کی نماز

——— از جناب بہزادِ فاطمی بی اے (آنرز)

دل کی زاہد نماز کیا جانے
غم پرستی کا راز کیا جانے

زخمِ بسمل کا ذوقِ بیتابی
شورشِ امتیاز کیا جانے

عشق تیرے کے دم سے لطفِ محفل ہے
حسن خود بیں یہ راز کیا جانے

دل کا آئینہ توڑنے والا
سعیِ آئینہ ساز کیا جانے

بُت پرستی بھی حق پرستی ہے
کعبۂ امتیاز کیا جانے

کس لئے جھک گئی جبیں اپنی
سنگِ درگاہ ناز کیا جانے

کسکی کسکی تڑپ کے گزری شب
وہ غمِ جاں گداز کیا جانے

کیا گزرتی ہے خرمن دل پر
شعلۂ برقِ ناز کیا جانے

حق پرستی کو میری اے بہزاد
یہ طلسمِ مجاز کیا جانے

شرابِ کہنہ

حضرت مولانا شاہ نور الحق ابدال پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ استاد حضرت فرد پھلواروی و راسخ عظیم آبادی

جب سے گریہ اپنی آنکھوں کا سہارا ہو گیا
اشک کا قطرہ جو تھا آنکھوں کا تارا ہو گیا

دل مرا میری نہیں کہتا تو پھر میرا نہیں
جب تمہارا ہی یہ گاتا ہے، تمہارا ہو گیا

اب اجل آئی بھی تو کیا کر نہیں سکتی ہے کچھ
ہم نے دیکھا اُنکی آنکھوں کا اشارا ہو گیا

طور ہی بھی تھا کوئی بڑھکے دلِ مضطر مرا؟
اک تجلّی سی ہوئی اور پارا پارا ہو گیا

سختی ہی سختی ہے قسمت میں تو پھر نرمی کہاں
موم آیا ہاتھ میں اور سنگ خارا ہو گیا

جو گرا بحرِ حوادث میں تمہارا لیکے نام
اُس کو ہر گردابِ دریا کا کنارا ہو گیا

آکے بالینِ تپاںؔ پر کہہ رہی ہیں وقتِ نزع
لو شہیدِ عشق اب یہ بھی بچارا ہو گیا

مرسلہ :- تمنا عمادی مجیبی غفرلہ حفید المحضید حضرت تپاںؒ

"نغمۂ نو" میری نظر میں

ایک تنقیدی مقالہ

از جناب عطاء اللہ۔ پالوی

ہر زمانہ، ہر ملک اور ہر قوم کا ادب اُس زمانہ، اس ملک اور اس قوم کی مکمل تصویر، تشریح اور مکمل تفسیر ہوا کرتا ہے۔ اس وقت بھی جس ملک اور جس قوم کا جدید ادب دیکھئے فضا کے مطابق وقت کے مناسب اور ماحول کے موافق نظر آئے گا۔ لیکن ہمارا ادب ایسا انوکھا ادب ہے کہ اس دورِ قیامت میں بھی اس ہنگام غلامی میں بھی اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہٹا ہے۔ ہمارے یہاں اب تک بھی ہر سال جو کچھ ادب پیش کیا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ محض عہد قدیم کی یادگار اور تقویم پارینہ کا نمونہ نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اس دورِ غلامی میں بھی ہمارے ادب کا ایک معتدبہ حصہ ایسا پیش ہوتا ہے جس میں جوش، ولولہ، مردانگی اور ہمت کے کس بل کا کہیں نام نہیں آتا۔ غور فرمائیے ایک تو ہندوستان پہلے ہی سے بزدلی و کم ہمتی کا شکار، تو اس پر ہمارے شعراء کا یہ ہنگامۂ نالہ و شیون۔ ایک تو ہندوستانی از حد کمزور دل اور پست ہمت ہو رہے ہیں۔ اس پر ہمارے شعراء کا یہ بالاستیعاب درد آہ و فغاں۔ بھلا ایسی صورت میں کیا امید کی جائے کہ ہندوستانیوں میں جان آئیگی؟ اور کیسے توقع ہو کہ ہندوستان آزاد ہو سکے گا؟ "ادب برائے ادب" اسی وقت کے لئے ہے۔ جب دل مسرور ہو، دماغ مطمئن ہو۔ فی زمانہ اور آجکل جبکہ دل اور دماغ دونوں ایک ہیجان میں مبتلا ہیں۔ "ادب برائے زندگی" ہونا چاہیئے۔ مگر اس کا احساس نہیں ہے۔

ہمارے ہندوستان "جنت نشان" کا اس وقت بھی ہر شاعر دعویدار عشق و محبت ہے۔ جس شاعر کے کلام کا نیا مجموعہ اس امید کے ساتھ ہاتھ میں لے لیجئے کہ شاید اس نے کوئی ایسی چیز پیش کی ہو جو موجودہ دور میں ہندوستانیوں کے لئے کچھ مفید ہو۔ شاید کچھ ایسا جذبہ پیش کیا ہو جو آزادی کی راہ میں دوڑنے والوں کے لئے صوتِ رحیل ثابت ہو۔ آپ کو مایوسی ہوگی اور آپ کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ہاتھ سے پھینک دینگے۔ کیونکہ جس شاعر کو دیکھئے گا وہ عشق کی آگ میں جلتا، محبت کا مارا اور محبوب کا ستایا نظر آئے گا۔ ہمارا ہر شاعر صرف عشق و محبت کی راگ الاپتا اور اپنی ناکامیوں، نامرادیوں کا مظہر نظر آئے گا۔ ہم حیران ہیں کہ ہندوستان میں عشق و محبت کی اتنی بہتات کیوں ہے؟ ہمارے یہاں اتنے عاشق کیسے اور کہاں سے پیدا ہو گئے۔ اور پھر عشق بھی ایسا ہے اور عاشق بھی ایسے ہیں کہ معشوق کا نہ پتہ ہے نہ نشان۔ نہ نام ہے نہ مقام۔ وجہ پوچھئے تو بتائیں گے کہ معشوق کو خوف رسوائی دامنگیر ہے:

دہروالوں یوں تو رہتے ہیں مرے خاموش لب ۔۔۔ جب وہ کہتے ہیں تو پھر مجبور ہو جاتا ہوں میں۔ (بہزاد)

خوب! کوئی ایسے عاشقوں کے معشوق سے پوچھے کہ:

مانع جلوہ گری خوف ہے رسوائی کا
بس اسی پر تمہیں دعویٰ ہے زلیخائی کا

نیز ہم ششدر ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ عاشقوں کی اس افراط کے باوجود آج تک کسی ایک بھی مایوس اور نامراد عاشق شاعر کے انجام کا دردناک

ڈوب کے جان دیدیتے۔ زہر کھاکے مرجاتے، گلے میں چھری بھونک کے نامرادیوں کا خاتمہ کر لیتے اور گلے میں پھانسی کا پھندا لگاکے رشتۂ حیات کو توڑ ڈالنے کا واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ نہ ہو سکا۔ بات یہ ہے کہ ایسا ہو تو کیونکر جب اس میں کوئی اہمیت ہی نہیں ہے؛ ایسا جذبہ یا ایسی ہمت پیدا ہو تو کہاں سے جبکہ عشق واقعی عشق ہے ہی نہیں ہے؛ یہاں عشق تو صرف ایک رسمی، کاغذی اور زبانی چیز ہے۔

"محبت" ایک ذاتی اور پرائیوٹ چیز تھی اس لئے چاہئے تو یہ تھا کہ اگر کسی سے کسی کو محبت ہوئی تو پہلے اُس نے کامیابی کی راہیں تلاش کیں۔ نہ ملی تو خاموشی کے ساتھ مایوس زندگی گذار دی یا جذبہ ناکامی حد سے زیادہ بڑھا تو خودکشی کر لی۔ یہ ایسی چیز نہ تھی جس کا ڈھول پیٹا جائے۔ یہ کوئی ایسا جذبہ نہ تھا کہ جس کا صور پھونکا جائے۔ نہ یہ کوئی ایسا کارنامہ تھا کہ جس سے کتابت و طباعت کے ذریعہ سارے ملک اور ساری قوم کو روشناس کرایا جائے۔ مگر یہاں حال تو یہ ہے کہ عشق ہو یا نہ ہو، شعر کہنا آگیا تو بس غضب ہو گیا۔ پہلے دس بیس جگہ اُس کا ڈھول پیٹا اور اسکے بعد اپنی محزون ملول انسانِ محبت کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ نہ تو ایسا عاشق کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھا۔ لوگ اُسے پڑھ کے کیا لطف محسوس کریں گے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ادب میں اُس کا بہت بڑا ذخیرہ پہلے سے موجود بھی ہے؛ اس ادب سے لوگ کیا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ نہ یہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی رہبری نہیں کر سکتا۔ پھر ایسا ادب کس کام کا ہے۔؟ کس مصرف کا ہے۔؟ ایسے ادب کے پیش کرنے کا حاصل کیا ہے؟

چند دن ہوئے یونیورسٹی لائبریری میں "نغمۂ نور" کے پُرسرور نام سے بہزادؔ لکھنوی کے کلام کا مجموعہ نظر پڑا۔ دیکھتے ہی آنکھ، دل اور دماغ پر "نغمہ" اور "نور" کے وجد آفرین تصور کا ایک خاص اثر ہوا۔ ایک حوصلہ افزا امید کے ساتھ میں نے کتاب ہاتھ میں لی۔ نام کو دیکھکے یہ خیال ہوا تھا کہ کتاب بلند خیالی کی حامل نہ سہی، وقت اور ماحول کے مطابق نہ سہی، قوم کی تعمیر میں معاون نہ سہی، لیکن آنکھ کو نور اور دل کو سرور بخشنے والی تو ضرور ہوگی۔ تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی لیکن تفکراتِ زندگی کو دور کر دینے والی تو ضرور ہوگی۔ مگر آہ اختصاصی ذوقِ طبع کا ستیاناس اور انفرادی رجحان طبع کا برا ہو [illegible] کو دیکھ کے بڑی مایوسی ہوئی [illegible] بڑی ہی ناکامی ہوئی۔ ملک اور قوم کو پیغام اور سبق دینے کو تو [illegible] کوئی ایسی چیز پیش کی گئی ہے کہ جو نغمہ خواہ نور [illegible] نغمہ نور سے تعبیر کی جا سکے۔ ساری کتاب اسی فرسودہ عنوان [illegible] حرماں کی تصویر دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھتے دیکھتے آنکھ دکھ چکی ہے۔ سرتاپا کلام اُس پامال موضوع "ناامیدی و ناکامی" کا مرقع نظر آتا ہے جس کا نظارہ کرتے کرتے آنکھ درد کر چکی ہے۔ کتاب کے نام اور کلام سے مطلق سروکار نہیں۔ بلکہ دونوں کا اجتماع "مجموعۂ اضداد" نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا نام "نغمۂ نور" کی بجائے "نالۂ مہجور" رکھا جاتا تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ مجموعہ غزلیات کے تقریباً سارے اشعار نہیں نغمۂ جانفزا کی دلفریب گونج سے مبرا اور مستی جھنکار سے منزا ہی نہیں بلکہ نالۂ آہ و بکا کی [illegible] سے معمور [illegible] ہے کہ پورا حصہ [illegible] پرسرور جلوؤں سے خالی اور حسن [illegible] سے عاری ہی نہیں بلکہ فریاد [illegible] کی افسردہ صداؤں سے بھرا [illegible] یہ چیز بھی کوئی نئی نہیں [illegible] میں بھی کوئی انوکھا پن نہیں [illegible] شاعر کو ہے اور جسکی وجہ دوسرے مصرعہ میں خود شاعر نے بیان کر دی ہے کہ

اگلا سا سوز و ساز نہ اگلا سا درد ہے
جس زندگی میں کیف تھا وہ زندگی کہاں؟ (بہزادؔ)

ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھکے بھی ہمیں سخت کوفت ہوئی کہ اس میں نہ صرف تکرار لفظی کا بڑا زور ہے۔ بلکہ اتنی چھوٹی سی کتاب میں چند عام اور مشہور و ناتمام خیالات بار بار ادا کئے گئے ہیں۔ چند محزون و سوں جذبے متعدد بار اشعار میں نظم کئے گئے ہیں مزید یہ کہ اکثر غزلیں میرؔ، غالبؔ، جگرؔ اور ساغرؔ

کی اُن مشہور غزلوں کے جواب میں کہی گئی ہیں۔ جو شاعر کی شہرت کا باعث ہوئی ہیں۔ اور تمام لوگوں کے کان اُس بعض بعض ان زبان زد اشعار کے مفاہیم کی بھی تجدید کی گئی ہے۔ درآنحالیکہ کثرتِ سماعت سے اب بلات خاص خود ان میں بھی کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔ مثلاً سوداؔ کا مشہور شعر ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

بہزاد صاحب نے فرمایا ہے:

بہک رہا ہوں کہ دونا ہوا ہے کیفِ شراب
یہ کیا کیا مرے ساقی ادھر کو دیکھ لیا

غالب کا بہت مشہور شعر ہے:

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

بہزاد صاحب فرماتے ہیں:

اور تو آلام دنیا ہو چکے مجھ پر تمام
ہاں ابھی باقی ہے مرگِ ناگہاں میرے لئے

جلیلؔ کا بے حد مشہور شعر ہے:

توبہ تو کر چکا تھا مگر کیا کروں جلیلؔ
کالی گھٹا کو دیکھ کے نیت بدل گئی

بہزاد صاحب فرماتے ہیں:

پروردگار اب میری توبہ کا خیر ہو
کالی گھٹا کو دیکھ کے تھرا رہا ہوں میں

~~~~~~~~

نغمۂ نور میں چند نظمیں بھی ہیں لیکن کچھ تو جذبۂ عقیدت کی مرہونِ منت ہیں جن کا کوئی حاصل اور جن میں کوئی جاذبیت نہیں۔ اور کچھ جوش کی نقل میں ہیں۔ جن میں کوئی جدت و [illegible] اور کوئی البیلا پن نہیں۔ بطور نمونہ ایک غزل نما نظم کے چند شعر سن لیجئے

(جوش)

(۱) پا چکا طاعت کی لذت درد کے پہلو بھی دیکھ
[illegible] محراب سے باہر خمِ ابرو بھی ۔۔۔ دیکھ

(۲) [illegible] گلگشتِ حورانِ بہشت ۔۔۔
دو گھڑی میدان میں اگر رم آہو بھی دیکھ ۔۔۔

(۳) تا کجا طنبور و یزدان [illegible] خانقاہ
ہنسی دن میکدے کا رقص یا ہو بھی دیکھ

(بہزاد)

(۱) زاہد! اے زاہد! اِدھر آ زیست کا حاصل بھی دیکھ
جس سے سو آسانیاں صدقے ہیں وہ مشکل بھی دیکھ

(۲) آخرش کب تک رہے گا طالبِ حورِ بہشت
ماہ پیکر ہے ملاحت لیلیٰ محمل بھی ۔۔۔ دیکھ

(۳) تا کجا یہ خانقاہوں کی فضائے بند بند
یہ ہوائیں دیکھ یہ حسنِ مہ کامل بھی دیکھ

~~~~~~~~

...ہوں سجدے سے اٹھا ہی خاک آلودہ جبین / یہ سراسر فرقِ حرم پر میرا بارِ نیاز پر
...کے زیرِ سر کسی معشوق کا زانو بھی دیکھ / اپنا منزل دیکھنے والے مری منزل بھی دیکھ

...ہوئے طاعت میں پیدا کر غم سوز و گداز / دانۂ تسبیح کیوں گردش میں رکھتا ہے مدام
...دانۂ تسبیح پر بہتے ہوئے آنسو بھی دیکھ / زیرِ خنجر اک ذرا تو گردشِ بسمل بھی دیکھ

...وشگانی تا کجا واللیل کی تفسیر میں - / بہر ندامت داستانِ سنگِ آسو تا کجا -
...وشوں سے کے دوش پر بکھرے ہوئے گیسو بھی دیکھ / عارضِ گلرنگ جاناں کا سیہ سائل بھی دیکھو -

---

البتہ اس حصۂ نظم میں ایک نظم ایسی ہے جس میں ایک تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے - ایک ہی نظم ہے جس میں طارق کے عدیم النظیر کارنامۂ جرأت ال جذبۂ مردانگی کو پیش کیا گیا ہے - یہ نظم یقینی ایسی ہے جسکو پڑھکر خون میں گرمی، مزاج میں جوش، دل میں ولولہ اور حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے - یہ تین آخری شعر خوب ہیں :-

اس سے زیادہ صاحبِ جرأت نہ سن سکے / لیکر خدا کا نام وہ یکبارگی بڑھے
آخر کو غرق ہو گیا ایمان کے سامنے / تمنا بھی کون ؟ جو عزمِ سلطان کے سامنے

بہزاد یہ جری جہاں اترے تھے شان سے
اب تک وہ دشت گونج رہا ہے اذان سے

...لم کے بعد آخری حصہ کتاب میں تھوڑے سے گیت بھی ہیں - مگر چونکہ میرے خیال میں نہ تو ملک و قوم کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ دل و دماغ کو پہنچ سکتی ہے - لہذا میں نے انہیں پڑھا بھی نہیں - ممکن ہے ان میں کوئی جاذبیت اور دلکشی ہو - ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی جدت و ندرت ہو -

جرعاتِ عابد

از

جناب محمد تقی عابد (زاہدی)

دل بنا کر دل میں دل جلنے کا ساماں رکھ دیا
وہ ترنم زا تبسم، وہ فروغِ روئے گل
دیکھتے رہتے ہیں حیرت سے تجلی کی نمود
یادگارِ عہدِ رنگیں لغزشِ دورِ شباب
دیکھتا ہوں جس طرف میں جلوہ ہائے رنگ رنگ
سن کے اس کا فرنظر نے مژدۂ بیم کا گلہ
اصلح قدرت کی ہے میری تخلیقِ حیات
پہلے حسن کا تجھ و بیداری ہو گیا شاید اسلئے

نام اس مخلوق کا مجبورِ انساں رکھ دیا
چھیڑ کر جس ذرا ساز رگِ جاں رکھ دیا
کس کا ان نور ولیکن منہ چشمِ حیراں رکھ دیا؟
میں نے صحرا میں کہیں تارِ گریباں رکھ دیا
کس نے میری آنکھ میں ریگستاں رکھ دیا؟
ہنس کے میرے دل میں نوکِ تیرِ مژگاں رکھ دیا
دل دیا پھر دل میں اس کے ذوقِ پنہاں رکھ دیا
طاق پر علیحدہ سارا زہد و ایماں رکھ دیا

عورتوں کو مہینہ کی بیماریاں

افسوس ہے کہ ہندوستانی مردوں کی غفلت کی وجہ سے اس ملک کی عورتوں میں ماہواری ایام کی بیماریاں بہت کافی پھیل گئی ہیں۔ اور آجکل ۸۰ فیصدی عورتیں ماہواری ایام کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ مگر شرم کی وجہ سے یہ عورتیں اپنے مردوں کو اطلاع نہیں دیتیں۔ اور اپنی زندگی ختم کر دیتی ہیں۔ اگر یہی رفتار رہی تو کچھ عرصہ بعد ہندوستان سے اس غریب طبقہ کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ماہواری ایام میں خرابی ہونے سے چہرہ کی رونق غائب ہو جاتی ہے اٹھتے بیٹھتے چکر آنے لگتے ہیں، دورے پڑتے ہیں۔ لوگ آسیب کا شبہ کرتے ہیں۔ پنڈلیوں میں اور زیر ناف اور تمام بدن میں سخت درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ بعض عورتوں کو ماہواری ایام آنے سے پہلے ہی تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ بعض کو خاص ایام کے زمانہ میں تکلیف ہو جاتی ہے۔ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ آتے ہیں۔ کسی کو رک رک کر آتے۔ کسی کو بے وقت آجاتے ہیں۔ ان سب خرابیوں سے عورت کے اندرونی جسم میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ان حالات میں یہ خبر بڑی خوشی کے ساتھ سنی جائے گی کہ دہلی کے زنانہ دواخانہ کی بنائی ہوئی دوا **کورس** ان تمام تکلیفوں میں حیرت انگیز فائدہ کرتی ہے۔ ماہواری کی خواہ کوئی خرابی ہو صرف ایک شیشی عورت کو استعمال کرا دینے سے ماہواری ایام ہر مہینہ اپنے ٹھیک وقت پر اور صحیح تعداد میں بغیر کسی تکلیف کے آنے لگتے ہیں۔ تمام ہندوستان میں اس دوا کی بہت شہرت ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس دوا سے بہت جلد فائدہ ہو جاتا ہے۔ ہزاروں عورتوں کو آرام ہو چکا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں ایسی کوئی عورت ہو جو ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہو تو اس سے کہدیجئے کہ ذیل کے پتہ پر خط لکھ کر "کورس" کی ایک شیشی بذریعہ پارسل منگا کر استعمال کرلے۔ ایک شیشی کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ اور محصولڈاک سات آنے ہے۔ ایک شیشی سے عورت کو پورا فائدہ ہو جاتا ہے۔

منگانے کا پتہ :- لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ۔ ایس۔ آر۔ بی ۳۶ دہلی

دستِ ساقی میں چھلکتا جام ہے

از — جناب پیارے لال شاکر میرٹھی

جلوہ فرما وہ بتِ خودکام ہے
امتحانِ شوق کا ہنگام ہے

بزم میں ساقی سے آنکھیں کیا لڑیں
ذوقِ مستی میں یہ دَورِ جام ہے

الاماں اے وادیٔ پُرخارِ عشق
دم بھی لینا باعثِ الزام ہے

ہے گنہگاروں کا میلہ وہ بھی ایک
زاہدوں میں حشر جس کا نام ہے

ہر سخن اُس کا مسرّت کی نوید
ہر نظر اک لطف کا پیغام ہے

رہ چکی توبہ سلامت رہ چکی
دستِ ساقی میں چھلکتا جام ہے

بھولنے کی بھی تو گنجائش نہیں
اپنی ہر اک سانس اُس کا نام ہے

بِن پیے بھی مست سا رہتا ہوں میں
میرے ساقی کا یہ فیضِ عام ہے

خانۂ دل بن گیا مسکن ترا
پھر بھی دل ناکام تھا ناکام ہے

ہچکیاں آتی ہیں لے نامِ خدا
مرنے والے موت کا پیغام ہے

کچھ نہ پوچھو شاکرِ خستہ کا حال
پائمالِ گردشِ ایّام ہے

بیراگی

جناب ایم۔ اسلم

بہت پرانی بات ہے۔ دریائے راوی کے کنارے شیشم کے درخت کے نیچے ایک بیراگی چند روز سے دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ آپ جانتے ہیں میں صبح و شام دریا پر جاتا ہوں۔ دریا پر پہنچ کر ریلوے پل کے پاس پتھروں پر جا بیٹھتا ہوں۔ نظر کے سامنے شاہنشاہ جہانگیر کی آرام گاہ ہے۔ پُروا چل رہی ہو تو اس عالیشان مقبرے کے مینار شیشۂ آب پر رقص کرتے نظر آتے ہیں اور جو ہوا بند ہو تو پھر ان کا عکس پانی پر یوں نظر آتا ہے جیسے کوئی حسینہ کنارے پر بیٹھی آئینہ دیکھ رہی ہو۔ کنارے پر دھوبیوں کی چھو اچھو بار بار غریبوں کی زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

صبح کے وقت دریا پر کافی رونق رہتی ہے ہندو مرد اور عورتیں سبھی یہاں اشنان کرنے آتے ہیں۔ اکثر گیانی بیراگی کے پاس بھی بیٹھے نظر آتے لیکن شام کو وہ اکیلا ہی ہوتا۔ کبھی کبھی دوتارہ بجاتا اور ہولے ہولے میٹھے سروں میں گاتا۔ شام کے وقت دس پانچ منٹ کیلئے میں بھی اس کے پاس جا بیٹھتا۔ خاصہ تگڑا جوان آدمی تھا۔ گفتگو بھی خوب شستہ کرتا۔ مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دل چوٹ کھایا ہوا ہے۔ لیکن میں جو کبھی کچھ پوچھتا تو ٹال جاتا۔

شام کا وقت تھا دریا اور جنگل پر ایک سکوت مسلط تھا۔ شہنشاہ کے مرقد پر بھی کچھ اداسی سی چھائی تھی۔ طیوروں کے قافلے آگے پیچھے شہر کی طرف سے آ رہے تھے اور جنگل میں ڈیرا ڈال رہے تھے۔ ریلوے پل کے عقب میں آفتاب بھی مشرق کے مکینوں سے منہ چھپا رہا تھا۔ میں اس بیراگی سے ذرا ہٹ کر کنارے پر بیٹھا قدرت کے اس عظیم الشان تغیر کو دیکھ رہا تھا کہ عقب سے بیراگی کے دوتارے کی آواز آئی۔ وہ ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ اور والہانہ انداز سے گا رہا تھا۔ کچھ دو چار مصرعے ابھی تک یاد ہیں۔

کچھ نیک کام کر لے دنیا ہے چند روزہ

کیوں بھول اٹھا ہے ناداں دو دن کی زندگی میں
دولت نہ ساتھ دے گی حشمت نہ ساتھ دے گی
اب تک بچا ہے بھائی۔ آخر فنا ہے بھائی
دل کی انگشتری میں انمول لعل جڑ لے
کچھ نیک کام کر لے۔ دنیا ہے چند روزہ!

یہ کیفیت میں نے اس سے پیشتر نہ دیکھی تھی۔ میں عموماً اسے خاموش دیکھتا تھا۔ کبھی گاتا بھی تو بس گنگناتا کہ جیسے کوئی اپنے دل کو بہلا رہا ہو۔ جب وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو میں نے کہا "ذرا بیٹھ جائیے۔ کچھ ہمیں بھی تو سنائیے!"

یہ سن کر اس نے دوتارا اس طرح کندھے پر رکھ لیا جیسے کوئی سپاہی بندوق رکھتا ہے پھر کہنے لگا "کیا سنیں گے آپ؟ یہ آپ کے کام کی باتیں نہیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"اگر یہ میرے کام کی باتیں نہیں تو پھر یوں اونچے اونچے گانے سے مطلب۔ میں نے تو جانا کہ آپ مجھ کو ہی سنا رہے ہیں کیونکہ اس وقت میرے سوا اور کوئی یہاں ہے بھی تو نہیں۔"

"یہ تو آنکھوں کی بات ہے" اس نے جواب دیا۔ "آپ کو نظر نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور؟" "کون ہے یہاں؟" میں نے بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"یہ جنگل کے ہرے ہرے بوٹے" بیراگی بولا۔ "یہ پنکھ پکھیرو۔ یہ جل اور اس جل کی لہریں۔ یہ زمین اور آسمان۔ اور آپ کہتے ہیں کہ آپ کے سوا یہاں اور کوئی ہے ہی نہیں۔"

میں نے یہ سن کر مسکرا دیا۔

آپ ہنستے ہیں وہ بولا۔ "گویا یہ چیزیں کچھ سنتی سناتی نہیں۔ نہ سنیں سو بار نہ سنیں

دل بہت دنوں سے اشارہ کر رہا ہے یہ ظالم تو دشمن ہے۔ میں اسی کو تو سنا رہا ہوں۔ اسے ہی تو سمجھا رہا ہوں۔ یہ کئی دنوں سے سرکش ہوا جا رہا ہے۔ اس پاپی کو نہ سمجھاؤں تو کیا کروں۔ جانے یہ ظالم ابھی اور کیا کیا دکھ دکھائے۔

وہ بول رہا تھا اور میں تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں بھی کچھ سرخ سی ہو رہی تھیں۔

"یہ ظالم دل! جانے ابھی اور کیا کیا دکھ دکھائے مجھے!" اس نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔

"کیا جرم کیا اس ظالم دل نے" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"آپ ایک بات بتایئے" بیراگی نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"فرمایئے؟"

"تڑپ تڑپ کر مرنے میں کم تکلیف ہوتی ہے یا گاڑی کے نیچے کٹ جانے سے" بیراگی نے پوچھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔

"کبھی مر کر نہیں دیکھا"۔

"ہنسو! خوب ہنسو!" بیراگی ایک آہ بھر کر بولا۔ "پہلے تھا! آپ کو ہنستا ہی دیکھے۔ ہم تو کل آپ کے دیس سے کوچ کر جائینگے"۔

"اب کہاں جائیگا؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں! ذرا ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا" جہاں عورت نظر نہ آئے۔ جہاں یہ پاپن نہ ہو۔

"آپ کو عورت سے کیوں اتنی نفرت ہے" میں نے پوچھا۔

جانے اس فقرے میں کیا جادو مضمر تھا جو وہ خود بخود پھوٹ پڑا۔

"جو چیز زندگی کو تباہ کرے۔ اس سے نفرت نہ ہو تو کس سے ہو۔ جو سکھ کی زندگی کو دکھ بنا دے وہ پاپن نہیں تو اور کون ہے۔ جو بنے گھر کو برباد کر دے وہ دشمن نہیں تو کون دشمن ہے۔ جس نے ایک غریب مزدور کی زندگی کو برباد کر ڈالا جس نے عزت اور ناموس کو دولت کے شعلے پر بھینٹ چڑھا دیا۔ جب سانپ پریم کا لیپ دکھا کے ڈسے تو کون اس کے سم سے بچ سکتا ہے۔ ارے! مجھے اس ناگن سے کتنا پریم تھا پر ڈس لیا ظالم نے"

"کون تھی وہ کمبخت" میں نے پوچھا۔

"میری عورت" بیراگی نے جواب دیا۔

"چھوڑ دیا آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے کیا چھوڑنا تھا" بیراگی بولا۔ "آپ سانپ کے ساتھ مل کر رہنا پسند کریں گے۔ ہمت ہو تو سانپ کو مار دیجئے۔ اور جو آپ کو یہ نہ چاہے تو پھر اس گھر کو ہی چھوڑ دیجئے"۔

"یہ تو غلط کہا آپ نے" میں نے جواب دیا۔ "جہاں سانپ سے پالا پڑے وہاں سے بھاگنا ہی اچھا ہے"۔

"اور جو سانپ خوبصورت ہو" بیراگی نے پوچھا۔ "اگر وہ من کو بھا گیا ہو پھر؟"

"سانپ خوبصورت ہو یا بدصورت ہے تو سانپ ہی" میں نے کہا۔

"یہ تو آپ نے سچ کہا" بیراگی بولا۔ "پر مجھے ہمت نہ پڑی جس کے آرام کی خاطر میں نے نہ دن کو دن جانا اور نہ رات کو رات۔ اسے کھلانے کی ہمت کیسے پڑتی اس کے لئے تو پتھر کا دل چاہیئے"۔

"کیوں بن نہ آئی آپ سے؟" میں نے پوچھا۔

"میں غریب مزدور۔ وہ جوان اور طرحدار۔ کیسے بن آتی" بیراگی نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"وہ بے وفا نکلی!" میں نے کہا۔ "اور آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ اچھا کیا لیکن دوسرا بیاہ کر لیا ہوتا"

"جو چیز من کو بھا جائے۔ جو چیز آنکھوں میں سما جائے۔ اس کے ہوتے ہوئے کب کسی اور کی تمنا ہوتی ہے"۔ بیراگی نے جواب دیا۔

"بہت محبت تھی آپ کو اس سے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ تو صرف جیتی ہی میرے لئے ہے" بیراگی نے جواب دیا۔

"لیکن یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بے وفا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "شاید کسی نے جھوٹ کہہ دیا ہو"۔

"ارے بھائی!" بیراگی بولا۔ "کسی نے مجھ سے کیا کہنا تھا۔ میرے پاس اس کے جرم کا ایک ایسا ثبوت تھا جس سے وہ انکار ہی نہیں کر سکتی تھی"۔

"کہیں آتے جاتے دیکھ لیا ہوگا آپ نے" میں نے ہنس کر کہا۔

"آتے جاتے تو کبھی دیکھا" بیراگی بولا۔ "لیکن اسکے جانے کا دیا شوق لگ گیا کہ میں اسکا چاشت ہو گیا۔"

"کہیں کام کاج کرتے ہوں گے آپ!" میں نے پوچھا۔

"ہاں"! بیراگی بولا۔ "ایک کارخانے میں پندرہ روپے ماہوار پر میں ملازم تھا۔ بنگلوں کی دیا سے گذران ہو رہی تھی۔ یہ کشتی کہیں بندوں کی ایک جوڑی دیکھ آئی تھی۔ ایک روز مجھے بھی ذکر کیا۔ میں نے حامی بھر لی کہ اچھا لے دوں گا۔ اب آپ جانئے! میں اس کشتی کا یہ شوق پورا کرنے کے لئے آٹھ گھنٹے روز کی بجائے بارہ گھنٹے روزانہ کام کرنے لگا۔ ایک روز کارخانے کے مالک نے مجھ سے پوچھا کہ تم اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہو؟ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مہاراج بندوں کی ایک جوڑی میری گھر والی کہیں دیکھ آئی ہے۔ بس اسی لئے یہ زائد وقت کام کرتا ہوں۔ اس نے ہنس کر پوچھا کوئی ہے سو پچاس کی۔ میں نے کہا نہیں مہاراج صرف پچیس روپے قیمت ہے۔ اس نے پوچھا کتنے روپے تمہارے پاس ہیں۔ میں نے کہا منیم جی نے نے بتلایا تھا کہ دس روپے میرے ہو گئے۔ پانچ گھر پر رکھے ہیں۔ اب دس روپے کی ضرورت ہے۔ اگر کہیں سے دس قرض مل جائیں تو میں دیوالی تک اس دیوی کا شوق پورا کر دوں۔ کارخانے کے مالک نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کہا یہ لو یہ ہماری طرف سے انعام ہے۔ بس آج ہی بندے خرید لو۔ تو جناب! جس وقت میں بندے لے کر گھر آیا اس کی خوشی کچھ پوچھئے نہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے یہ بندے اسکے کانوں میں ڈالے۔ جب آس پاس والیاں جھک جھک کر اسکے بندے دیکھتیں تو رام جانے اس کا دل بہت خوش ہوتا۔ دیوالی کی رات یہ ناگن خوب بن سنور کر دیوٹ مالا دیکھنے گئی۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک بندا غائب ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ بندا کیا ہوا تو اس نے بھی کان ٹٹول کر دیکھا بندا نہ دیکھ کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی! کہیں گھومتے گھماتے گر گیا۔ اتھرو اسکے آنسو نکل آئے۔ افسوس تو مجھے بھی بہت ہوا لیکن میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ بھگوان نے چاہا تو دوسرا جلدی بنوا دوں گا۔ اسے بندے کے گم جانے کا اتنا صدمہ تھا کہ ساری رات اسے نیند نہ آئی۔ اور سچ پوچھئے تو سویا میں بھی نہیں۔ آج میں نے کئی پہرے رہے کے قریب جھونپڑی میں پڑے رہے۔ صبح اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر کارخانہ جانے کے لئے گیا۔ وہ ابھی پلنگ پر ہی تھا اس نے مجھے دری

بچھا دیا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ اچھے ہو! انہوں نے پوچھا۔ دیا ہے آپ کی جی کہو کیا کچھ جھگڑا وات؟ انہوں نے ایک جمائی لیکر پوچھا۔ میں نے کہا کہ مہاراج میں تو پہنے دو کا مقروض ہو گیا وہ جھگڑے سے۔ آج چار سو ہم نے بھی کچھی کی بھینٹ چڑھائے۔ یہ کہہ انہوں نے کروٹ بدلی۔ آدھا کمبل فرش پر گرا ہوا تھا میں نے کہا مہاراج کمبل اٹھا دوں۔ ہاں بھیا ڈال دو اوپر۔ انہوں نے ایک اور جمائی لیکر کہا۔ میں نے کمبل اٹھا کر جو ان پر ڈالا تو فرش پر وہی بندا جو گھر والی کھو آئی تھی پڑا تھا میں نے اٹھا کر چپکے سے جیب میں ڈال لیا۔ وہ ظالم! پھر خراٹے بھرنے لگا تھا۔ میں چپکے سے وہاں سے چلا آیا۔ جب گھر پہنچا تو وہ کشتی بندا ہاتھ میں لئے دیکھ رہی تھی بل گیا کیا؟ میں نے پوچھا وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ایسے میرے بھاگ کہاں۔ یہ لو! میں نے جیب سے دوسرا بندا نکال کر اسکے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ کہاں سے ملا؟ اس کشتی نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔ جہاں تم دیوٹ مالا دیکھنے گئی تھیں۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ بس یہی اس کی سزا تھی۔ اب اس شہر میں رہنا دشوار تھا اور جینا اس سے بھی مشکل۔ میں دروازے سے لگا ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک سادھو ستار بجاتا ہوا دروازے پر آ کھڑا ہوا اور گانے لگا ؎

کچھ نیک کام کر لے دنیا ہے چند روزہ
کیوں بھول تھا ہے نادان دو دن کی زندگی میں
دولت نہ ساتھ دے گی حشمت نہ ساتھ دے گی
اب تک بچا ہے بھائی آخر قضا ہے بھائی
دل کی انگشتری میں انمول لعل جڑ لے
کچھ نیک کام کر لے۔ دنیا ہے چند روزہ

اس کا یہ سُر میرے دل میں گھر کر گیا۔ بس بھائی! اس روز سے گھر بھی چھوڑا اور دیس بھی۔ اور اب یہاں سے بھی چلتے ہیں کیونکہ اب تو ہم آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

یہ کہہ اس نے دوتارا اٹھایا اور گاتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا۔ شام ہو چکی تھی اور آسمان پر مغرب کی جانب ایک ستارہ کسی کے اختر تقدیر کی طرح چمک رہا تھا۔ پل پر سے ایک گاڑی گڑگڑاتی ہوئی گذر رہی تھی اور دور آگ جہاں بیراگی نے جلد کی تھی اسکا دھواں کسی سنہری ساماں کی آہوں کی طرح فضا میں پریشان ہو رہا تھا۔

محبت کیا ہے؟

مشہور مغربی شاعر ڈاکٹر سیگو کی ایک نظم کے مطالعہ کے بعد

(از جناب حاجی نبی احمد بریلوی)

عہدِ ماضی کا سکوں یاد جب آتا ہے مجھے — واقعہ یہ ہے کہ تا دیر رُلاتا ہے مجھے
ہائے وہ دن کہ، مجھے جب کوئی آزار نہ تھا — واقفِ درد نہ تھا غم سے سروکار نہ تھا
لوگ جب پوچھتے تھے مجھ سے "محبت کیا ہے" — میں بتا نہ سکا انہیں کہ حقیقت کیا ہے

زندگی کیف سے معمور تھی معصوم نہ تھی — لذّتِ دردِ محبّت مجھے معلوم نہ تھی
ناگہاں دردِ محبّت ہوا جب روح گداز — دل سے آنے لگی ڈوبی ہوئی غم میں آواز
آہ لیکن میں محبّت سے خبردار نہ تھا — غالباً ذہن رسا میرا پُر انوار نہ تھا
آج خود شرحِ محبّت کی تمنّا ہے مجھے — کسے کہتے ہیں محبّت یہ سمجھنا ہے مجھے

کاش ایسا کوئی مونس کہیں مجھ کو مل جائے — جو مرے دل پہ گذرتی ہے مجھے وہ سمجھائے
دل مرا سوزِ محبّت سے پُھنکا جاتا ہے — کوئی ہر وقت مری روح کو تڑپاتا ہے
خلش اندازیٔ پیہم سے سُلگتا ہوں میں — رات دن شمع کی مانند پگھلتا ہوں میں

ایک دن جانبِ دریا جو بڑھے میرے قدم — میں یہ سمجھا تپشِ روح اب ہو جائیگی کم
دیکھ کر آبِ رواں کو ہمہ تن مست سروش — دفعتاً آگیا ہنگامہ جذبات میں جوش
خود میں حیران تھا یہ رنگِ طبیعت کیا ہے — دل سے اک چیخ سی نکلی کہ "محبت کیا ہے"
میری فریاد سے جب حشر فضاؤں میں اُٹھا — ایک انسانِ کہن سال نے مجھ سے یہ کہا
تو محبّت کی حقیقت کو نہ پہچان سکا — ہے محبّت وہ عبادت، جو ہے جینے کی سزا
یا سمجھ لے کہ یہ کمزوریٔ فطری ہے [illegible] — منتقل نسل میں آدم کی جو ہوتی ہی رہی

اک ضعیفہ نظر آئی مجھے اور اُس نے کہا — آ بتاؤں [illegible] غافل کہ محبت [illegible]
[illegible] جوانی کی شراب — لذّت و کیف کا جس کی نہیں دُنیا میں جواب
یاد جب اُس کی [illegible] میں بھی آجاتی ہے — تلخیٔ زیست کو مسرور بنا جاتی ہے
پھر نظر آیا [illegible] جوان رعنا — سُن کے آواز کو میری [illegible] یوں گویا

میں سمجھتا ہوں محبت ہے جوانی کا نکھار ۔۔۔ ہے نہاں لذت و عشرت میں محبت کی بہار

پھر ملا فلسفی اک، اور متانت سے کہا ۔۔۔ تو محبت کو نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا ذرا
اس معمے کو تو کچھ ہم نے ہی سلجھایا ہے ۔۔۔ راز اس سحر کا ہم نے ہی تو کچھ پایا ہے
میں محبت کو سمجھتا نہیں کچھ اس کے سوا ۔۔۔ موت کی طرح سے انسان کو کرتی ہے فنا

پھر نکا ایک نظر آیا مجھے سیارہ شناس ۔۔۔ جس کے چہرے سے برستا تھا کہ ہر خستۂ یاس
مجھ سے بولا کہ نہ ہو اس کی طلب میں ناکام ۔۔۔ ہے محبت کی کشش پر ہی ستاروں کا قیام

پھر نظر آیا مجھے طفلک معصوم و حسین ۔۔۔ سن کے آواز مری، اس نے مجھے دی تسکین
کہیں میں مست تھا پھر بھی یہ کہا سنئے آپ ۔۔۔ ہے محبت مری ماں اور محبت مرا باپ

آہ لیکن مری تسکین کسی صورت نہ ہوئی ۔۔۔ مجھے معلوم محبت کی حقیقت نہ ہوئی
ہو گئی شام نہاں آنکھوں سے خورشید ہوا ۔۔۔ اور تاریک مرا مطلع امید ہوا
دل کچھ اس طرح سے ڈوبا کہ ابھرا نہ گیا ۔۔۔ میں وہیں بیٹھا رہا اور کہیں آیا نہ گیا
تھا زباں سے مری اب بھی یہی جاری پیہم ۔۔۔ کوئی آگاہِ محبت کرے فرمائے کرم
اتفاقاً ہوا اس سمت سے راہب کا گذر ۔۔۔ مجھے دیکھا جو پریشاں، تو کہا فکر نہ کر
میں تجھے رازِ محبت کا بتا سکتا ہوں ۔۔۔ آگ دل کی ترے اے دوست بجھا سکتا ہوں
کیا محبت کا تری روح کو عرفان نہیں ۔۔۔ جو محبت نہیں کرتا ہے وہ انسان نہیں
سن کے یہ بات نئی غم مرا کچھ دور ہوا ۔۔۔ مجھے محسوس ہوا، دل مرا مسرور ہوا
دفعتاً آئی اک آواز "یہ سب دھوکا ہے ۔۔۔ آ بتا دیں تجھے در اصل محبت کیا ہے
جو محبت کے پرستار ہیں شیدائی ہیں ۔۔۔ وہ حقیقت میں ہمارے ہی تمنائی ہیں
دوسرا نام خدا کا ہے "محبت" بھی نہ بھول ۔۔۔ ہے "محبت ہی خدا" اب یہ حقیقت بھی نہ بھول
ملہمِ غیب کے پیغام سے دل شاد ہوا ۔۔۔ اک نئے کیف، نئے لطف سے آباد ہوا
روح جب فرطِ مسرت سے ہم آغوش ہوئی ۔۔۔ بیخودی بڑھ گئی اس درجہ کہ بیہوش ہوئی
کتنا دلچسپ مرا خوابِ پریشاں نکلا ۔۔۔ ہوش میں لایا گیا جب تو زباں سے نکلا
حاصلِ زیست ہی کیا، اس سے سوا ملتا ہے ۔۔۔ کر محبت کہ محبت سے خدا ملتا ہے

اب سمجھ میں میری آیا کہ "محبت کیا ہے"

ایک علمی مقالہ

رُباعی نگاری اور شاد عظیم آبادی

از حضرت حمید عظیم آبادی

شاد کا نام آیا، اور کہنہ مشقی و شاعرانہ کمال کا مرقع تصور کی نگاہوں کے سامنے آموجود ہوا اور صوبہ بہار کی ایک مایۂ ناز ہستی کی تصویر تصدیقات کے تمام براہین و دلائل کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ نگاہوں میں گھومنے لگی۔ میں اس وقت اُس مرقع فضل و کمال کا کوئی بہت روشن رُخ پیش کرنا نہیں چاہتا لیکن پھر بھی جس صنف شاعری سے آج کے مضمون کو سروکار ہے، حضرت شاد بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے!!

ذرا رباعیوں کی خصوصیات اور اُس کی تدریجی حالتوں پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو حضرت شاد کی رباعیوں کے متعلق کچھ عرض کیا جائے!

عربی میں رُبع کے معنی کسی چیز کے چوتھے حصے کے ہیں اور رباعی کے معنی "چار والے" کے ہیں۔ اسی لئے چار مصرعوں والی نظم کو رباعی کہتے ہیں۔ چنانچہ دولت شاہ نے تذکرہ (۸۹۲ھ) میں اس کی یہی وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ "تا فضلا لفظ دوبیتی را نکو ندیدند گفتند کہ چار مصراعی ست رباعی می شاید گفتن" (صد ۳۱ گب) لیکن محمد بن قیس رازی نے جس کی تالیف و تصنیف کا عہد ۶۱۴ھ سے حدود ۶۳۰ھ تک ثابت ہے[۵۲]، اپنی مشہور تالیف المعجم فی معائر اشعار العجم مطبوعہ گب میں رباعی کی ایجاد و پیدائش کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "اہل عرب اس کو رباعی اس لئے کہتے ہیں کہ بحر ہزج جس میں رباعی کہی جاتی ہے چار اجزا سے مرکب ہوتی ہے اور اس لئے اس وزن کا ایک مصرع عربی میں دو جز کا ایک شعر ہو جاتا ہے اور اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر ہو جاتے ہیں" رازی کے اس بیان کی تائید معیار الاشعار سے بھی ہوتی ہے "وقدما بر اں شعر بسیار گفتہ اند و ایشاں ہر مصرع را قافیہ تی آوردند و آں را بیتے می شمردہ اند مانند رجز مسطور[۵۲] یا بیتہائے مقفد[۵۲] از اشعار تازیاں......
و بہ ایں سبب ترانہ (رباعی) را قدما چہار بیت می گرفتہ اند و آں را چہار بیتی خواندہ اند و بتازی رُباعی و در ہر چہار قافیہ آوردن لازم می شمردہ اما بنزدیک متاخراں چوں مربعات ایں اوزان مستعمل نیست ایں اوزان متروک است و ہر بیتے را از یں ابیات مصراعے می شمرند و رباعی را دوبیتی می خوانند و قافیہ شرط نمی نہند"

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رباعی کا نام رباعی چار مصرعوں کی وجہ سے نہیں بلکہ چار مصرعوں کے چار شعر ہونے کی وجہ سے پڑا ہے الغرض محمد رازی اور مؤلف معیار الاشعار جیسے قدیم محققین عروض کے بیانات سے یہ بات تو مسلّم ہو گئی کہ رباعی پہلے دو، دو جز کا ایک مصرع ہو کر چار مصرعوں میں چار شعر ہوتے تھے اور ان چاروں شعروں کے اواخر متحد القافیہ ہوتے تھے"

---

[۵۲] خیام از مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی [۵۲] اتابک سعد زنگی اول بادشاہ فارس ۵۹۹ھ تا ۶۲۸ھ کے دربارسے اس کا تعلق تھا۔ علم عروض و قوا میں یہ اس کی نہایت اہم کتاب ہے۔ ۱۹۰۹ء میں گب میموریل سیریز لندن میں یہ کتاب چھپی ہے اس کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں موجود ہے سید سلیمان راقم الحروف کے پاس بھی ایک قلمی نسخہ المعجم کا موجود ہے۔ اس کے کاتب شاہ بخشش حسین وحشتی تلاڈھوی ہیں ۱۲۴۹ فصلی میں راجہ پیارے لال الفتی کے کتب خانے یہ کتاب نقل کی گئی تھی، شاہ صاحب کو جناب راجہ صاحب سے تلمذ بھی تھا۔ عبارت اور صفحے میں یہی کتاب سے درج کر دی گئی [۵۲] وہ بیت جو پوری بیت سے آدھی بیت نکال کر باقی نصف کو بیت کے بجائے استعمال کریں [۵۲] مقفد وہ بیت جس کا پہلا مصرع دوسرے مصرع سے علیحدہ نہ ہو سکے۔ عربی میں زیادہ مستعمل ہے فارسی میں کم اور اُردو میں معدوم۔

ذرا سے تامل کے بعد ہر سخن فہم اہل علم اس نکتہ پر بہ آسانی پہنچ سکتا ہے کہ فارسی مذاق عربی مذاق سے میل نہیں کھاتا۔ اس لئے اہل فارس کے ہاں دو ہی شعر سمجھے جاتے تھے اور اسی لئے اس کو دو بیتی بھی کہتے تھے، رباعی کو ترانہ دو بیتی جفتی اور چار مصراعی بھی کہتے تھے محمد بن قیس المعجم میں ذرا ذرا سے فرق سے رباعی کے حسب ذیل نام بتاتے ہیں قلمی ص۵۳ "و بہ حقیقت ہیچ وزن از اوزان مبتدع و اشعار مخترع کہ بعد از خلیل احداث کردہ اند بہ دل نزدیک تر و بہ دل آویزندہ تر ازیں نیست و بحکم آنکہ ارباب صناعت موسیقی بریں وزن الحان[۹] شیریں ساختہ اند و طرق لطیف کردہ و عادت چناں رفتہ است کہ ہر چہ از آں جنس بر ابیات تازی سازند آں را قول خوانند و ہر چہ بر مقطعات پارسی باشد آں را غزل گویند۔ اہل دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ نام کردند و شعر مجرد آں را دو بیتی خوانند و برائے آنکہ بنائے آں بر دو بیت بیش نیست مستعبر آں را رباعی گویند از ہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمدہ است۔ پس ہر بیت را ازیں وزن دو بیت عربی باشد لیکن بحکم آنکہ زحافے کہ دریں وزن مستعمل است در اشعار نیامدہ است و در قدیم بریں وزن شعر تازی نگفتہ اند و اکنوں محدثان ارباب طبع بر آں اقبالے تمام کردہ اند و رباعیات تازی در ہمہ بلاد عرب شائع و متداول گشتہ"

(۱) قول۔ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی کا خیال ہے کہ قول ہی قول سے مشتق ہے اور بات بھی لگتی سی ہے۔ خیام ص۲۵۵

(۲) غزل۔ "قدما کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ آتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک غزل کی موجودہ اصطلاح پختہ نہ ہوئی تھی"۔ خیام ص۲۲۷

(۳) ترانہ۔ (۴) دو بیتی۔ (۵) رباعی۔

اہل ادب اور اہل تذکرہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ رباعی اتفاقیہ طور پر ایجاد ہو گئی۔ واقعہ مشہور ہے کہ چند لڑکے گولیاں کھیل رہے تھے کہ ایک خوش رو لڑکے کی زبان سے یہ جملہ موزوں نکلا "غلتاں غلتاں ہمی رود تا بن گو"۔ اور پھر یہی مصرع قرار پایا اور مطبوع طبع و زبان زد خاص و عام ہو کر رواج پا گیا معجم ص۵۲-۵۳ قلمی۔ اس موضوع پر "خیام" میں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے ایک عالمانہ بحث کی ہے ملاحظہ ہو خیام ص از ۲۲۷ تا ۲۳۱۔

رباعی گو شعرا میں سب سے پہلے نام حضرت بایزید بسطامی المتوفی ۲۳۴ھ کا ملتا ہے۔ اس کے بعد رودکی المتوفی ۳۲۹ھ کا نام آتا ہے۔ بعدہ معلم ثانی ابونصر فارابی المتوفی ۳۳۹ھ کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ ان شعرا کے بعد ابوشکور بلخی اور عمارہ مروزی وغیرہ کے نام آتے ہیں تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں!

حکما اور صوفیہ نے رباعی کو کیوں اختیار کیا؟ اس کا بیان مولانا سلیمان ندوی ہی کے گہر فشاں قلم کی زبانی سنئے! "حکما اور صوفیہ پیشہ ور شاعر نہ تھے۔ ان کے شب و روز کے مشاغل کچھ اور تھے۔ شاعری ان کا پیشہ نہ تھا۔ اس لئے ان کے ذہنی خیالات کی تحریر و ترتیب کے لئے قصائد و مثنوی کے طویل الاشعار اصناف سخن کارآمد نہیں ہو سکتے تھے، نہ ان کے پاس تعلیم و تصنیف و مطالعہ یا ذکر و فکر عبادت سے اتنا وقت نکل سکتا تھا کہ وہ قصیدہ یا مثنوی کہنے بیٹھتے۔ کبھی سانس لینے کے لئے وہ کچھ کہہ لیتے تھے اور اتنی تھوڑی دیر میں چار مصرعے کہہ کر الگ ہو جاتے تھے اور پھر اپنے مشاغل میں لگ جاتے تھے"۔ خیام ص۲۲۹

مندرجہ بالا عبارت کے پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیشہ ور یا درباری شعرا رباعی گوئی کے لئے موزوں نہ تھے اور

---

(۹) خیام ص۲۵۱ میں الحان شریف، بحوالہ نسخہ مطبوعہ گب، لکھا گیا ہے میرے نسخہ میں الحان شیریں ہے اور یہی مناسب تر ہے۔ حمید عفی عنہ

یہ صرف رباعی ہی تک محدود نہیں بلکہ غزل گوئی کے لئے بھی یہی شرط لازم آتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رباعی گو شاعر حکیم فلسفی صوفی یا کوئی ذی علم ہی ہو سکتا ہے، ہر راہ روِ میدان سخن اس راہ میں گام زن ہو کر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

رباعی میں پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور کبھی تیسرا بھی لیکن یہ ضروری نہیں۔ عربی میں چونکہ ہر مصرع ایک شعر ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے رباعی کو قدیم شعرائے عرب چار بیتی کہتے تھے لیکن فارسی کو متاخرین شعراء صرف پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیئے لاتے ہیں ہاں! چوتھی، پانچویں صدی کے شعرائے فارس پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں کے علاوہ تیسرے مصرع کو بھی ہم قافیہ نظم کرتے تھے مگر اس کی پابندی ان کے ہاں بھی لازم نہ تھی اُردو میں فارسی کی تقلید کی گئی ہے، اس لئے اُردو متاخرین فارس کے قدم بہ قدم چلی اور اسی لئے اُردو میں پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ سب سے ضروری بات رباعی میں یہ ہے کہ مقررہ اوزان کے باہر کوئی مصرع نہ ہو۔ بعض ناواقف فن صرف چار مصرعوں کی وجہ سے قطعہ کو بھی رباعی کہہ جاتے ہیں۔ اگر اوزان مقررہ کے اندر مصرعے نہ ہوں گے تو وہ قطعہ کہلائے گا، کوئی اہل فن اُسے رُباعی نہیں کہہ سکتا۔ اس صنف کی عروضی بحث اس جگہ مقصود نہیں، اس لئے اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے۔

اصنافِ سخن میں رُباعی، غزل سے بھی زیادہ مشکل اور نازک صنف ہے۔ کوزے میں سمندر کو بند کرنا پڑتا ہے۔ مشکل سے مشکل فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل، اہم سے اہم اخلاقی نکتے اور سبق آموز ہدایتیں دو شعروں میں نظم کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اُس پر طرّہ یہ کہ پیرایۂ بیان لطیف و دلکش ہو۔ مصرع چُست، الفاظ سنجیدہ، متین اور پُرمغز ہوں۔ چوتھا مصرع بالخصوص رباعی کی جان سمجھا جاتا ہے اور تمام شاعرانہ خوبیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

جس طرح قطعات ابن یمین کے مقابلہ میں اُردو شاعری کوئی وقیع تصنیف اب تک پیش نہ کر سکی۔ اُسی طرح رباعیات حکیم عمر خیام یا رباعیات حضرت فریدالدین عطار موسوم بہ مختار نامہ کے برابر کی کوئی کتاب اُردو ادب میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

اب چند لفظوں میں اُردو کی رباعی نگاری کی داستان بھی سُن لیجئے! تواریخ نظم اُردو کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اور اصنافِ شاعری کے ساتھ ساتھ یہ بھی صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہو کر ضیا بخش دیدۂ مشتاق ہوئی سنہ ۱۷۰۰ء کے قبل ایک شاعر میر عبدالقادر حیدر آبادی کی ایک رباعی ملاحظہ ہو

هر چند ہمیں سب سے اٹھایا ہیہات — اس پر بھی نہ آزاد کہائے ہیہات
عالم میں ہر ایک یہ کہتا ہو گا — دکھن میں ہیں قادر ابھوں در قید حیات

یہ ابتدائی نقش تھا، پھر جیسے جیسے اُردو شاعری ترقی کرتی گئی، اس صنف میں بھی شعرائے اُردو نے طبع آزمائی شروع کی میر و درد کے معاصر شعراء میں سے ہر صاحب دیوان اُستاد نے کم و بیش رباعیاں لکھیں لیکن اُن رباعیوں کو کوئی امتیازی خصوصیت حاصل نہ ہو سکی میر و درد کی ایک ایک رباعی نمونۂ کلام کی غرض سے پیش کی جاتی ہے۔ میر ؎

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے — خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

دردؔ ۔

آرام نہ دن کو بیقراری کے سبب
نے رات کو چین آہ وزاری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھی
یہ کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

میرؔ و دردؔ کے ہمعصر راسخؔ عظیم آبادی بھی ایک رباعی ملاحظے میں آئے :-

دیکھی فقط آرائشِ دنیا تم نے
پیدا نہ کیا دیدۂ بینا تم نے
مصروفِ تماشائے چمن بھی ہے آہ
راسخؔ چمن آرا کو نہ دیکھا تم نے

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جس نے اس صنف میں بھی ایک حد تک اضافہ کی صورت پیدا کی اور میر انیسؔ و میرزا دبیرؔ نے اس طرف خاص توجہ فرمائی۔ انیسؔ مرحوم کے مرثیوں کی طرح اُن کی رباعیاں بھی اُردو شاعری کی روح رواں ہیں۔ میر و میرزا کے بعد پیارے صاحب رشیدؔ مرحوم نے بالخصوص پیری پر بہتر سے بہتر رباعیاں کہیں۔ حالیؔ مرحوم اور اکبرؔ الہ آبادی نے اخلاقی اور نصیحت آمیز رباعیوں کا اضافہ کیا۔ ہمارے اُستادِ مرحوم حضرت شادؔ بھی اسی دور میں آتے ہیں۔ حضرت شادؔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی دام مجدہ یقینی میر وقت تھے اور اپنے دور میں صنف غزل گوئی کے بادشاہ یا بقول حضرت نیازؔ فتحپوری کہ ہندوستان کی سرزمین ادھر نصف صدی سے ایسا غزل گو شاعر نہ پیدا کر سکی لیکن صنعت رباعی نگاری میں ان کو بھی کوئی خاص خصوصیت حاصل نہیں۔ مشاعروں میں وہ رباعیاں نہیں پڑھتے تھے رائے شنکر آج بہادر المتخلص بہ جتی کے ہاں ایک مشاعرے میں (۱۹۱۰ء) ضرورتاً اور موقع کا خیال اور وقت (۴ بجے صبح) پر نظر کر کے برجستہ یہ رباعی پڑھی گئی تھی۔

پھولوں سے لپٹ کے غش ہیں ہر طائر بُو
کیفیتِ یاس شمع سے ظاہر ہے
تم بھی شبِ غم سے ملکے رو لو اے شادؔ
آثارِ سحر ہیں رات اب آخر ہے

جب مرثیہ کہنا اور پڑھنا شروع کیا تو ممبر پر قبل مرثیہ کچھ پڑھنا ضرور تھا، اس لئے رباعیاں کہیں، اور پڑھیں لیکن اس صنف میں حکیم عمر خیامؔ کے طرز کو چھوڑ کر انہوں نے عطارؔ کا رنگ اختیار کیا۔ جدت پسند طبیعت نے جس طرح مرثیوں میں ایک نئی بات پیدا کی اور سب سے الگ راہ نکالی تھی (جس کا ذکر کسی موقع پر آچکا ہے) اُسی طرح اُس طرز کے مقلد ہوئے جس سے اُردو داں اصحاب ایک حد تک مانوس نہ تھے۔ خیامؔ کی رباعیاں پھیل کر شہرت عام حاصل کر رہی تھیں لیکن حضرت عطارؔ کے "مختار نامہ" پر بہت ہی چیدہ چیدہ اُردو داں بزرگواروں کی نظریں پڑی ہوں تو پڑی ہوں، ورنہ اُردو دنیا کے لئے گویا یہ ایک تازہ نقش تھا۔

خیامؔ جبر کا قائل تھا، چنانچہ وہ کہتا ہے :-

از رفتۂ قلم ہیچ دگرگوں نہ شود
وز خوردن غم بجز جگر خوں نشود
گو در ہمہ عمر خویش خونابہ خوری
یک قطرہ ازاں کہ ہست افزوں نشود

لیکن اس جگہ اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ خیامؔ کا یہ جبر مذہبی اعتقاد پر مبنی نہ تھا بلکہ فلسفیانہ دلائل و براہین پر، چنانچہ اُس کا یہ عقیدہ اُس کی فلسفیانہ تحریر سے بھی مترشح ہوتا ہے :-

(شاید جبریہ فرقہ بہ ظاہر حقانیت سے زیادہ قریب ہے یعنی اُن کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے)

حضرت شادؔ اس اصول کے خلاف اور اس عقیدے کے مخالف فرقے کے ہمنوا تھے، چنانچہ فرماتے ہیں :-

یہ سچ کہ ہجوم کار میں رکھا ہے
یہ جھوٹ کہ اضطرار میں رکھا ہے

قانون میں فطرت کے نہیں جبر روا — سب کچھ ترے اختیار میں رکھا ہے

جبر و اختیار کا مسئلہ ایک بہت ہی مابہ النزاع مسئلہ ہے اور میرے مضمون سے اسے کوئی سروکار بھی نہیں، صرف شاد کے عقیدے کے سلسلہ میں یہ چند سطریں قلمبند کر دی گئیں کہ وہ اس مسئلہ میں خیام کے ہم خیال و ہم زبان نہ تھے!

کسی رباعی میں وہ فارسی کی رباعی کا ترجمہ بھی کر گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: خیام ؎

من بندہ عاصیم رضائے تو کجاست — تاریک دلم نور و صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — آن مزد بود لطف و عطائے تو کجاست

شاد ؎

لا کر مجھے دنیا میں جو مہمان کیا — کیا کچھ نہیں میرے لئے سامان کیا
طاعت پہ نہ بخشا کہ وہ مزدوری تھی — یوں بخش دیا تو اور احسان کیا

اعلیٰ اور بلند خیالات، فلسفیانہ مسائل، تصوف و معرفت کے عمیق نکتے بھی اکثر شاد کی رباعیوں میں نظم کئے گئے۔ میں چند رباعیاں بطور نمونۂ کلام اپنے بیان کی تصدیق کے خیال سے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور اُن ہی پر آج کا مضمون ختم کروں گا۔ رباعیوں کی تفصیلی بحث کسی اور موقع کے لئے اُٹھا رکھی جاتی ہے۔ سہیل کا دامن تنگ اور خیالات کی وسعت تھوڑے ہی وقت میں جو کچھ ہو سکا عرض کر دیا گیا بہرکیف! رباعیوں کی جو شان ہونی چاہیے وہ شاد کی ہر رباعی سے ظاہر ہے۔ مشق کی ترجمانی ہر مصرع کر رہا ہے۔ اُردو زبان کا جہاں تک تعلق ہے حضرت شاد نے رباعیوں میں بھی اپنی شمشیر طبع کا جوہر دکھانے میں کسی طرح کوتاہ دستی سے کام نہیں لیا ہے۔ دماغ حکیمانہ تھا طبیعت خود دار، خوشامد بے جا سے احتراز اور امیروں کی چاپلوسی سے کنارہ کش بلکہ خود ایک بڑے گھر کے رُکن رکین تھے، پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کی رباعیاں کسی نقطۂ نظر سے بھی پست تر ہوتیں۔ اللہ خوشامد پسند رئیسوں اور خوشامد کرنے والے شعرا اور ارباب علم سے بچائے کہ جو اپنے ساتھ اپنے کمال اور اپنے علم کو بھی رسوا کرتے ہیں اور قوم کے ایک فرد میں بھی غرور کا مادّہ پیدا کرا کے اُس کو بھی کہیں کا نہیں رکھتے۔

بہرکیف! قارئین کرام یہ بات ضرور ملحوظ خاطر رکھیں کہ یہ اُن کی خاص چیز نہ تھی اور نہ اِس کی طرف کوئی خاص توجہ کی گئی تھی، شاد کی رباعیاں اُن کی غزلوں اور اُن کے مراثی کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتیں لیکن پھر بھی اُردو ادب میں ان کی ایک حیثیت ضرور ہے اور اسی خیال سے یہ چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

ارباب قیود تجھکو کیا دیکھیں گے — خواہان نمود تجھکو کیا دیکھیں گے
رویت کے لئے شرط ہے میدان فنا — پابند وجود تجھکو کیا دیکھیں گے

یہ وہم کسی طرح نہ معقول ہوا — افسوس یقیں بھی شک پہ محمول ہوا
اللہ رے دراندازی عقل انساں — معلوم جو تھا وہ اور مجہول ہوا

کیا حال کہوں اُن کی عجب حالت ہے — مضطر ہوں کہ خلوت ہے نہ اب جلوت ہے
مشتاق پھر اُس شکل کا ہے مدت سے — یہ آئنہ جس شکل کا ہم صورت ہے

کتنی ہی حیات ہو مگر مرنا ہے — تا عمر اسی زیست کا دم بھرنا ہے
دوزخ کیا ہے ہجوم غم میں رہنا — کیا شے ہے بہشت دل کا خوش کرنا ہے

تعبود ہے جس وقت تلک معذوری ہے ۔۔۔ جو فعل ہے معنوی نہیں صوری ہے
لالچ سے بہشت کے عبادت کرنا ۔۔۔ اے شاد عبادت نہیں مزدوری ہے

ہر دم مرے دل میں تو ہی موجود رہے ۔۔۔ ہر قصد میں یار تو ہی مقصود رہے
جب آنکھ اٹھاؤں تیرا جلوہ دیکھوں ۔۔۔ جب سر کو جھکاؤں تو ہی مسجود رہے

آتے ہی یہاں مورد الزام ہوئے ۔۔۔ آفت میں پھنسے بستۂ دام ہوئے
دنیا کا تو خاک کچھ نہ بگڑا لیکن ۔۔۔ دو دن کے لئے مفت میں بدنام ہوئے

طفلی دیکھی، شباب دیکھا میں نے ۔۔۔ پیری کا بھی انقلاب دیکھا میں نے
تعبیر بتائے کون سب سوتے ہیں ۔۔۔ اے عمر! عجیب خواب دیکھا میں نے

جبتک ہے یہ جسم اک گرفتاری ہے ۔۔۔ جب روح جدا ہوئی سبکباری ہے
جینا کہتے ہیں جسکو ہے خواب گراں ۔۔۔ مرنا کیا شئے ہے؟ عین بیداری ہے!

کیوں جلوۂ پُرنور دکھایا تھا مجھے ۔۔۔ دنیا میں عدم سے کیوں بلایا تھا مجھے
آتی ہے صدا شیشۂ شکستہ سے ۔۔۔ جب توڑ دیا تو کیوں بنایا تھا مجھے

مجھ سا کوئی دنیا میں بد انجام نہیں ۔۔۔ جز شغل گناہ اور کوئی کام نہیں
میں حرف غلط ہوں صفحۂ عالم پر ۔۔۔ گر کوئی مٹائے تو کچھ الزام نہیں

آنکھیں نہ کھلیں وہ کم نگاہی نہ گئی ۔۔۔ وہ کینہ کشی، وہ کینہ خواہی نہ گئی
پیری نے تو بالوں کو کیا آ کے سفید ۔۔۔ افسوس مگر دل کی سیاہی نہ گئی

بدلے نہ صداقت کا نشاں ایک رہے ۔۔۔ ہر حال میں پنہاں و عیاں ایک رہے
انساں ہو وہی جو اس دورنگی سے بچے ۔۔۔ لازم ہو کہ دل اور زباں ایک رہے

واعظ جب تک کہ بر سر منبر ہے ۔۔۔ رندوں کی طرف روئے سخن اکثر ہے
انصاف سے اتنا تو بتا دے کوئی ۔۔۔ کیا کینہ کشی سے مے کشی بدتر ہے

کیا دلق ضرور پارسائی کے لئے ۔۔۔ تسبیح فقط ہے خود نمائی کے لئے
اے زاہد سالوس نہ دے مجکو فریب ۔۔۔ ساری ہے یہ بندگی خدائی کے لئے

خود غول ہیں جو دکھا رہے ہیں مشعل ۔۔۔ ڈرتا ہوں کہیں گرا نہ دیں منہ کے بل
اے راہ روِ جادۂ منزلِ عمر! ۔۔۔ دھوکا ہی طلسم ہے سمجھ بوجھ کے چل

کیا مفت کا زاہدوں نے الزام لیا ۔۔۔ تسبیح کے دانوں سے عبث کام لیا
یہ نام تو وہ ہے جسے بے گنتی لیں ۔۔۔ کیا لطف جو گن گن کے ترا نام لیا

بادۂ عرفاں

از جناب شاہ اکرام الدین احمد صاحب عرفانؔ
(رئیس اسلام پور، پٹنہ)

عیاں کیونکر کروں سوزِ نہاں کو
جلا دوں آہ کیا سارے جہاں کو

کوئی پوچھے مرے دل سے جگر سے
تمہارے غمزہائے جانستاں کو

دعائیں ہم نے دیں تم گالیاں دو
صلہ تو کچھ ملے میری زباں کو

یہ رمزِ عاشقی ہے دو نہ الزام
کہوں کعبہ اگر کوئے بتاں کو

پلا کر مے کیا سرشارِ الفت
دعائیں دیجئے پیرِ مغاں کو

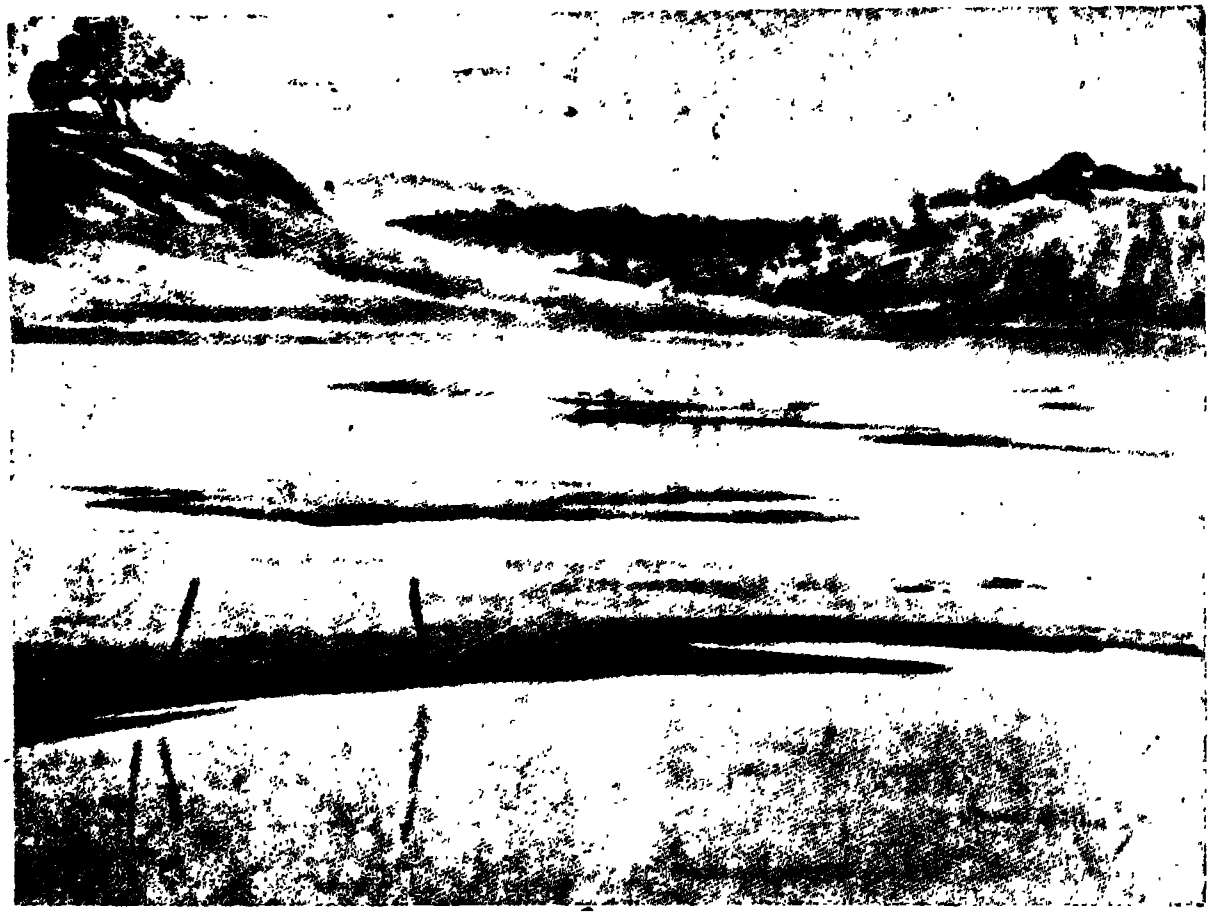
نہیں اب اسمیں باقی طاقتِ ضبط
سنبھالے کوئی میرے ارماں کو

دلِ بیتاب نے عاجز کیا ہے
سنبھالوں کیونکر اس برقِ تپاں کو

متاعِ درد کا مخزن ہے یہ دل
سمجھ ارزاں نہ اس جنسِ گراں کو

بہت کچھ بڑھ گیا ہوں کارواں سے
بہت چھوڑا ہے پیچھے کارواں کو

کوئی پہنچا دے عرفاں کی طرف سے
سلامِ شوق اس آرامِ جاں کو



دریاے برہم پتر کا ایک دلفریب منظر





نغمۂ رباب

ایک رومانی تمثیل جو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ۲۹ نومبر ۳۹ء کو نشر ہوئی

انتساب

"ریحانہ" کے نام جو محبت کی قربانیوں سے واقف ہے

"شرمندۂ محبت .... گوہر"

افراد

ایک صحرائی قافلہ کے تین افراد۔

پہلا شخص۔

دوسرا۔

تیسرا۔

افسانے کے تخیلی کردار۔

خان اسلم۔

شادگل۔

فرید۔

نیلوفر۔

از مفتی گوہر شادانی

آغاز

(پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی میں ایک قافلے کا پڑاؤ۔
مختلف آوازیں)

ایک آواز ہوا کسی قدر تیز ہو گئی ہے۔
دوسری " ہاں۔ آسمان پر بادل بھی چھا گئے ہیں۔
تیسری " شاید طوفان آئے۔
پہلا شخص ہم لوگوں نے اچھا کیا جو میدان میں خیمے نہیں لگائے پہاڑی کی آڑ میں خوف کی کوئی بات نہیں۔
دوسرا " وہ دیکھو چاند نکلا۔ معلوم ہوتا ہے چاندی کی کشتی بادلوں کی طوفانی لہروں کو چیرتی ہوئی کہیں جا رہی ہے۔
تیسرا " یا...... کوئی حسین عورت جھروکے سے تاک جھانک کر رہی ہے۔
پہلا " (قہقہہ) تم شاعر ہو۔
دوسرا " شاعر! یعنی دیوانہ۔

(دور سے رباب کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے اور بتدریج بلند ہوتی ہے)

تیسرا " سنو سنو۔ کوئی رباب بجا رہا ہے۔
دوسرا " ہاں معلوم ہوتا ہے قریب ہی کوئی دوسرا قافلہ بھی ٹھیرا ہوا ہے۔
پہلا " تمہارا خیال غلط ہے۔
دوسرا " کیسے؟
پہلا " اس وادی میں طوفان کی آمد پر جب ہوا تیز ہو جاتی ہے اور چاند بادلوں کی لہروں سے اسی طرح اٹکھیلیاں کرتا ہوا نکلتا ہے تو رباب کا یہ نغمہ اکثر سنائی دیتا ہے۔
دوسرا " اچھا؟ مگر یہ آواز کہاں سے آتی ہے؟
تیسرا " یہ کوئی نہیں جانتا۔
پہلا " شاید...... شاید یہاں پریاں رہتی ہیں جن کے نغمے فضا میں تیرتے ہیں۔
دوسرا شخص (ڈر کر) پریاں؟ اوہ خدایا۔
پہلا " ڈرو نہیں۔ یہاں پریاں نہیں رہتیں۔ اس وادی کے آخر میں تھوڑی دور پر ایک گاؤں آباد ہے۔ یہاں کے لوگ اس نغمہ کی بابت ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کرتے ہیں۔
دوسرا " کیا...... کیا واقعہ ہے؟
پہلا " سنو گے۔
دوسرا " ہاں ہاں ضرور کہو۔ سونے تک وقت کٹ جائیگا۔
پہلا " اچھا تو سنو۔ بہت دن ہوئے ایک مرتبہ اس وادی کے قریب خانہ بدوش کا ایک قبیلہ آکر ٹھیرا۔ اس قبیلہ میں ایک لڑکی تھی نیلوفر۔
تیسرا " آہا۔ نیلوفر۔ نیلوفر۔ پانی کی لہروں پر تیرتی ہوئی جوانی ہنستا ہوا شباب۔
دوسرا " سچ مچ بڑا پیارا نام ہے۔
پہلا " ہاں اور نام کی طرح وہ لڑکی بھی تھی بڑی خوبصورت اور نازک اندام۔ جو اُسے دیکھتا۔ دیوانہ ہو جاتا۔
تیسرا " حُسن...... حُسن کی تباہ کاریاں مسلّم۔
دوسرا " اوہ تم چپ رہو۔ اچھا تو جو اُسے دیکھتا دیوانہ ہو جاتا
پہلا " ہاں لیکن وہ اپنے قبیلہ کے ایک نوجوان کو چاہتی تھی جس کا نام فرید تھا۔
دوسرا " ہوں۔
تیسرا " خوش قسمت۔ خوش نصیب انسان۔
پہلا " نیلوفر بڑی عجیب و غریب طبیعت کی لڑکی تھی۔ وہ جب کسی شہر میں پہنچتی تو غمگین اور افسردہ ہو جاتی۔

اس کے چہرے سے مسرت اور افسوس برسنے لگتا۔ وہ نہ کسی سے بات کرتی اور نہ کسی کی بات کا جواب دیتی۔ لیکن جب وہ شہر سے دور کسی جنگل کسی پہاڑ کسی ویران آبادی صحرا کی گود میں ہوتی تو اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں نور کی بجلی تڑپ اٹھتی۔ اس کی ہر ہر حرکت سے زندگی اور مسرت پھوٹ نکلتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے نسیم سحر کے جھونکے سے گلاب کا پھول کھل گیا ہے۔

دوسرا اگر اس کا نام نیلوفر کی بجائے لالہ ہوتا تو اچھا تھا۔

تیسرا ہاں۔ لالہ...... لالہ صحرا...... آگ کا زندہ شعلہ جو جلنے پر بھی نہیں جلتا۔

دوسرا (تیسرے سے) تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں خدا کے لئے تم چپ رہو (پہلے سے) ہاں تو پھر کیا ہوا؟

پہلا نیلوفر کا قبیلہ اس وادی کے قریب خیمہ زن تھا اور وہ ندی کے کنارے جو ہماری آنکھوں کے سامنے بہہ رہی ہے۔ بیٹھی لہروں سے کھیل رہی تھی۔

دوسرا اس...... اس ندی کے کنارے؟

پہلا ہاں۔

تیسرا خوش قسمت ہے یہ ندی بھی۔

دوسرا (بگڑ کر) تم...... تم پھر بولے۔

پہلا اسے کچھ نہ کہو۔ ہاں تو وہ اس ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ آنکھوں میں خوشی کی چمک۔ وہ ساری دنیا کو بھولی ہوئی کوئی نغمہ گنگنا رہی تھی......

(آواز بتدریج غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ نیلوفر کے گنگنانے کی آواز آتی ہے ایک لمحہ کے بعد کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

فرید نیلوفر۔

نیلوفر فرید

فرید قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ نیلوفر سب جانے کی تیاری کر رہے ہیں

(خاموشی میں نیلوفر کے بدستور گنگنانے کی آواز)

فرید نیلوفر تم نے سنا میں نے کیا کہا؟

نیلوفر ہوں۔ تم نے کیا کہا فرید؟

فرید قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ سب جانے کی تیاری......

نیلوفر اوہ انہیں جانے دو۔ انہیں جانے دو۔ فرید۔

فرید مگر کیا تم ان کے ہمراہ نہ چلو گی۔

نیلوفر میں نہیں فرید۔ میں ان کے ہمراہ جانا نہیں چاہتی۔

فرید مگر آخر یہ کیوں نیلوفر؟ کیا تم ان میں سے نہیں ہو۔ کیا انکی زندگی تمہاری زندگی نہیں ہے؟

نیلوفر نہیں فرید۔ مجھ میں اور ان میں بڑا فرق ہے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ ان کی زندگی میری زندگی بھی نہیں ہے۔ دیکھو نہ۔ وہ...... یہاں سے کسی...... کسی...... بڑے شہر میں پہنچیں گے۔ چاندی اور تانبے کے چند حقیر سکوں کے لئے دھوکے اور فریب کا جال پھیلائیں گے وہ باز نہیں آئیں گے۔ جھوٹ بولیں گے۔ چوری کرنے سے بھی وہ نہیں رکیں گے۔ ان کی کم سن لڑکیاں۔ جن کے ہوش و حواس وقت سے پہلے ہی بیدار ہو چکے ہیں جنکی معصومیت کا دامن ماں باپ کی بے حیائی نے چاک کر دیا ہے۔ اپنے حسن و جوانی کا جادو پھونک کر شہر کے وارفتہ مزاج نوجوانوں کی جیبیں خالی کرنے کے لئے انہیں گناہ کی ترغیب دیں گی۔ مائیں گود کے دودھ پیتے بچوں کا واسطہ دیکر بھیک مانگینگی۔ میں...... میں ان کے ہمراہ گھبرا جاؤں گی۔ میں اُن کی طرز زندگی۔ طرز رہائش۔ ان کی امیدیں اُن کے حوصلے دیکھ دیکھ کر ڈر جاؤں گی فرید...... مجھے یہاں سے نہ لیجاؤ۔

فرید: نیلوفر......

نیلوفر: نہ لے جاؤ پیارے (سانس کھینچکر) یہاں آزادی ہے۔ یہاں سادگی ہے۔ یہاں...... یہاں ہم فطرت کی دوشیزہ سے بہت قریب ہیں۔ یہاں خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔ وہاں۔ میں دل و دماغ کی سوچ کی آزادی کو ترسوں گی۔ فرید۔ وہاں میں آزاد ہونے پر بھی ایک قسم کی قید میں گرفتار رہونگی۔

فرید: مگر نیلوفر۔ میرا شہر میں جانا بہت ضروری ہے اور میں تمہیں یہاں تنہا چھوڑکر نہیں جا سکتا۔

نیلوفر: تمہارا شہر میں جانا بہت ضروری ہے۔ کیوں۔ کیوں فرید؟ اسی لئے نہ کہ تم وہاں محنت مزدوری کرکے بہت سا روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہو تاکہ میرے لئے ریشمی کپڑے خرید سکو پختہ اینٹوں کا خوبصورت مکان تعمیر کرا سکو۔ میرے لئے قیمتی زیور لاؤ فرید جنگلی چڑیا کو سونے کے پنجرے میں قید کرنے کے آرزومند ہو؟

فرید: پیاری نیلوفر۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔

نیلوفر: تو سُنو فرید۔ میری روح سونے چاندی کے زیورات۔ مخمل اور ریشم کے کپڑوں سے خوش نہیں ہوگی۔ مجھے پختہ اینٹوں کے مکان میں آرام نہیں ملے گا۔ میں آزادی کی ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔ میں اس سبزگھاس کے فرش پر دوڑنا چاہتی ہوں۔ میں...... میں چاہتی ہوں کہ سر جھکا کر اس آبشار کی گود میں بیٹھ جاؤں تاکہ اس کی نازک بہترین لہریں میرے جسم کو مل مل کر نہلائیں۔ میرے بالوں میں کنگھی کریں .....

.... (خاموشی)

" میں چاہتی ہوں کہ اس ندی کے تہ میں لیٹ جاؤں تاکہ اس کی سفید چادر میرے جسم کو اپنی نورانی ٹھنڈک میں چھپالے۔ ان لہروں میں پھاند پڑوں اور ان کے ساتھ ساتھ میلوں تک تیرتی چلی جاؤں۔ یہاں تک کہ میں تھک جاؤں۔ آنکھیں بند کرلوں اور جب تمہاری آواز دور سے نزدیک آتے ہوئے گیت کی طرح میرے کانوں میں پڑے تو چونک اُٹھوں۔ تمہیں مسکراتا ہوا دیکھکر میں بھی مسکرا دوں۔ اس کے بعد ہم دونوں۔ ہاتھ میں ہاتھ دئے۔ پہاڑ کے کسی دامن میں۔ پھولوں کی طرح ہنستے کھیلتے سو جائیں۔ اور اُس وقت اُٹھیں جب چڑیاں چہچہا رہی ہوں اور کلیاں ہنس رہی ہوں۔ .... آہ کتنا پیارا خواب ہے۔

فرید: انسان کی پوری زندگی ہی ایک خواب ہے نیلوفر۔ خواب جس کے مختلف رُخ ہیں کوئی تاریک کوئی روشن .... وہ دیکھو قافلہ چل نکلا۔ سب لوگ جا رہے ہیں۔

نیلوفر: ادھر جانے دو۔ انہیں جانے دو فرید۔ پیارے۔ وہ حرص و ہوس کے بندے ہیں۔ اُن کی...... اُن کی اُمیدیں بہک گئی ہیں۔ ارمانوں کو سودا ہو گیا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ لالچ کی چادر کو جس قدر پھیلایا جائے وہ پھیلتی ہے۔ حرص کے سمندر کی کوئی تہ نہیں۔ غرض کا راستہ کسی منزل پر ختم نہیں ہوتا۔ فرید۔ ان کے ارمان اور اُمیدیں انہیں مبارک ہم تم اس خاموش وادی میں اپنی دنیا بسائیں گے۔ یہاں نہ رہزن کا ڈر ہے۔ نہ چور کا کھٹکا۔ یہاں نہ عصمت کے بیوپار کی ضرورت ہے اور نہ حُسن بیچنے کی مجبوری۔ یہاں میں ہوں۔ تم ہو اور...... اور خدا ہے۔

پہلا شخص: نیلوفر یہ کہہ ہی رہی تھی کہ دور سے گرد کا ایک طوفان اُٹھا۔ کنکر اور پتھر ناچتے ہوئے ہوا میں اُڑ اُڑ کر چاروں طرف دیوانہ وار گرنے لگے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں نے فضا کے سکوت کو درہم برہم کر دیا اور چند سوار نوجوانی کی پوری بے پروائی کے ساتھ پہاڑی چوٹی سے اُتر کر وادی میں داخل ہوئے سب سے آگے۔ جوانی کے نشہ میں چور ان کا سردار تھا جسے فرید نے پہچانا کہ وہ خان اسلم ہے۔

خان اسلم پٹھانوں کے اس گروہ کا ہی سردار معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پہاڑوں اور صحراؤں۔ جنگلوں اور وادیوں کا بھی سردار معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر شباب کی سُرخی اور آنکھوں میں مردانگی کا غرور تھا۔ ایک مسلسل قہقہہ اسکے ہونٹوں پر ناچ رہا تھا۔ قریب پہنچکر اس نے نیلوفر اور فرید کو دیکھا۔ اپنی نظریں نیلوفر کے چہرے پر گاڑ دیں اور اس کا بے پرواہ قہقہہ ایک معنی خیز تبسم میں تبدیل ہوگیا۔ دفعتاً وہ گھوڑے سے اُترا اور اس نے نیلوفر کو مخاطب کیا۔۔۔۔

اسلم تم کون ہو ؟

نیلوفر خدا کی ایک مخلوق۔

اسلم نام ؟

نیلوفر نیلوفر۔

اسلم خوب۔ یہاں کیا کر رہی ہو ؟

نیلوفر دل بہلا رہی ہوں۔

اسلم دل بہلا رہی ہو؟ اپنا یا دوشیزۂ فطرت کا ؟

فرید خان کا سوال اخلاق اور انسانیت سے باہر ہے۔

اسلم تم کون ہو ؟

فرید خان کو یہ بھی پوچھنے کا حق نہیں۔

اسلم کیوں نہیں ؟

فرید اس وادی پر ہمارے دلوں اور دماغوں پر خان کی حکومت نہیں۔

اسلم تمہارے جواب میں گستاخی کی جھلک نظر آتی ہے۔

فرید خان چونکہ اپنے کو دوسروں سے افضل اور برتر سمجھتا ہے اس لئے اس کا یہ خیال ہے۔

اسلم ہوں۔ میرے ہمراہ چلو۔

فرید کہاں ؟

اسلم ہمارے پڑاؤ پر۔

فرید کیوں ؟

اسلم میرا حکم۔

فرید ہم کسی کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔

اسلم میں اتنی طاقت رکھتا ہوں کہ تم سے اپنے حکم کی زبردستی تعمیل کرا سکوں۔

فرید وہ تعمیل نہیں ہوگی۔ مجبوری ہوگی۔ دل نہ جھکے تو سر جھک جانے پر بھی نہیں جھکتا۔

اسلم اس نوجوان کو گرفتار کر لو اور اس لڑکی کو بھی۔

نیلوفر اوہ۔

فرید نیلوفر تمہارے کوہساروں کی لامحدود وسعت بھی آزادی سے خالی ہے۔

نیلوفر سچ کہتے ہو۔ پیارے۔ یہ دُنیا اب رہنے کی جگہ نہیں۔

اسلم پیارے ؟۔ یہ تمہارا کون ہوتا ہے۔

نیلوفر میرے دل کا مالک میرا ہونے والا شوہر۔

اسلم لے چلو۔ دونوں کو۔

(گھوڑوں کی ٹاپیں جو بہ تدریج غائب ہوتی ہیں)

دوسرا تم رُک کیوں گئے۔

پہلا ٹھہرو۔۔ ۔۔۔سُنو۔۔۔۔۔۔

(رباب کا نغمہ بتدریج بلند ہو کر فضا میں گم ہو جاتا ہے)

پہلا (ٹھنڈی سانس)

تیسرا بھٹکتی پھرتی ہے، غم نصیب۔ بیقرار روح بھٹکتی پھرتی ہے

پہلا خان اسلم نے نیلوفر کو ایک زرّیں خیمہ میں رکھا۔ اس کے آرام اور آسائش کے لئے ہر طرح کا سامان مہیا کیا۔ کنیزیں دل بہلانے کو۔ نوکر خدمت کے لئے ریشمی اور مخملی لباس اس کے پہننے کو ہر وقت موجود رہتے تھے۔ لیکن نیلوفر خوش نہ تھی اور چونکہ وہ خوش نہ تھی اس لئے خان بھی خوش نہ تھا۔ اب اسے کوئی چیز بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کسی کام میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ ہر وقت ہنسنے اور کھیلنے والا خان غم کی ایک تصویر

ہو گیا تھا۔ افسردگی کا ایک بُت تھا۔ اس کے قبیلے والے یہ حالت دیکھکر بہت آزردہ تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ وہ اس خانہ بدوش لڑکی سے محبت کرتا ہے اور اپنی محبت کو بے اثر دیکھ کر بہت غمگین رہتا ہے۔ مگر بندوقوں سے کھیلنے والے آزاد پٹھان حیران تھے کہ خان مٹی کے ایک کھلونے کو بُت جان کر اس کی پوجا کیوں کر رہا ہے۔ اپنا دل بہلانے کے لئے اُسے توڑ کیوں نہیں ڈالتا۔ مگر وہ خان کے جذبات کو نہیں سمجھتے تھے اس لئے اس کے دل کا حال بھی نہیں جان سکتے تھے۔ ایک دن اس کا خاص ملازم اور دوست شاہ گل اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔۔۔۔۔۔۔

شاہ گل خان!

خان شاہ گل!

شاہ گل بندوقیں زنگ آلود ہوگئی ہیں۔

خان اچھا ہے شاہ گل۔ آگ اور بارود کا کھیل جب تک بند رہے انسانی زندگی امان میں رہتی ہے۔

شاہ گل پہاڑوں کی وادیوں میں ہرن بے کھٹکے گھوم رہے ہیں۔

خان گھومنے دو۔ قدرت نے انہیں بھی زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے۔

شاہ گل میرے بازو بیکار رہنے سے اکڑ گئے ہیں۔ ان میں اکثر درد ہوتا ہے خان۔

خان ورزش کا شوق ڈالو۔ تندرستی کیلئے یہ بڑی ضروری چیز ہے۔

شاہ گل خان آپ کی نظریں ریت کے ذروں میں کیا ڈھونڈ رہی ہیں؟

خان کچھ بھی نہیں شاہ گل!

شاہ گل آپ میری گود میں کھیلے ہیں خان۔ ان بوڑھے بازوؤں نے آپ کو جھولا جھلایا ہے میں۔۔۔۔ میں اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔

خان یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ شاہ گل!

شاہ گل میں۔۔۔۔ میں کل صبح اصطبل میں گیا تھا۔ آپکے گھوڑے نے میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ہیں۔۔۔۔ میں بھی جب آپ کو دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اب آپ کے قہقہے ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر واپس نہیں لوٹتے۔ آپکے گھوڑے کی ٹاپ اور بندوق کی آواز سے اس کوہستان کا سینہ شق نہیں ہوتا۔ آخر یہ کیوں؟ کس لئے خان؟

خان میری۔۔۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔

شاہ گل ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ خان۔ اِن گالوں پر وہ تندرستی کی سُرخی نہیں رہی۔ جو کبوتر کے تازہ خون کو شرماتی تھی اِن آنکھوں میں وہ تیزی اور چمک نہیں رہی جس پر عقاب سر جھکا لیتا تھا (یکایک بگڑ کر) خان۔ خان۔؟

خان ہاں شاہ گل۔

شاہ گل ایک دن۔۔۔۔ ایک دن آپ مزہ پائیں گے۔ میرے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کر دیں گے۔

خان نہیں نہیں۔ شاہ گل یہ نہیں ہوگا۔ یہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر وہ۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ زندہ ہے تو میں بھی زندہ ہوں۔ تم میری جان لینا کبھی نہ چاہو گے۔

شاہ گل تو پھر اس کی ایک ہی صورت ہے۔

خان وہ۔۔۔۔۔۔ وہ کیا شاہ گل؟

شاہ گل آپ مجھے مار ڈالیئے۔

خان تم پاگل ہو گئے ہو۔

شاہ گل خان۔ خیمہ کے باہر میدان میں نظر ڈالو۔ ہر طرف اندھیرا ہے اس لئے کہ چاند ابھی تک نہیں نکلا۔ میرے دل میں بھی اسی طرح اندھیرا ہے۔ اس لئے کہ آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی کرن۔ ہنسی کی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر اس

اندھیرے میں راہ چلتے مسافروں کی طرح میں بھی بھٹک جاؤں تو قصور کس کا ہوگا ؟

خان میرا..... میرا شاہ گل۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

شاہ گل خان۔ خورشید کو ایک حقیر ذرّے کی اتنی پرواہ کرنی چاہیئے مخمل کے لباس میں ٹاٹ کا پیوند زیب نہیں دیتا۔

خان گلاب کا پھول جنگل میں کھلے یا کسی سلطان کے محل میں وہ گلاب کا پھول ہی کہلائے گا۔

شاہ گل جنگلی گلاب کا پھول خان۔

خان خوشبو دونوں کی ایک ہوگی۔

شاہ گل نہیں خان۔ خوشبو میں بھی فرق پائے گا۔

خان میں اس وقت تھک گیا ہوں شاہ گل۔ میرا دماغ بالکل بیکار ہو چکا ہے۔ اس بحث کو ختم کرو۔

شاہ گل میں.....

خان میں..... میں ذرا باہر جاؤں گا۔ یہ ٹھنڈی ہوا اور خاموش تاریکی شاید مجھے سکون پہنچائیں۔

(جانے کی آواز خاموشی)

پہلا شخص خان اپنے خیمہ سے نکلا تو ٹہلتا ہوا غیر ارادی طور پر نیلوفر کے خیمہ کے قریب پہنچ گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ سر جھکائے۔ اداس شمع کی طرح۔ ایک کونے میں بیٹھی ہے اس کی آنکھیں نیم وا ہیں اور آنسوؤں کے دو قطرے اس کی پلکوں پر رک گئے ہیں۔ خان یہ دیکھکر بیقرار ہو گیا۔ نیلوفر کے قریب پہنچ کر اس نے اس کے تلوار یں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور کہا.........

خان نیلوفر!

نیلوفر خان!

خان تم رو رہی ہو؟ حالانکہ میں ان ہونٹوں پر ہنسی اور ان آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتا تھا۔

نیلوفر خان۔ جب آسمان پر بادل چھائے ہوں۔ دنیا رات کی تاریکی میں ڈوب چکی ہو۔ تو سورج کی کرنیں دکھائی نہیں دیتی ہنسی اور خوشی بھی سورج کی کرنیں ہی ہیں جو غم کے اندھیرے میں نظر نہیں آیا کرتیں۔

خان تم غمگین ہو۔ نیلوفر؟

نیلوفر میں خوش نہیں ہوں خان!

خان مگر کیوں۔ کیا میں نے اس خیمہ کی محدود دنیا کو تمہارے لئے جنّت میں تبدیل نہیں کر دیا کیا میں نے ریت کے ان بیشمار ذروں کو تمہاری خاطر ستاروں میں نہیں بدل دیا۔ کیا میں نے اپنی زندگی تمہاری خدمت اور راحت کے لئے وقف نہیں کر دی نیلوفر؟

نیلوفر آپ نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن اس سے فائدہ؟ جسم کی آسائش سے روح کی تکلیف کم نہیں ہوتی۔ جنگل کا پرندہ سونے کے پنجرے میں کبھی خوش نہیں رہتا۔ آپ نے میرے جسم کو آرام ضرور پہنچایا ہے خان لیکن روح کو قید کر رکھا ہے۔

خان یہ تم کیا کہہ رہی ہو نیلوفر؟ میرا کوئی ارادہ بھی اس قدر گستاخ نہیں ہو سکتا۔ میں..... میں تو ایک..... ایک بھکاری ہوں۔ جو تم سے محبت کی بھیک مانگتا ہے۔ جو تمہارے منہ سے محبت کا ایک لفظ صرف ایک لفظ نیلوفر۔ سننے کے لئے بےچین ہے۔ اور..... اور..... جس کے عوض وہ اپنا جسم۔ اپنی جان۔ اپنی روح۔ غرضیکہ اپنا سب کچھ بیچ دیگا۔ نیلوفر غور تو کرو۔ کیا دنیا میں کوئی شخص ایک لفظ کی اتنی قیمت ادا کریگا؟

نیلوفر محبت دل کا سودا ہے۔ خان۔ یہ بس کی بات نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی مرضی کے سامنے سر جھکا دوں۔ آپ کو اپنے دل کا حاکم بناؤں۔ اپنے آپ کو آپکی تمناؤں پر قربان کر دوں۔ میں تو یہاں تک چاہتی ہوں کہ آپ کے

قدموں میں بچھ جاؤں تاکہ آپ مجھے روندتے ہوئے کچلتے ہوئے۔ پیستے ہوئے نکل جائیں مگر میں کچھ بھی نہیں کرسکتی مجھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

خان تو میرے لئے کوئی اُمید نہیں نیلوفر؟ میری آرزوئیں کبھی پوری نہ ہوں گی؟ ؟ میرے ارمان کبھی بر نہ آئیں گے؟؟؟

نیلوفر خان۔ بلبل کو لوگ قید کرتے ہیں۔ وہ چہکتی ہے۔ گاتی بھی ہے۔ مگر وہ نغمے نہیں ہوتے۔ ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد ہوتی ہے۔ بے چین۔ بیقرار۔ پیاسی روح کی ہچکیاں آنسوؤں سے لبریز ایک نوحہ۔ ایسے نغمے میں بھی گاؤں گی۔ مگر انہیں سُنکر خوش ہونے کی بجائے آپ کا دل افسردہ ہوجائے گا آپ کی محفل گرم ہونے کی جگہ سرد پڑجائے گی۔ یہ سودا کچھ مفید ثابت نہیں ہو گا۔ خان۔

خان میں.... میں.... تمہارے قدموں میں جواہرات کا ڈھیر لگا دوں گا۔

نیلوفر میں انہیں کنکر اور پتھر سمجھوں گی۔

خان سونے کے زیورات سے بھرے ہوئے صندوقچے!

نیلوفر سُنہری زنجیریں خان!

خان سنگ مرمر کے محل!

نیلوفر سنگین قید خانہ! جہاں میری روح آزادی کو ترسے گی۔ جہاں کی ہوا زہر آلود ہوگی۔ جس کی فضا میں موت کا دھواں بھرا ہوگا۔ ایک قبر جس میں آپ مجھے زندہ دفن کردیں گے نہیں نہیں۔ خان مجھے معاف فرمائیے۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتی۔ صرف آزادی چاہتی ہوں۔

خان نیلوفر! نیلوفر!! میری محبت کی دُنیا تمہارے ریگستان سے تمہارے پہاڑوں کی وادیوں سے زیادہ کشادہ ہے۔ اس میں اتنی وسعت ہے۔ نیلوفر کہ ساری کائنات۔ یہ چاند اور سورج کی پوری راجدھانی۔ اس میں سما جاتی ہے تم اس میں قدم تو رکھ کر دیکھو۔ تمہیں میری باتوں کی سچائی معلوم ہو جائے گی۔

نیلوفر خان مجھے معاف کرو۔ وہی صحرا جس میں بگولے اُٹھتے ہیں دھوپ کی گرمی سے ریت کے ذرّوں میں پارے کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے ہوائیں ناچتی ہوئی زمین پر اُترتی ہیں۔ میرا وطن ہے۔ وہ سرسبز وادیاں جہاں سبزہ ہر وقت مُسکراتا رہتا ہے۔ پھول ہنستے رہتے ہیں ندی کا پانی۔ جوانی کے خمار میں چٹانوں کو چھیڑتا۔ اٹکھیلیاں کرتا بہتا رہتا ہے۔ میرا گہوارہ ہے۔ میں صرف وہیں۔ اسی دُنیا میں خوش رہ سکتی ہوں۔

خان نیلوفر!

نیلوفر ہاں خان!

خان عورت کو زندگی کا یہ وسیع ریگستان طے کرنے کے لئے ایک رفیق کی ضرورت ہوتی ہے۔

نیلوفر میں وہ رفیق چُن چکی ہوں خان۔

خان وہ کون؟...... اوہ ہاں۔ میں اسے بالکل بھول گیا تھا

(خاموشی)

خان نیلوفر۔

نیلوفر خان۔

خان وہ ایک بھکاری ہے۔

نیلوفر میں بھی ایک بھکارن ہوں خان۔

خان مگر پھر بھی نیلوفر.......

نیلوفر بحث بیکار ہوگی خان۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکی کہ محبت دل کا سودا ہے یہ اپنے بس کی بات نہیں۔

خان میں... میں یہ نہیں مان سکتا۔ مجھے اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

نیلوفر وہ میرا ہمجنس ہے۔ ہم دونوں ایک ہی جنگل کے دو خودرو

پودے ہیں۔ ایک..... ایک ہی صحرا کے دو ذرّے۔ ہماری فطرت اور ہمارا مذہب ہمارے خیالات ایک ہیں آپ کو بھی ایسی ہی شریک حیات۔ رفیق زندگی ڈھونڈنی چاہئے۔ جو آپ کی طرح کسی قبیلے کی سردار ہو کسی خان کی بیٹی۔

خان تم دل کی مجبوریوں سے واقف نہیں ہو۔ نیلوفر۔

نیلوفر (ہنسکر) انہیں مجبوریوں کا رونا تو میں بھی رو رہی ہوں خان تم اپنے دل سے مجبور ہو اور میں اپنے دل سے۔

خان ہاں نیلوفر مجبوریاں دونوں طرف ہیں۔ میں اگر چاہوں تو تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر اپنے ارادے کے سامنے جھکا سکتا ہوں۔ ہمارے دل کو اپنی خواہش کی ایک بے پروا ٹھوکر سے چکنا چور کر سکتا ہوں۔ مگر میں یہ کیوں نہیں کرتا۔ نیلوفر وہی دل کی مجبوری۔

نیلوفر کاش.... کاش میں اس محبت کا جواب محبت سے دے سکتی۔

خان مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں نیلوفر۔ مجھے اپنی محبت سے شکایت ہے۔ اپنی دعا سے۔ اپنی التجا سے شکایت ہے جس میں کوئی اثر کوئی جادو۔ کوئی طاقت نظر نہیں آتی۔ ...... رات ہو گئی ہے نیلوفر۔ وہ دیکھو چاند کسی اُداس بیوہ کی طرح سر جھکائے نکل آیا۔ مگر نہیں۔ شائد یہ بھی میری نظروں کا قصور ہے۔ وہ بھلا اداس کیوں ہونے لگا...... اچھا تم اب سو جاؤ نیلوفر۔ میں کل صبح تمہیں اور..... اور..... تمہارے فرید کو آزاد کر دوں گا۔

نیلوفر خان۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے مجھے دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔

خان تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں نیلوفر۔ مگر ان میں ہنسی جھلک رہی ہے۔ آہ۔ میں یہی ہنسی اور انہی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر ان آنسوؤں کے بغیر..... یہ میرے لئے ہیں اور..... اور..... وہ ہنسی فرید کے لئے.... کس

......کس قدر خوش نصیب ہے وہ........

(جانے کی آواز خاموشی)

پہلا شخص تم سو گئے؟

تیسرا ہیں؟ نہیں۔ میرے کان تمہاری آواز سن رہے تھے اور میری آنکھیں ایک خواب دیکھ رہی تھیں۔

دوسرا خواب؟

تیسرا ہاں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میری نظروں کے سامنے ایک خوبصورت زرّیں خیمہ ہے کسی سلطان کے خیمہ کی طرح آراستہ کافوری شمعیں جل رہی ہیں قیمتی قالین ہر طرف بچھے ہیں.........

دوسرا اونہہ... دیوانہ... (پہلے سے) ہاں تو تم بتاؤ پھر کیا ہوا کیا خان نے نیلوفر کو آزاد کر دیا۔

تیسرا (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) خیمہ میں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر نور برس رہا ہے فرشتے اس کے حضور میں جھکے ہیں۔

دوسرا فرشتے؟ (قہقہہ) ہم نے خواب میں فرشتے بھی دیکھے ہیں؟

تیسرا ہاں نور کے بنے ہوئے انسان اونچے پہاڑ کی دو برفانی چوٹیوں کی طرح سفید۔

دوسرا (جھنجھلا کر) تم مجھے پاگل کر دو گے۔ (پہلے سے) ہاں تو تم کیا سوچنے لگے۔ کچھ آگے کہو۔

پہلا (چونک کر) ہوں...... ہاں سنو۔ خان اسلم جب نیلوفر سے رخصت ہو کر اپنے خیمہ کی جانب لوٹا تو شاہ گل اُسے راستہ میں ملا۔ خان نے اسے پاس بلایا اور کہا........

خان "شاہ گل میں نے فیصلہ کیا ہے کہ صبح سورج نکلتے ہی نیلوفر اور اس کے ہمراہی کو آزاد کر دوں۔

شاہ گل آزاد خان؟ شکاری چڑیا کو پکڑ لینے کے بعد اسے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔

خان ہاں شاہ گل۔ اس نوجوان نے سچ کہا تھا۔ اگر دل نہ جھکے تو سر جھک جانے پر بھی نہیں جھکتا۔

شاہ گل آج کل ہر بات پر تمہارے آنسو کیوں نکل آتے ہیں خان تم اسے دل کی مجبوری ہی کیوں نہ کہو مگر ہمارے قبیلہ کے سردار کو یہ کمزوری زیب نہیں دیتی۔

خان مجھے اس کا بھی اعتراف ہے۔ شاہ گل۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ قدرت نے زبردست غلطی کی، جو مجھے تمہارے قبیلہ میں سردار بننے کو پیدا کیا۔ میں اس پتھر جیسے سخت سینے میں موم کا سا نرم دل رکھتا ہوں۔

شاہ گل پہلے تو یہ حالت کبھی نہ تھی خان!

خان ہاں شاہ گل۔ شاید یہ گداز بھی نیلوفر کی محبت نے پیدا کر دیا ہے

شاہ گل (بگڑ کر) محبت؟ تم کسی میدان کے رہنے والے محلوں کی گود میں۔ عورتوں کے درمیان پرورش پائے ہوئے شاعر کی سی باتیں کر رہے ہو۔ خان۔ یہ کسی بزدل یا حوصلہ مریض کی طرح ہر وقت آہیں بھرنا۔ یہ کسی نیم پاگل۔ کم عقل دیوانے کی طرح آسمان کو تکتے رہنا یا نظر کو زمین کی گہرائیوں تک دوڑانے کی کوشش کرنا تمہارے نزدیک عشق ہوگا میرے نزدیک نہیں۔ تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر، تمہاری ٹھنڈی سانسیں سُنکر، تمہارے مایوسی سے لبریز آنسوؤں پر رحم کھا کر تمہاری محبت کا جواب محبت سے دینے لگے۔ مگر کیا یہ محبت ہوگی خان زیادہ سے زیادہ محبت سے بہت ترس، وہ تم پر ترس کھائیگی۔ لیکن محبت کبھی نہیں کرے گی۔

خان یہ.... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ شاہ گل

شاہ گل میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جو چیز تمہیں پسند آگئی وہ تمہاری ہو چکی۔ سمجھے اگر مرد ہو، تو دنیا کی کوئی طاقت اسے تم سے نہیں چھین سکتی۔ مرد بنو اور اگر یہ خوبصورت کھلونا تمہیں آسانی سے نہیں ملتا تو زبردستی چھین لو اسے توڑ ڈالو۔ خان مگر دوسرے کے کھیلنے کیلئے باقی نہ رہنے دو۔

خان مگر.... مگر اس کا دل جو ٹوٹ جائے گا۔ وہ رو جوئے گی۔

شاہ گل اونھہ۔ میں کہتا ہوں کہ انسان ہر روز ہزاروں پھول توڑتا ہے۔ مگر وہ کبھی غور نہیں کرتا کہ پھولوں کے جذبات کیا ہیں۔

خان ہوں۔

شاہ گل دیکھو نہ خان۔ جب ہم تم جنگل میں شکار کھیلنے جاتے تھے تو بندوق کے مُنہ سے آگ کے شعلے برسا کر سیلڑوں بے زبان جانیں تلف کر دیا کرتے تھے مگر ہم نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

خان شاید تم ٹھیک کہتے ہو شاہ گل۔

شاہ گل شاید نہیں۔ دُنیا کا یہی دستور ہے خان۔ فطرت کا یہی تقاضا ہے

خان مگر اس کا دل میری محبت سے خالی ہے۔ وہاں دوسری شمع جل رہی ہے۔

شاہ گل اس شمع کو بجھا دو۔ ایک شمع کی حقیقت ہی کیا ہے۔

خان تم.... تم مجھے بڑا لالچ دے رہے ہو شاہ گل۔ آہ۔ میں اسے بے طرح چاہتا ہوں وہ میری رگ رگ میں سما گئی ہے۔ وہ میری روح میں جذب ہو گئی ہے۔ قسم ہے خدا کی وہ مجھے اپنے اور...... دُنیا کی ہر چیز کے درمیان موجود دکھائی دیتی ہے۔ اس نے تو مجھ سے رات کی نیند بھی چھین لی۔ اس نے تو میرے خوابوں پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ شاہ گل..... شاہ گل۔ اگر وہ مجھ سے چھین گئی تو میں زندہ کیسے رہوں گا۔

شاہ گل رات تاریک ہے۔ آسمان پر بادل چھا گئے ہیں۔ چاند نے بھی مصلحتاً مُنھ چھپا لیا ہے۔ اس نوجوان کی چیخیں اس وقت نہ تو عرش تک پہنچیں گی اور نہ کسی آسمان تک۔

خان تم..... تم یہی مناسب سمجھتے ہو شاہ گل۔

شاہ گل ہاں خان۔ اس مرض کا صرف یہی علاج باقی ہے۔ تم اپنے خیمہ میں جاؤ اور اس کی تقدیر کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔

خان آہ۔ میرے ارمانوں کی دیوی کو اگر اس قربانی کی ضرورت نہ پڑتی تو اچھا ہوتا۔

شاہ گل قسمت کی باتیں انسان کی عقل اور سمجھ سے بہت دور ہیں خان۔

(دونوں جاتے ہیں)

پہلا شخص خان، شاہ گل سے رخصت ہو کر اپنے خیمہ میں آیا اور کئی روز کے بعد آج اس نے پہلی مرتبہ حکم دیا کہ اس کے دربار کی گانے اور ناچنے والی صحرائی پریوں کو بلایا جائے۔ حکم کی دیر تھی کہ نغموں کا ایک محشر، رقص کا ایک طوفان اٹھا اور خیمے کی فضا پر چھا گیا۔

(پس منظر رقص و سرود کی آواز جو بتدریج بلند ہوتی ہے)

" خان مسند پر نیم دراز۔ ان حوران ارضی کو گھور رہا تھا لیکن وہ محسوس کرتی تھیں کہ اس کی آنکھیں کہیں اور ہیں۔ دل کسی دوسری دنیا میں ہے........ یکایک اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا جیسے ابھی..... ابھی وہ نیند سے بیدار ہوا ہے اور چیخ کر کہنے لگا........

خان بند کرو یہ ساز۔ روک دو یہ گانا۔ جاؤ۔ تم میرے ہوش و حواس پر قابو پا رہی ہو........

پہلا شخص سماں ہر طرف خاموشی ہو گئی۔ سناٹا چھا گیا۔ گانے والیاں ڈر کر ایک دوسری کے پیچھے چھپتی باہر نکل گئیں........

خان (خود بخود) یہ میں نے کیا کیا۔ اپنی..... اپنی محبت کا خون اپنے وعدے کا خون۔ نیلوفر کے نازک دل کا خون۔ آہ۔ میں خونی ہوں مجھے کہیں امان نہیں ملے گی۔

(خاموشی)

" مگر میں اسے زندہ کیوں رہنے دوں۔ نیلوفر کی خاطر؟ اس کے لئے؟..... نہیں..... کبھی نہیں ہرگز نہیں۔ وہ...... وہ میری ہے۔ اسے میرا بننا ہوگا آج نہیں کل سہی۔

(خاموشی)

محبت کا سودا ہے۔ یہ بس کی بات نہیں۔ اس نے یہی کہا تھا۔ دل کا سودا ...... شاہ گل کہاں چلا گیا...

...... مجھے نیند آ رہی ہے —— سو جاؤں......

وہ بھی سو رہی ہوگی۔ وہ —— میری نیلوفر ——

(خاموشی)

" (یکایک گھبرا کر) نیلوفر۔ نیلوفر آنکھیں خشک کر دو۔ آنسوؤں کو پونچھ ڈالو۔ ان ندیوں میں میری روح ڈوب رہی ہے جیسے تسلی دیتے ہوئے) ہاں۔ ہاں۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ رہے گا نیلوفر۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی طاقت اسے تم سے چھین نہیں سکتی۔ شاہ گل۔ خنجر پھینک دو۔ زنجیریں کھول دو شاہ گل اور اسے آزاد کر دو۔ سنتے ہو ہوا میں تیرنے والے پرندے کی طرح آزاد.........

ہیں۔ کیا میں سچ مچ سو گیا تھا۔ مگر وہ میرے سامنے تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ رو بھی رہی تھی اور ...

... اور...... مجھے شاہ گل کا خنجر اندھیرے میں بجلی کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کہاں ہے۔ شاہ گل۔ ظالم۔ خونی۔ مجھے بہکانے والا۔ شاہ گل۔ شاہ گل ٹھہر ٹھہر۔ میرا انتظار کر.........

(دوڑنے کی آواز)

پہلا شخص دیوانہ وار۔ وحشت زدہ۔ خان اس خیمہ کی طرف دوڑا گیا۔ جہاں فرید اس خطا پر کہ وہ نیلوفر سے محبت کرتا تھا اور وہ اسے چاہتی تھی۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنی زندگی کا ماتم کر رہا تھا اور جہاں اس وقت شاہ گل قسمت کے فرشتے کی طرح اسے اپنا آخری فیصلہ سنا رہا تھا.........

شاہ گل تو نے میرے شاہزادے۔ میرے خان کے دل کو مرجھا دیا ہے

اس کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی ہے۔ اس کی دُنیا اندھیری کر رکھی ہے۔ تیرے جیتے جی اس کے دل کی آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اُٹھ....... مرنے کی تیاری کر۔

فرید تو مجھے قتل کرنے آیا ہے۔

شاہ گل میں تجھے اپنے آقا کے راستے سے ہٹانے آیا ہوں۔ تو اس کی راہ میں ایک کانٹا ہے۔ جو اس کے دامن میں اُلجھتا ہے اُسے پریشان کرتا ہے۔

فرید (قہقہہ) تم سمجھتے ہو کہ دنیا کی ہر چیز کی طرح موت پر بھی تمہارا قبضہ ہے۔ بیوقوف۔ اگر مجھے اس گھڑی مرنا ہے تو یاد رکھ تیرے خان کی آسودگی کی خاطر نہیں بلکہ قدرت کو اپنے کسی نامعلوم ارادے کی تکمیل کے لئے میری موت کی ضرورت ہے۔ مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر تیرے خان کو مجھ سے کیا تکلیف پہنچی ہے۔

شاہ گل صاف صاف سُننا چاہتا ہے تو سُن اُس کی زندگی کی آرزو اور اس کے دل کا چین چھین رہا ہے۔

فرید میں ؟

شاہ گل ہاں تُو...... تُو......

فرید یہ کس طرح ؟

شاہ گل خان ایک پھول کو پیار کرتا ہے مگر وہ پھول کسی دوسری بلبل کا شیدائی۔

فرید چُپ۔ بدمعاش۔ میں غریب ہوں لیکن بے غیرت نہیں۔ ہونٹ سی لے۔ ورنہ شاید موت کا فرشتہ اپنا ارادہ بدل ڈالے۔ یاد رکھو۔ میری جگہ تو بھی مر سکتا ہے۔

شاہ گل مجھے دھمکی دیتا ہے۔ ان چہرے کی جھریوں پہ نہ جانا۔ ان بوڑھے ہاتھوں میں ابھی تک فولاد کی سختی باقی ہے۔

فرید آہ...... آہ......

شاہ گل مردود جھکا سر......

(پاؤں کی آواز)

خان ٹھہر۔ ٹھہر۔ شاہ گل ٹھہر جا۔

شاہ گل کون۔ خان ؟

خان خنجر کو نیام میں کر لو۔ شاہ گل۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے

شاہ گل مگر خان........

خان جانے بھی دو شاہ گل۔ بلبل اگر پنجرے میں گائی بھی تو اس نغمہ میں محبت کا سوز نہ ہوگا۔ اس بدنصیب کی زنجیریں کھول دو اور اسے کسی دوسرے خیمے میں لے جاؤ۔ صبح میں دونوں کو آزاد کر دوں گا۔

شاہ گل خان..... خان.........

خان ایک لفظ نہیں۔ ایک لفظ نہیں شاہ گل۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں دنیا میں ہر روز ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب تک ایک گھر نہ لٹے دوسرا آباد نہیں ہوتا۔ میرے دل کے ٹکڑوں پہ نیلوفر کی مسرّت کا محل تعمیر ہوگا میری حسرتوں کے خون سے اس کے ارمانوں کا باغ سینچا جائے گا۔ جا خوش قسمت خوش بخت انسان میں تجھ پر رشک نہیں کرتا۔ اس لئے کہ محبت ناکام ہونے پر بھی کامیاب ہوتی ہے۔ اصل میں جسم روح کی فتح ہے۔ تم بھی فتحمند ہوا اور میں بھی.........

پہلا شخص صبح ہوئی سورج نکلا۔ دور پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں چاندی کا ڈھیر بن گئیں۔ ندی کا پانی ڈھلے ہوئے سونے میں تبدیل ہو گیا۔ خان اپنے خیمہ سے نکلا۔ اس نے نیلوفر اور فرید کو پاس بلایا اور کہا۔

خان جاؤ نیلوفر۔ کوہسار کی ہوائیں۔ چشمے کی لہریں۔ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ندیاں تمہیں پکار رہی ہیں۔ جاؤ۔ آزادی کی اسی دنیا میں۔ محبت کے گیت گاؤ آسمان ہمیشہ تم پر اپنے سکھ کا سایہ رکھے اور زمین خوشی کی میٹھی لوریاں دیتی رہے۔

نیلوفر میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتی خان۔ میرا سر اور دل جب کبھی بھی خدا کے حضور میں جھکیں گے۔ میرے ہونٹوں سے تمہارے لئے دعائیں نکلینگی۔

فرید خان آج سے یہ ہاتھ اور یہ بازو تمہارے زرخرید ہیں دُنیا کے جس حصّے سے پکاروگے میں لبیک کہونگا۔

خان شکریہ میں اسے یاد رکھونگا فرید۔ شاہ گل گھوڑے تیار ہیں؟

شاہ گل ہاں خان۔

خان انہیں سوار کرا دو۔

(گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز جو بتدریج کم ہوتی ہے)

تیسرا شخص محبّت کی قربانیاں۔ آہ محبّت کی قربانیاں۔ (رُک کر) ...... جاری رہیں گی۔ بدستور۔ ازل سے ابد تک۔

دوسرا یہ شخص دیوانہ ہے۔ ضرور دیوانہ ہے (پہلے سے) ہاں تو پھر کیا ہوا۔ خان نیلوفر کی یاد کو بھول گیا؟ اس نے شادی کر لی اور بیوی بچوں کے ساتھ.......

تیسرا بیوی بچوں کے ساتھ.... (قہقہہ) (جاتا ہے)

(جانے کی آواز)

دوسرا کہاں چلا گیا یہ؟ ایسے پاگل کو ساتھ نہ رکھنا چاہئے۔

پہلا پاگل؟ اُسے نہ کہو۔ وہ ہم دونوں سے ہوشیار ہے۔

دوسرا اونہہ ہوگا۔ ہاں تو خان نے نیلوفر اور فرید کو آزاد کر دیا۔

پہلا ہاں۔ خان نے نیلوفر اور فرید کو آزاد کر دیا۔ مگر اب وہ گوشت و پوست کا ایک متحرک پتلا تھا۔ ایک دیوانہ جو صرف تخیل کی دُنیا میں رہتا ہو وہ اکثر اس وادی میں آیا کرتا اور پہروں اس ندی کے کنارے بیٹھا رہتا شاہ گل اور اس کے دوسرے ہمراہی بھی ساتھ آتے گرچپ چاپ دل گرفتہ پاس بیٹھے اُسے تکتے رہتے۔ ایک دن حسب معمول۔ اسی ندی کے کنارے لہروں پر نظریں جمائے وہ بیٹھا تھا کہ اس نے شاہ گل کو بلا کر کہا........

خان شاہ گل۔ میرا رباب لاؤ۔ آج میں چاہتا ہوں ان نغموں سے دل بہلاؤں۔

شاہ گل ابھی حاضر کرتا ہوں خان۔

(خاموشی)

〃 رباب حاضر ہے خان۔

خان اسکے بیجان تاروں میں میرے ہاتھوں کی جنبش زندگی کی لہریں پیدا کر دے گی۔ جس طرح محبت نے میرے دل میں حیات کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔

(تاروں کو چھوتا ہے)

〃 کیا بجاؤں۔؟ کوئی آنسوؤں کا گیت۔ جس میں کسی تڑپتے ہوئے دل کی فریاد ہو۔ مایوس حسرتوں کا نوحۂ غم۔ برباد آرزوؤں کے ماتم کی صدا...... اپنی روح کو اس کے ذریعہ سے آج ہوا میں منتشر کر دوں۔ فضا میں بکھیر دوں۔

(ایک سوگوار نغمہ چھیڑتا ہے)

یہ میں کیا بجا رہا ہوں؟ انسان کی زندگی رونے کیلئے نہیں۔ خوش ہو اسلم۔ اور خوشی کے گیت گا۔ تیرے جسم میں زندگی کا خون موجیں مار رہا ہے۔ تیری آنکھوں میں زندگی کا نور اور تیرے ہونٹوں پر زندگی کی سُرخی تڑپ رہی ہے....... تو موت کے قصے کیوں لے بیٹھا....... وہ چلی گئی۔ بس اتنا ہی ہوا نہ؟ جانے دے اُسے بھول جا اُسے۔ یہ بھی ایک خواب سمجھ ہاں ایک خواب۔ خواب اور کچھ نہیں.........

(پورے جوش کے ساتھ ایک طرب انگیز نغمہ چھیڑتا ہے جو بتدریج بلند ہوکر ساری فضا پر چھا جاتا ہے اسکے بعد ایک جھنکار کی آواز آتی ہے نغمہ بند ہو جاتا ہے ساتھ ہی ایک سسکی سُنائی دیتی ہے)

شاہ گل خان۔ خان۔

خان تار ٹوٹ گیا۔ شاہ گل۔

شاہ گل اس رباب کو پھینک دو خان۔ میں دوسرا حاضر کرتا ہوں۔

خان رباب ٹوٹ جائے تو دوسرا مہیا ہو سکتا ہے۔ شاہ گل۔ لیکن اگر دل ٹوٹ جائے تو ۔۔۔۔۔۔۔ میں پھر وہی قصہ لے بیٹھا (قہقہہ) یہ سامنے سے گرد کیسی اُٹھ رہی ہے شاہ گل؟

شاہ گل آندھی معلوم ہوتی ہے خان۔

خان ہوں۔ جاؤ دوسرا رباب لاؤ۔

شاہ گل مناسب ہوگا کہ ہم لوگ آندھی کے زور پکڑنے سے پہلے گاؤں واپس چلے چلیں۔

خان ہاں۔ تم سب جا سکتے ہو۔ شاہ گل۔

شاہ گل مگر تم خان ۔۔۔۔۔؟

خان میں۔ میں ابھی کچھ دیر یہاں ٹھہروں گا۔ رباب لاؤ آندھی؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی کی محبت کا طوفان نہیں۔ جو دل کے قید خانے سے آزاد ہو گیا ہے ـــــ رباب لے آئے شاہ گل۔

شاہ گل ہاں خان۔

(خان نغمہ چھیڑتا ہے)

ہوا تیز ہو گئی ہے خان۔ ریت کا طوفان پتھروں کو گود میں لئے منہ زور گھوڑے کی طرح بڑھتا چلا آ رہا ہے

(نغمہ بلند ہوتا ہے)

شاہ گل سب ۔۔۔ سب لوگ روانہ ہو گئے خان آپ بھی چلے چلیں۔

(نغمہ بلند تر ہوتا ہے)

شاہ گل (گھبرا کر) خان۔ خان۔ اُٹھئے۔ چلئے۔ ریت کے بگولے اُٹھ رہے ہیں۔ پتھر اور کنکر وحشی عفریتوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ اب ۔۔۔ اب کچھ سجھائی بھی نہیں دیتا خان۔ آہ یہ آندھی نہیں موت کا طوفان ہے۔

خان (جوش میں) نہیں۔ یہ صحرا کا نغمہ ہے۔ یہ کوہستان کا گیت ہے۔ جس کی تانیں نیلوفر کی روح کو لوریاں دیتی ہیں۔ جس کی لہروں پر وہ تبسم کی کشتی کھیتی ہوئی خوشی کی وادیوں میں پہنچ جاتی ہے۔ مگر ہاں شاہ گل۔ میرے دوست تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تمہیں یہ گیت پسند نہیں آئے گا تمہیں یہ نغمہ بھلا معلوم نہیں ہوگا۔ اسے سُنکر تمہاری روح نہیں ناچے گی۔ جاؤ۔ جاؤ۔ شاہ گل۔ پیشتر اس کے کہ اس کی گرمی تمہارے جسم کو جھلسا دے۔ تمہارے دل کو گداز کر دے

شاہ گل مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ خان میں تمہیں تنہا چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔

خان یہ میرا حکم ہے شاہ گل۔ جاؤ۔

شاہ گل خان ۔۔۔۔ خان ۔۔۔۔

خان ایک لفظ نہیں۔

(جانے کی آواز آندھی تیز ہوتی ہے۔ ساتھ ساتھ رباب کا نغمہ بھی بلند ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائی بلندی پر پہنچکر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اسکے بعد بتدریج آندھی کا زور بھی ختم ہوتا ہے اور نغمہ کی آواز بھی۔ رُکنے کے بعد ایک لمحہ کی خاموشی)

پہلا شخص شاہ گل بیچارہ انسان تھا۔ اپنی جان بچانے کی فکر میں گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں پہنچ گیا۔ دور تک خان کا نغمہ اس کے کانوں میں گونجتا رہا اور اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا۔ وہ اپنے مالک کو بہت چاہتا تھا مگر ہر انسان خود غرض ہوتا ہے۔ اسے اپنی جان بھی پیاری تھی۔ اور پھر خان کا حکم بھی یہی تھا۔

دوسرے دن۔ جب طوفان تھما۔ آندھی کم ہوئی۔ تو وہ قبیلہ کے لوگوں کو ساتھ لیکر وہاں پہنچا جہاں خان نے

رباب پر اپنی محبت کا آخری نغمہ بجایا تھا ۔مگر اس کا کچھ پتہ نہ ملا۔ نہ جانے کہیں ریت کے ٹیلے یا پتھروں کے ڈھیر کے نیچے اس کی قبر ہے۔ اس کا رباب بھی کہیں نظر نہ آیا شاید ٹوٹ گیا یا ندی میں گر پڑا۔ البتہ۔ ان کے کانوں نے ایک لطیف گیت سُنا جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے تیرتا ہوا نیچے اُترتا معلوم ہوتا تھا......

دوسرا یہ..... یہ وہی نغمہ تھا جو ابھی ہم سن رہے تھے۔

پہلا ہاں۔ جب اس وادی میں ہوا تیز ہو جاتی ہے۔ آندھی کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو یہ نغمہ سُنائی دیتا ہے۔

(تھوڑی دور پر ایک بلند وحشیانہ قہقہہ)

دوسرا (ڈر کر) اوہ - یہ کیا ؟

پہلا کچھ نہیں۔ ہمارا تیسرا ہمراہی خود بخود ہنس رہا ہے۔

دوسرا دیوانہ۔ ...... دیوانہ شاعر

حضرت اکبر الہ آبادی کے مزار پر

―― از جناب فضا الہ آبادی

دیکھ اے زائر جو آتی ہے نظر یہ خام قبر　　تو سمجھتا ہی ابھی تک جسکو اک گمنام قبر
جانتا بھی ہے یہ ہے کس پاک ہستی کا مزار　　جس پہ نازل ہو رہی ہے رحمتِ پروردگار
چھوڑ کر دنیا کو جو زیرِ زمیں آباد ہے　　نازشِ ہندوستاں فخرِ الہ آباد ہے
قوم پر جسوقت تھی مردہ دلی چھائی ہوئی　　مغربی ماحول سے خلقت تھی گھبرائی ہوئی
اس نے مُردہ قوم میں پھونکی نئی اک زندگی　　خاک کے ذرّوں میں پیدا اسنے کی تابندگی
مغربی الحاد سے اس نے بچایا قوم کو　　منزلِ مقصود کا رستہ بتایا قوم کو
قوم ابھی منزل سے بیگانہ تھی رستہ دور تھا　　اٹھنے ہیں یہ حق نوا حق گو حقیقت آشنا
راہِ منزل کی دکھا کر چل دیا سوئے جناں　　قوم پر پھر ہو گیا طاری وہی خوابِ گراں

پھر ضرورت اس غلام آباد میں اکبر کی ہے
ملحدوں کو پھر ضرورت ایک پیغمبر کی ہے

ضروری اطلاع

اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا

صاحبان! میں نہ اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں۔ بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنے والی عادت پڑ گئی تھی۔ جسکے نتیجہ بد سے میں بالکل بے خبر تھا۔ اچانک عرصہ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے نامردی کا نامبارک مرض لاحق ہو گیا۔ سرعت، جریان، احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر اور زرد ہوتا جاتا تھا۔ دل گردہ ہر وقت دھڑکتا، سر چکراتا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا۔ گھبراہٹ سستی اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ مگر در پردہ مشہور شہر و ںکے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جنکے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی۔ ادویات منگا کر استعمال کرتا رہا۔ لیکن مجھے بالکل خاک بھی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ علاوہ خرچ کے کئی اور تکلیفوں کا سامنا کر کے بھی مایوس رہنا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں زندہ در گور ہونیکو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ملازمت کے سلسلہ میں پشاور جانا پڑا۔ پشاور جس جگہ جا کر ٹھہرا وہاں کے فقیر خضر صورت جو کہ وہاں پہلے سے مقیم تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس کیوں رہتے ہو اور تمہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے؟ میرے پُر درد دل نے اس خضر صورت اور کامل سنیاسی کو اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہدایت کی چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب میں زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر لینے پر آمادہ ہوں اس فقیر صاحب کمال نے ازراہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کیلئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کیلئے مالش کا بتایا چنانچہ میں نے حسب ارشاد اس صاحب کمال کے لاتعداد جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جوہر کیمیا کو خود اس صاحب کمال کے تیار کر کے استعمال کرنا شروع کیا۔ **ناظرین! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں** کہ ساتویں روز ہی میری تمام شکایتیں رفع ہونی شروع ہو گئیں۔ اور میں اپنے آپ کو ایک قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا۔ اگرچہ مجھے چند ہی روز کے استعمال سے ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے **اکیس روز** تک پرہیز اور علاج جاری رکھنا پڑا۔ میں ہر روز تین ساڑھے تین سیر دودھ بآسانی ہضم کر لیتا۔ میرا چہرہ بارونق۔ بدن مضبوط۔ بینائی طاقتور ہو گئی۔ اب میں ایسا قابل فخر مرد بن گیا ہوں کہ جسکے بیان کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ دلیں گر بانی فائدہ دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا تو ہر قسم کی نامردی سستی جریان احتلام سرعت وغیرہ کیلئے اکسیر سے بڑھکر پایا۔ پھر کئی ایک دور اندیش احباب کے اصرار اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو صاحب اس خطرناک و قبیحہ عادت کے شکار بنکر حظوظ انسانیت سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کر کے مایوس ہو چکے ہوں وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کر کے صحتیاب ہو جائیں اور خدا کے فضل کے گیت گائیں۔ قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہار پر بمشکل اکتفا کرتی ہے۔ فائدہ بہت کم ملحوظ ہے۔ **قیمت مقوی گولیاں فی شیشی جس میں ۲۱ روز کی ۴۲ خوراک موجود ہے صرف دو روپیہ عہ قیمت روغن مالش طلاء جو ۲۱ روز تک رگوں اور پٹھوں کیلئے کافی ہے۔ فی شیشی دو روپے آٹھ آنے عہ** جریان کیلئے یہ گولیاں از حد مفید ہیں۔ مادرزاد نامردی کے سوائے خواہ کسی قسم کی نامردی کا مرض کیوں نہ ہو اکسیر ہے۔ روغن مالش طلاء سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہو گا۔

اس دوائی میں کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ۔ جوان اور بوڑھا بآسانی بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے۔

اور لطف یہ ہے کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ ہوگی۔ آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرا مدعا جعلی اشتہار شائع کرکے پبلک سے روپیہ کمانیکا ہے۔ بلکہ ہر خاص و عام کا فائدہ مدنظر رکھکر احباب کے اصرار پر اشتہار شائع کیا جا رہا ہے۔ تندرست اور شوقین اصحاب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اسکے استعمال سے سُست سے چست اور چست سے طاقتور بنجاتا ہے۔ اگر ضعیفی میں بھی لطف جوانی اٹھانا چاہتے ہوں تو ان گولیوں اور روغن مالش طلا کا استعمال کریں۔ کیونکہ اسکے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہو جاتا ہے۔

الغرض جب تمام جسم ڈھیلا ہو گیا ہو تو انکا استعمال کریں۔ اور فائدہ اٹھائیں۔ مخفی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے ؛

نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے۔ جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیوکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں۔ ان کیلئے مقوی گولیاں از حد مفید ہیں۔ ضرورت مند اصحاب تجربہ کریں۔ مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ دوا ہوگا۔ محصولڈاک کے علاوہ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

خاص نوٹ } وہ اصحاب جو ہم سے دوائی منگا کر استعمال کریں۔ اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ کیونکہ کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ لہذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اسکی کمائی کھانا گناہ ہے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹرڈ ہیں۔ آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔ ؛

غیر ممالک سے قیمت پیشگی

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ

ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب منشاء فائدہ نہو تو حلفی تحریر بھیجکر قیمت واپس منگالیں عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی صاحب اس دوائی سے اب بھی فائدہ نہ اٹھائیں تو انکی قسمت۔ ہزار ہا دن تعریفی خطوط سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔ جنکے لکھنے والے عام صاحبان کے علاوہ کئی ڈاکٹر حکیم وید ہیں۔ ڈاکٹر حکیموں اور ویدوں کی رائے ہے کہ دارالشفاء مقوی گولیاں روغن مالش طلا بیحد مفید ہیں۔

ضروری اطلاع

یہ یاد [illegible] دوائی [illegible] جریان احتلام۔ سرعت کمزوری کا دور [illegible] جریان الرحم ولیکوریا کیلئے مخصوص ہے۔ یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں۔ جلق یا کثرت مباشرت یا عادت بد سے۔ سب کیلئے یکساں مفید ہے۔ سوزاک یا آتشک سے پیدا کی ہوئی کمزوری کیلئے اسکا استعمال کرنا طاقت کا بیمہ کرانا ہے۔ مادر زاد نامردی کے سوائے میری دوائی اکسیر ہے۔

حکیم جہانگیر بیگ از چوبیس پرگنہ یہ دوائی قابل تعریف ہے	والدہ یوسف کمال از کلکتہ یہ دوائی جریان الرحم و لیوکوریا کیلئے مفید ہے	ڈاکٹر شفاء اللہ ایم ڈی ایچ از حسین آباد مونگیر یہ دوائی گمشدہ قوت مردمی کو از سر نو بحال کر دیتی ہے	حکیم رامچندر۔ از رنگون یہ دوائی رگوں اور پٹھوں کیلئے بیحد مفید ہے	حکیم چونی لال از لاہور یہ دوائی اولاد پیدا کرنیکے قابل بنا دیتی ہے	ڈاکٹر ایچ ایچ فاکس از امریکہ یہ دوائی نامرد کو مرد بنا دیتی ہے	مسٹر آر۔ چندرا از امریکہ اس دوائی کے استعمال سے میرا وزن بڑھ گیا

ملنے کا پتہ منیجر دارالشفاء گولیاں رجسٹرڈ بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب)

از حضرت بسملؔ — عمادی تیغی پھلواروی

تقریب ہے تصادم موج و حباب کی

ہستی کی ہے نمود نمائش سراب کی
دُنیا ہے اِک بہارِ گلستان خواب کی

اللہ رے سرخوشی کسی مست شباب کی
آنکھوں میں لہر اُٹھتی ہے کیف شراب کی

گرمی یہ سوزِ عشق میں تھی اضطراب کی
بسمل سے تیرے آنے لگی بو کباب کی

تازہ سا ہو گیا ہے غمِ دل شکستگی
دیکھی ہے کیفیت جو شکستِ حباب کی

بسملؔ بس اب سکون کی منزل پہنچ گئی
مدّت قریب ختم ہے اب اضطراب کی

جوشِ طرب میں ہوتی ہیں رندوں سے ہمکنار
ساغر سے کود کود کے موجیں شراب کی

غفلت کا راز ہوش میں آؤ تو کچھ کھلے
بیدار ہو کے سوچیے تعبیر خواب کی

بربادیاں بھی بعض کو ہوتی ہیں سازوار
قائم ہوا یہ دیکھو عمارت حباب کی

صف سے نکل کے بنگئے بڑھ کر امام شیخ
پھیلے اِدھر اُدھر نہ کہیں بو شراب کی

ظالم کی ہر ادا تھی حقیقت میں منتخب
بیکار سعی تھی نگہِ انتخاب کی

موجوں کا نرغہ اور یہ دریائے بے کنار!
ہمّت ہی ہم تو دیکھ رہے ہیں حباب کی

کھُل جائے دل کا در تو نکل جائیں حسرتیں
ناوک ترا کلید بنے فتحِ باب کی

کیا کہیے حسرتِ دلِ حیراں کا ماحصل
تعبیر کیا بتائیے گونگے کے خواب کی

بھولے ہوئے غریق کی باقی ہے اس سے یاد
دامن میں موج کے جو گرہ ہے حباب کی

آئے ہیں احتضار میں سب دیکھنے مجھے
تقریب ہے تصادمِ موج و حباب کی

قاتل کا رعبِ حسن تمنا ہے اس قدر
خاموش ہوں، مجال نہیں اضطراب کی

راجہ رام نرائن موزوں

نائب ناظم صوبہ بہار سنہ ۱۱۶۶ھ ۱۷۵۲ء لغایتہ سنہ ۱۱۷۴ھ ۱۷۶۰ء

از جناب سید رضا قاسم مختار

تشکر و امتنان کے ساتھ عرض کر دینا ضروری ہے کہ محترمی سید حسن عسکری صاحب ایم اے بی ال پروفیسر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج کے ستر صفحات کے ایک طویل انگریزی مضمون "RAJA RAMNARAIN" مطبوعہ انگریزی سہ ماہی رسالہ "دی انڈین ہسٹوریکل کوارٹرلی کلکتہ" کے مطالعہ نے ناچیز کو اس مضمون کو لکھنے کی رغبت دلائی۔ تاکہ اُردو داں حضرات بھی ہمارے صوبہ بہار کے اس نامور فرزند کے حالات سے واقفیت حاصل کر سکیں (راقم آثم رضا قاسم)

از پئے کارِ جہاں کار گزارے باشد
مرد کار آنکہ ہمہ وقت بہ کارے باشد

عروج وکمال کے ساتھ ہبوط و زوال بھی دُنیا کی ہر شئے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی قوم، کوئی فرد، کوئی ملک اور کوئی عہد اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن ہندوستان کی تاریخ میں جتنی روشن مثالیں اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملتی ہیں اُس کا جواب کسی دوسرے زمانے میں مشکل سے مل سکتا ہے۔

زمانہ زیر نظر میں شاہزادوں کی خانہ جنگیوں، اُمراء کی نااتفاقیوں، راعی و رعایا کی کشیدگیاں، بادشاہ و وزراء کی تن آسانی و نااہلی، مرکزی حکومت کی مالی اور فوجی کمزوری، صوبہ داروں کی خودسری و خودمختاری، بیرونی حملہ آوروں کی پیہم تاخت اور سات سمندر پار سے آنے والے کلاہ پوشوں کی ہندوستانیوں کے اُمور میں دخل درمعقولات کی بدولت سلطنت مغلیہ جو بظاہر عروج وکمال پر پہنچ چکی تھی نہ صرف پارہ پارہ ہونے لگی بلکہ انقلابات کے ایسے طوفان اُٹھے جن میں بہتیری قومیں بگولوں کی صورت رُونما ہوئیں، بنیں اور بگڑیں۔ مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں، روہیلوں اور ایرانیوں کی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں بیشتر تھوڑے ہی عرصہ میں ناپید نہیں تو بے بس اور حقیر ضرور ہوگئیں۔ کوکن کے ایک مغرور و معتوب برہمن نے پیشواؤں کی ایک زبردست حکومت کی داغ بیل ڈالی جو اس کے بیٹے اور پوتے کی سرگرمیوں کی بدولت تقریباً سارے ہندوستان پر محیط ہونے کے بعد تیسری جنگ پانی پت و نیز خانہ جنگیوں کے باعث ایسی مائل بہ زوال ہوئی کہ پھر نہ پنپی یہاں تک کہ شاطرانِ مغرب نے اُسے بالکل ہی نیست و نابود کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ اٹھارہویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ کا ایک تاریک عہد تھی، سلطنت مغلیہ کے شیرازہ کا بکھرنا تھا کہ سارے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔

ایسا زمانہ ہمیشہ من چلے جانباز اور فطرتی سازشی اشخاص کے موافق ہوا ہی کرتا ہے، چنانچہ سیکڑوں حضرات قعر گمنامی سے نکل کر قسمت آزمائی کے لئے نمودار ہوگئے۔ ہندوستان کے سپوت و کپوت فرزندوں ہی تک بس نہ تھا بلکہ مشرق و مغرب کی بھی تخصیص جاتی رہی۔

یورپ اور ایشیا کے حوصلہ منداس غلام مُلک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں کو د پڑے مگر بالآخر جیت اُسی قوم کے افراد کی ہوئی جو شمار میں تو نا قابلِ اعتنا تھی لیکن جن کی شان دار یکجہتی، قوم پرستی، جذبۂ ایثار و علمی فراست مسلم ہے اور جن کی ناقابل الفہم حکمت عملیوں اور سیاسی تدبر کی آج بھی دُنیا قائل ہے اور ان کے مقابلے میں محسن کشی، غاصبانہ اقتدار، سازش اور ملکی و قومی غدّاری کا بازار ہندوستانیوں میں گرم تھا۔ چنانچہ سیاسی جوڑ توڑ تلوار اور گولوں سے زیادہ موثر ثابت ہوا اور ایک طرف اگر ملکی و قومی مفاد کو ذاتی اغراض اور شخصی منفعت کے قربان کرنے کے لئے ہر ہندوستانی تیار تھا اور وسیع النظری کا فقدان، اپنوں سے بیزار اغیار پر بھروسہ اور ایک حد تک جذبۂ انتقام اور خواہش انقلاب ملک کی غالب جماعت کی ذہنیت پر مستولی تھی تو دوسری جانب فرائض حکمرانی سے غفلت، فضا کے تغیر و تبدل سے چشم پوشی، ہوشمندی کی کمی، ریشہ دوانیوں کے سمجھنے اور اس کے سدّباب کی عدم قابلیت نمایاں تھی۔ لیکن باوجود ان حالات کے اُسی زمانے میں بعض ایسی نامور ہستیاں بھی ہمارے صوبہ بہار میں تھیں جو علم و فضل، ادب و سیاست اور شاعری و حکمرانی جیسے متضاد صفات سے متصف تھیں اور جن کے افعال و اعمال سے اغیار نے کتنا ہی کچھ فائدہ نہ اُٹھایا مگر ان کا بھی انجام حسرت ناک ہوا۔

چنانچہ راجہ رام نرائن جیسا باکمال بھی اسی مسموم فضا سے متاثر نظر آتا ہے، وہ واسطہ اٹھارہویں صدی عیسوی کا ایک نامور فرد تھا جو بیک وقت یکہ تازِ میدانِ علم و ادب بھی تھا اور بساطِ سیاست کا شاطر بھی، وہ نہ صرف صاحب قلم بلکہ بڑی حد تک صاحبِ سیف بھی تھا مگر اس عہد کے اکثر نامور افراد کی طرح اس کی ابتدائی زندگی پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے اور معصر مورخین صرف اس کی ولدیت بتا کر خاموش نظر آتے ہیں لیکن دیوان موزوں[۵۱] مرتبہ دُرگا پرشاد اور بندرابن داس خوشگو (ساکن متھرا) کے سفینہ[۵۲] کے مطالعہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ رام نرائن قوم کا سریباستو کایستھ، شخصے رنگ لال کا بیٹا، موضع کشن پور پرگنہ سہسرام (ضلع شاہ آباد) کا رہنے والا تھا اور وہ بعالم جوانی صوبہ دار عظیم آباد کا دیوان مقرر ہوا تھا۔[۵۳] نیز لالہ خوشگو یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ رام نرائن مشہور ایرانی شاعر شیخ علی حزیں کا شاگرد تھا اور شیخ موصوف ہی کے کہنے سے اُس نے اپنا تخلص موزوں رکھا تھا۔ دُرگا پرشاد (مرتب دیوان موزوں) کا بیان ہے کہ سن تمیز حاصل کر لینے کے بعد ہی سے راجہ رام نرائن نے عربی و فارسی اور علم الحساب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کردی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نظم و نثر میں مہارت حاصل کرنے لگا تھا جہاں تک فارسی نظم کا تعلق ہے شیخ علی حزیں کی شاگردی کی بدولت اسے پختگی اور کمال حاصل ہوا تھا۔ لیکن یہاں پر مشہور تذکرہ نگار میر حسن کا بیان بھی حوالۂ قلم کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میر حسن اپنے تذکرہ[۵۴] میں لکھتے ہیں کہ راجہ رام نرائن

---

۵۱ دیوان موزوں مطبوعہ نولکشور پریس ۵۲ سفینۂ خوشگو قلمی نسخہ ۵۳ لالہ خوشگو نے اپنا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" ۱۷۳۸ء یا ۱۱۵۱ھ میں لکھ کر تمام کیا تھا اس لئے ایک حد تک راجہ رام نرائن کا سال پیدائش ۱۷۱۸ء سے ۱۷۱۹ء یا اسی کے لگ بھگ قرار پاتا ہے اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ خوشگو نے اپنے سفینہ میں راجہ رام نرائن کا ذکر صوبہ دار عظیم آباد کے دیوان کی حیثیت سے کرتے ہوئے نواب ہیبت جنگ کو "نواب شہید" کے لفظ سے یاد کیا ہے اس لئے صرف قیاس ہی نہیں بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوبہ دار جس کا دیوان رام نرائن تھا سوائے راجہ جانکی رام کے کوئی دوسرا نہ تھا، نیز تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۷۴۸ء میں نواب ہیبت جنگ کی واردات قتل کے بعد راجہ جانکی رام اور راجہ رام نرائن بالترتیب صوبہ دار اور دیوان مقرر ہوئے تھے۔ ماسوا اسکے ۱۷۶۳ء میں میر قاسم عالی جاہ نے جب راجہ رام نرائن کو دریائے گنگا میں ڈبو کر مار ڈالا تھا تو بقول نواب غلام حسین خاں اس وقت راجہ رام نرائن کی عمر پچاس سے کم تھی (ملاحظہ ہو سیر المتاخرین صفحہ ۷۳۴) ۵۴ تذکرہ میر حسن مطبوعہ اورنگ آباد (دکن)

نہ صرف فارسی گو بلکہ اُردو اور ہندی کا بھی شاعر تھا۔ لیکن ناچیز راقم السطور اُس کی علمی و ادبی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈال کر اس مضمون کو مزید طول دینا نہیں چاہتا اور چونکہ راجہ رام نرائن ادبی دنیا میں اہمیت رکھنے کے ساتھ تاریخی حیثیت سے بھی ہمارے صوبہ بہار میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک تھا اس لئے ذیل کی سطروں میں بطور نمونہ اس کے محض چند اشعار پیش کرنے کے بعد اس کی سیاسی زندگی کا ذکر کیا جائیگا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی ۔۔۔ کب مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

بھولی نہیں ہے مجکو بتوں کی ادا ہنوز ۔۔۔ دل کے نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز

چادر تقدیر کی ہرگز نہیں ہوتی رفو ۔۔۔ تا قیامت سوزن تدبیر گر سیتی رہے
بلبل بیدرد کو نسبت ہے کیا پروانے سے ۔۔۔ وصل میں مر جائے وہ یہ ہجر میں جیتی رہے
قول موزوں پر نہ ہرگز کیجئے گا اعتبار ۔۔۔ جونک کو مٹی ملے تو بھی لہو پیتی رہے

(ہندی دوہے کا نمونہ)

(۱) انبہ امرت دیت ہیں سدا رہت ہیں مون ۔۔۔ نا ہرتے نا آہار ملے باگ بیر تے کون

---

(۲) سیتا کے اودیش تے ہومت بیڑا لینہہ ۔۔۔ پہلے باگ ادھونس کے ایشور بدھو تب کینہہ

(۱) آم سے امرت حاصل ہوتی ہے جو ہمیشہ خاموش رہتا ہے لیکن باغ میں کون ایسا ہارا ہے جو بغیر محنت کے اُسے حاصل کر سکتا ہے۔
(۲) سیتا کو چھوڑنے کے لئے ہنومان جی نے بیڑا اٹھایا مگر پہلے خود محنت کر کے باغ کو ویران کر چکے تب خدا نے ان کی مدد کی
خلاصہ ان دوہوں کا یہ ہے کہ بغیر محنت کے کوئی کام انجام نہیں پا سکتا ہے۔ (رضا قاسم)

(۲)

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۷۴۸ء میں نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ کے مارے جانے کے بعد شخصے جانکی رام نائب ناظم بہار ہوا اور اُسی کی سفارش سے اس کے مرنے کے بعد ۱۷۵۳ء میں راجہ رام نرائن صوبۂ بہار کا نائب ناظم مقرر ہوا لیکن نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ کی نظامت بہار کے زمانے (۱۷۴۰ء لغایتہ ۱۷۴۸ء) میں رام نرائن کا نام بار بار تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے اور وہ اس طرح کہ اوائل ۱۱۵۸ھ میں جب مصطفےٰ خاں افغان اپنے آقا نواب علی وردی خاں مہابت جنگ سے رنجیدہ ہو کر اس کے داماد نواب ہیبت جنگ سے بہار چھین لینے کے قصد سے راج محل اور مونگیر ہوتا ہوا عازم پٹنہ ہوا تو اس وقت نواب ہیبت جنگ نے بقول نواب غلام حسین خاں ۔

"راجہ رام نرائن و دیگر رفقا و مخلصان را مامور نمود کہ روز و شب ہم رسانیدن دم خویش اسپہ و خویش پراق مشغول بودہ بعد ازاں ہر صورت کہ بدست آید نگہدارند" (سیر المتاخرین صفحہ ۵۶۱)

چنانچہ جب مصطفےٰ خاں افغان پہلی جنگ میں شکست کھا کر دوسرے ہفتہ میں پچیسویں صفر ۱۱۵۸ھ (مطابق ۱۸ مارچ ۱۷۴۵ء) کو نواب ہیبت جنگ کے مورچال پر حملہ آور ہوکر مخالف فوج کو زیر و زبر کرتا ہوا خود نواب کی طرف رجوع ہوا تو اس وقت بقول کرم علی۔

"دیوان کیرت چند و راجہ رام نرائن با توپخانہ جہانسوز خود را رسانیدہ مانع تردد ش گردیدند"۔ مظفر نامہ قلمی نسخہ کتب خانہ شرقی پٹنہ ص۵۱

اس کے بعد ۲۳ ویں محرم مطابق ۱۵ ویں جنوری ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء کو نواب ہیبت جنگ نے جب عظیم آباد پٹنہ کے محل چہل ستون میں غدار افغان سرداروں کو باریابی کا موقع دیا تھا تو اس وقت بھی راجہ رام نرائن تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر منشی خانے میں بیٹھا ہوا تھا اور شمشیر خاں کے بھانجے مراد شیر خاں کے ہاتھوں نواب موصوف کے مارے جانے کے بعد ہی بقول نواب غلام حسین خاں۔

"راجہ رام نرائن و دیگر متصدیان بعضے مجروح و بعضے غیر مجروح تاراج شدہ برآمدند"۔ (سیر المتاخرین)

بہر حال نواب ہیبت جنگ کے مارے جانے کے بعد بحکم نواب علی وردی خاں مہابت جنگ، راجہ جانکی رام صوبہ بہار کا نائب ناظم مقرر ہوا اور راجہ رام نرائن کی پیشکاری (مادیوانی) اپنی جگہ پر قائم رہی چنانچہ راجہ رام نرائن کی اہمیت اور کارگذاری کی شہادت کرم علی کے مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتی ہے۔

"راجہ جانکی رام در حین حیات خود ضبط مملکت باختیار راجہ رام نرائن پیشکار خود دادہ عرائض بحضور ارسال نمودہ باین مضمون کہ چوں پسران ناقابل من لیاقت ایں منصب نداشتند عہدہ ایں کار سپرد راجہ رام نرائن نمودم وجناب عالی نیز او را پسندیدہ مقرر داشتند"۔ ——— (مظفر نامہ ص۹۵)

نیز یہاں پر نواب غلام حسین کا مندرجہ ذیل بیان بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

"نظر بحقوق دیرینہ خدمتہا و شعورے کہ در سیاق و معاملات داشت بہ نیابت صوبہ داری عظیم آباد و عطائے خلعت و سرپیچ مرصع و شمشیر و فیل سرفرازی یافت"۔ ——— (سیر المتاخرین ص۵۹۳)

چنانچہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، راجہ جانکی رام کی سفارش سے اس کے مرنے کے بعد ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں راجہ رام نرائن نائب ناظم بہار مقرر ہوا اور ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء تک وہ اس عہدہ جلیلہ پر فائض رہا حقیقت یہ ہے کہ افغان سرداروں کی سرکشی، غداری اور بغاوت نے نواب علی وردی خاں کو اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے بہت کچھ بدظن ہو گیا تھا اور اپنے نزدیکی قرابتمندوں کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ دینا نہیں چاہتا تھا، اور اگرچہ فوج میں مسلمان عنصر کی مجبوری تھی لیکن اُن پر بھی ہمیشہ احتیاط کی نظر رکھتا تھا اور ہمیشہ ادائگی تنخواہ اور تقسیم انعامات کے ذریعہ اُنہیں خوش رکھنے کی کوشش بلیغ کرتا تھا اور جس شعبہ میں کوئی مجبوری نہ تھی وہاں ہندوؤں کو ترجیح دیتا تھا اور ان کی خوشحالی کو اپنی ترقی اور استحکام حکومت سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بہار ایسے صوبے کو جس کی سرحد کا ڈانڈا صوبہ اودھ سے ملا ہوا تھا اپنے داماد نواب زین الدین احمد خاں ہیبت جنگ کے مارے جانے کے بعد بجائے اپنے سپہ سالار (میر جعفر) کے پہلے تو راجہ جانکی رام اور اُس کے مرنے کے بعد راجہ رام نرائن کے سپرد کر دیا تھا۔[۵۱]

اس میں شک نہیں کہ ہندو اہلکاروں نے بھی وفاداری اور خلوص برتا، چنانچہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ بنگال اور بہار کے ہندوؤں نے دامے درمے قدمے ہر طرح نواب علی وردی خاں کی مدد کی اور باوجود دھرم اور مذہب کی چیخ و پکار اور اختلاف کے اپنے ہم مذہب مرہٹوں کے

سلہ ۵۱ مراۃ السلاطین (اُردو ترجمہ سیر المتاخرین) مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ۔

خلاف اُسی کے ساتھ ویاخصوصاً راجہ رام نرائن نے نواب علی وردی خاں کے حکم سے کبھی سرتابی نہ کی اور صدق دل سے نظم ونسق صوبہ تحصیل وترسیل زرمالگذاری دنیز زمینداران وجاگیرداران کی تالیف قلوب کے ساتھ ساتھ اپنے ولی نعمت نواب علی وردی خاں مہابت جنگ کی دلجوئی اور اس کے معمولی سے معمولی حکم کی فوری تعمیل کرتا رہا یہاں تک کہ عشرہ محرم الحرام میں خود اپنی نگرانی میں عزاداری کا انتظام و اہتمام کیا[۵۱] و نیز اسی قسم کی بہتیری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جس سے نواب علی وردی خاں مہابت جنگ اور راجہ رام نرائن کے خوشگوار تعلقات پر خاصی روشنی پڑتی ہے جس کا بیان مضمون کو طویل تر بنا دے گا، خلاصہ یہ کہ راجہ رام نرائن نے نواب علی وردی کی اطاعت و فرمانبرداری سے کبھی سرمو انحراف نہیں کیا اور یہی وجہ تھی کہ نواب علی وردی خاں نے مرنے سے قبل اپنے نواسے سراج الدولہ کو منجملہ اور وصیتوں کے یہ بھی تاکید کی تھی کہ ہندوؤں کو اپنا دوست اور باعث دولت و اقبال سمجھنا اور راجہ رام نرائن کو صوبہ بہار میں بدستور مسند نیابت پر متمکن رہنے دینا۔

روبرٹ اورمس اپنی تاریخ ہندوستان میں لکھتا ہے کہ اُن کل ہندوؤں میں جن کا عروج و اقبال نواب علی وردی کا مرہون منت تھا صرف راجہ رام نرائن کا جذبۂ تشکر و امتنان سراج الدولہ کی بدعنوانیوں اور تلون مزاجیوں سے متاثر نہ ہوسکا اور یہی وجہ ہے سراج الدولہ کے خلاف جن لوگوں نے سازش کی تھی خصوصاً رائے درلاب نے باوجود وحدت ملت و یگانگی معاملات راجہ رام نرائن کو شریک سازش کرنا تو کجا بلکہ اس کو کانوں کان اس کی خبر بھی نہ ہونے دی۔ بلاشک واقعات پر نظر کرتے ہوئے مسٹر اورمس کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ راجہ رام نرائن نے جس طرح نواب علی وردی خاں کی اطاعت و فرمانبرداری سے کبھی باہر قدم نہیں رکھا تھا بالکل اُسی طرح سراج الدولہ کے حلقۂ ارادت و اطاعت سے کبھی باہر نہیں ہوا، چنانچہ جیسے ہی سراج الدولہ کا پروانہ شوکت جنگ (حاکم پورنیا) کے استیصال کے لئے رام نرائن کے پاس پہنچا بلاپس و پیش ایک بڑی فوج کے ساتھ (جو شوکت جنگ کے فوج سے دوگنی تھی تو زیادہ از مساوات ضرور تھی)[۵۲] وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور بھاگلپور اور راج محل ہوتا ہوا ایسے وقت سراج الدولہ کے فوج سے جا ملا جبکہ میر جعفر و نیز دوسرے سرداران فوج غداری کا ارادہ کر رہے تھے راجہ رام نرائن کے وہاں پہنچتے ہی واقعات کی رفتار بدل گئی، شوکت جنگ شکست کھا کر مارا گیا، چنانچہ کرم علی اپنی تصنیف مظفر نامہ (قلمی) کے صفحہ ۱۱۸ پر لکھتے ہیں کہ

> "بعد فتح مہاراجہ رام نرائن را الطاف و عنایات نواختہ رخصت انصراف بعظیم آباد ارزانی داشت و عمر خاں و مرزا علی بیگ را
> بدوستی میر محمد جعفر خاں بجرم سرکار دانستہ از نوکری برطرف کردہ رخصت فرمود و پنہاں بمہاراجہ حکم کرد کہ ایں ہارا در قید شدید نگاہ دارد"

راجہ رام نرائن نواب سراج الدولہ سے رخصت ہو کر اولاً ایک عقیدتمند ہندو کی طرح پہلے بیجناتھ جی کی تیرتھ سے مشرف ہوا اُس کے بعد پٹنہ پہنچکر فوراً ہی سراج الدولہ کے حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا اور

> "بموجب ارشاد مرزا غلام علی بیگ و مرزا حکیم بیگ و احمد علی خاں و عمر خاں با دو پسرش امالت خاں و دلیل خاں ہفت صد
> سوار در باغ جعفر خاں محاصرہ کردہ ہمہ ایں اُمرا بعد قتل سراج الدولہ ازآں بلا نجات یافتند۔" (مظفر نامہ قلمی صفحہ ۱۲۱)

اس سے بڑھکر راجہ رام نرائن کی وفاداری و اطاعت کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ لیکن اب رہا بست سالہ نواب سراج الدولہ کی شکست اور قتل کا معاملہ تو اس کے متعلق بہتیرے شواہد ملتے ہیں جس سے اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ سازش بنگالہ میں راجہ رام نرائن کو ہرگز کوئی دخل نہ تھا، چنانچہ بخوف طوالت دوسری شہادتوں کو نظر انداز کر کے صرف میر حسن کا بیان پیش کیا جاتا ہے۔ اُردو زبان کے مشہور

---

[۵۱] مراۃ السلاطین (اُردو ترجمہ سیر المتاخرین) مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ [۵۲] سیر المتاخرین فارسی نسخہ۔

تذکرہ نویس میر حسن اپنے مشہور تذکرہ میں راجہ رام نرائن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شہر عظیم آباد میں جب سراج الدولہ کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو اس وقت راجہ رام نرائن نے فی البدیہہ مندرجہ ذیل شعر موزوں کر کے نہ صرف ایک بار پڑھا بلکہ بار بار وہ اپنے اس شعر کو پڑھتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔[۵]

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

(۳)

کرنل کلائیو نے انگریزوں کے دشمن نواب سراج الدولہ کا قلع قمع کر کے اس کی مسند پر اس کے دغاباز سپہ سالار میر جعفر کو بٹھا دیا اور جب نواب علی وردی خاں کا خاندان جس کی بدولت راجہ رام نرائن کا عروج ہوا تھا باقی نہ رہا تھا تو اس وقت راجہ رام نرائن نے اپنے ولی نعمت اور اس کے خاندان کی نمک خواری کا اظہار کرتے ہوئے نئے نواب میر جعفر کی اطاعت قبول کرنے کا اقرار کیا اور قرآن و برہمن کی مدد سے قسمیں کھائیں، لیکن اس موقع پر مسٹر اورمس کا مندرجہ ذیل خیال بھی قابل غور ہے۔

"دونوں فریق ظاہرداری سے کام لے رہے تھے۔ رام نرائن جانتا تھا کہ مرشد آباد کے احکام اس کے خلاف کارروائی میں مانع تھے اور محمد امین وغیرہ نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ راجہ رام نرائن شجاع الدولہ کی مدد سے مایوس ہو کر محض دفع الوقتی سے کام لے رہا تھا اور وہ اسی وقت تک مطیع رہے گا جب تک اس کو آزادی کا موقع نصیب نہ ہو"

(تاریخ ہندوستانی مصنفہ مسٹر اورمس)

میر جعفر اپنی نوابی کے پانچویں مہینے (ماہ صفر ۱۱۷۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۷۵۷ء) جب انتظام و تسخیر کے ارادے سے مونگیر ہوتا ہوا عظیم آباد کو روانہ ہوا تو انہیں وقت بقول صاحب مظفر نامہ

"[illegible] بجماعت کرنل صاحب و گونتیا ... وکیل گلاب سنگھ در مونگیر ملاقات حاصل کرد ہر چند ارادہ [illegible] در خاطر داشت میر محمد کاظم خاں در دل تصمیم یافتہ بود اما بسبب حمایت انگریز میسر نشد"

لیکن میر جعفر کو عظیم آباد پہنچکر جب شجاع الدولہ کے متعلق فرانسیسیوں اور مرہٹوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ سے بہار کی جانب روانہ ہونے کی متوحش خبر ملی تو اس خبر کے پاتے ہی اس نے راجہ رام نرائن سے سات لاکھ روپئے لے کر بظاہر اپنے بیٹے صادق علی عرف میرن کی ماتحتی میں حکومت بہار کی نیابت بدستور سابق راجہ رام نرائن ہی کے اختیار میں چھوڑ دی لیکن دراصل حکومت بہار کی باگ راجہ رام نرائن کے ہاتھ میں رہی جس کی کئی مثالیں تاریخ کے صفحات پر ملتی ہیں مثلاً کامگار خاں اور سندر سنگھ راجہ ٹکاری کا معاملہ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ بیر بھوم اور بہا... ریاستی علاقے جو ان دونوں کی زمینداری میں تھے ان میں عرصے سے صرف نزاع ہی نہیں بلکہ جنگ جاری تھی۔ کامگار خاں نواب میر جعفر کا آشنائے دیرینہ تھا اور خطوط کے ذریعہ نواب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا برعکس اسکے سندر سنگھ نے راجہ رام نرائن کا دامن پکڑا تھا، جسکا نتیجہ بقول صاحب سیر المتاخرین یہ ہوا کہ

"کامگار خاں بروفق ایمائے رام نرائن بپاس خاطر سندر سنگھ مقید گردید"

نیز دوسری مثال یہ ہے کہ نواب اسد جنگ[۶] کے منجھلے لڑکے فخر الدولہ نقی علی خاں کی آبائی جاگیریں پرگنہ جپلا (ضلع پلاموں)

---

[۵] تذکرہ میر حسن مطبوعہ اورنگ آباد (دکن) صفحہ ۱۲۷ [۶] راقم کا ایک مضمون نواب اسد جنگ کے متعلق رسالہ سہیل ماہ جولائی ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکا ہے (رضا قاسم)

اور نبی نگر و مولا نگر (ضلع گیا) وغیرہ با وجود میر جعفر کی گاڑھی دوستی کے اُس وقت تک واگذاشت نہ ہوئیں جب تک کہ راجہ رام نرائن کی مصلحت نے میر جعفر سے سفارش کی شکل اختیار نہ کی۔

جب میر جعفر نے دیکھا کہ نواب اودھ اور مرہٹوں کا خطرہ اب رونما ہوتا نظر نہیں آتا تو اُس نے پھر پُرپُرزہ جھاڑنا شروع کر دیا اور نہ معلوم کیا سوچ کر اپنے بھائی میر کاظم کو راجہ نرائن کے پاس رہنے کے لئے اُس کا بخشی بنا کر بھیجدیا مگر میر کاظم اپنے قیام پٹنہ کے دوران میں راجہ رام نرائن کے خلاف سازشیں کرنے لگا اور یہی وجہ تھی کہ راجہ رام نرائن اور اُس کے خیر خواہ کرنل کلایو کو میر کاظم کا پٹنہ میں رہنا حد درجہ ناگوار تھا چنانچہ ابھی اسکو پٹنہ میں قیام کئے ہوئے دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ راجہ رام نرائن نے اس کو حکم دیا کہ وہ واپس مرشد آباد چلا جائے گرچہ اُس نے عذر کیا مگر راجہ رام نرائن نے بقول کرم علی ۔۔۔ "جوابے بجز ایں نہ پسندید کہ باید رفت" ۔۔۔ (مظفر نامہ)

چنانچہ میر کاظم کے پٹنہ سے مرشد آباد واپس چلے جانے کے بعد راجہ رام نرائن کو جو تھوڑا بہت خدشہ دامنگیر تھا بالکل ہی جاتا رہا اور اپریل ۱۷۵۸ء سے اوائل ۱۷۵۹ء تک وہ آزادانہ طور پر صوبہ بہار میں حکومت کرتا رہا کہ دفعتًا مغرب سے ایک طوفان اٹھا اور عظیم آباد کے سیاسی مطلع پر گرد آلود ہو گیا یہ طوفان شہزادہ عالی گوہر (جو بعد کو شاہ عالم کے لقب سے تخت دہلی پہ متمکن ہوا) کا تسخیر بہار کی مہم تھی ظہور پذیر ہوا تھا۔

(۴)

راجہ رام نرائن کی حکومت بہار کے دوران میں تین مرتبہ شاہ عالم نے عظیم آباد پر حملہ کیا مگر ہر بار شکست کھائی۔ البتہ ایک دفعہ جبکہ راجہ رام نرائن نے قلعہ عظیم آباد سے نکل کر فتوحہ کے قریب شاہی حملہ آور سے مقابلہ کیا تو اُس وقت اول الذکر کو مُنہ کی کھانی پڑی جسکی تفصیل صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ حد درجہ سبق آموز بھی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اُن واقعات و حالات کو تفصیل سے حوالہ قلم کیا جائے لیکن رسالہ سہیل کی تنگ دامانی اجمال پر مجبور کرتی ہے کشیدہ قامت تیموریوں کا نام لیوا چھبیس مارچ ۱۷۵۹ء کو دریائے کرمناسہ عبور کر کے پہلے داؤد نگر (ضلع گیا) اور پھر ۱۸ ویں مارچ کو پھلواری شریف میں خیمہ زن ہوا۔ جرأت و تحمل، شوکت و تمکنت اور رحم و مروّت کی خاندانی صفات سے ہر چند وہ مبرّا نہ تھا لیکن وقت جس جانبازی، شیر مردی اور تدبر و فراست کا مقتضی تھا افسوس کہ اس کا فقدان تھا چنانچہ چشم پوشی اور خطا بخشی نے کمزوری کا اعلان کیا اور ضبط و صبر نے عزائم کا خون کر ڈالا اور فوری خواہشات کی تکمیل مستقبل کو بھینٹ چڑھانے میں معاون ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ مورخین نے شاہ عالم کی علمی قابلیت، نوشت و خواند کی عادت اور جذبۂ تفحص و تلاش کی بیحد تعریفیں کی ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ملک کو حیدر علی اور شیواجی ایسے ان پڑھ انسانوں کی ضرورت تھی (اور شاید اب بھی ہے) حاشیہ نشینوں میں سے اکثر حضرات نام و نشان کے خواہاں اور جویاں تھے نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ قابلیت و اقتدار میں ہرگز کسی سے کم نہ تھے مگر کوئی بھی اس آوارہ وطن شاہزادے کی صدق دل سے مدد کر کے اپنے ذاتی مفاد کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا، چنانچہ ہندوستان کے موجودہ مایۂ ناز مؤرخ سر جدو ناتھ سرکار شاہ عالم کی ناکامیوں کا اصل سبب مغل اُمراء کی اخلاقی پستی کے ذمّہ عائد کرنے میں یقینًا حق بجانب ہیں۔

بہار کی پہلی مہم (مارچ تا مئی ۱۷۵۹ء) کا کرتا دھرتا محمد قلی خاں ناظم الہ آباد، چند قلعہ شکن توپ اور شکستہ حال سادات بارہہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ البتہ راہ میں جمعیت بڑھتی گئی اور دو ہزار کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی مگر ضبط و نظم اور جذبہ ایثار و سرفروشی کی کمی ذی اقتدار و باا ثر نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ کی شمولیت کے باوجود کچھ فائدہ نہ پہنچا سکی اور بقول نواب غلام حسین خاں۔

"بنا بر آنکہ نفس الامر دلیور مدار الدولہ منیر الدولہ وغیرہ با محمد قلی خاں بتنزل استحکام مستم پیش نہ آمدہ" (سیر المتاخرین ص ۶۶۱)

صاحب سیر المتاخرین نواب غلام حسین خاں کا بیان ہے کہ ناتجربہ کار شہزادے اور اس کے سپہ کار مشیر راجہ رام نرائن کی اس رائے پر کاربند نہ ہوئے کہ اس کو ہمراہ لیکر داخل قلعہ عظیم آباد ہوں تاکہ سرداران بنگالہ کو یارائے پیش قدمی نہ ہو نیز محمد قلی خاں نے ایک شدید غلطی یہ کی کہ اپنے سفیر محمد علی بیگ کی رائے کے خلاف راجہ رام نرائن کو بلوا کر یہ کہدیا کہ بادشاہ نے میرے بھائی مرزا احسن کو صوبۂ بہار عطا کر دیا ہے اور تمہیں اس کی دیوانی مبارک ہو یہاں پر منالال منصف شاہ عالم نامہ کی مندرجہ ذیل عبارت بھی حوالہ قلم کر دینا خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

"راجہ پیر فرتوت و مرغ زیرک بود از اوضاع حوارین سلطنت و قوت یافتہ منصوبہ انگیخت کہ ازیں مردم غرض آلود کہ نظر بر دوانند و راستوبی کاہد نی نعمت محض بے توفیق اند بساط فریب گسترده بدغا باید یافت الغرض ہریکے را ہزار ہا اشرفی رشوت ستانیدہ مقرر کرده معاملہ سرکار دو الارا لک روپیہ انفصال یافت و شرط چناں آورد کہ ادا زر مستحقہ در قلعہ رفتہ نماید اعتبار الدولہ و دیگر خیر اندیشان کہ از عقل بہرۂ کامل داشتند تعرض رسانیدند کہ بدوں نشان معتبر زر پیشکش رخصت ایں مرغ زیرک مناسب نیست غرض ایشاں کہ بد التجا بود پذیرانہ شد و آں جو فروش گندم نما بدوں ادائے زر پیشکش رخصت شده میرفت و در قلعہ رفتہ فلاہ نخوت کج نہاد و آمادہ پیکار شد" —————— (شاہ عالم نامہ قلمی نسخہ صفحہ ۲ب)

دیگر صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے۔ "او در قلعہ رفتہ فرمان داد کہ مردم از مورچہ وباره قلعہ پیش از پیش خبردار بوده در استحکام کوشند"

یہ سب کچھ تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ راجہ رام نرائن ایک طرف تو لشکر بنگالہ کے انتظار میں چاپلوسی سے کام لے رہا تھا تو دوسری طرف محمد قلی خاں لہو لعب اور تماشائے رقص و طرب میں منہمک تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ گویا حکومت بہار کی مہم سر ہو چکی اور راجہ رام نرائن اب اسکا ملازم ہے چنانچہ عید نوروز میں راجہ رام نرائن نے چند تحائف بھیجکر اُسے اور بھی پھلا دیا تھا لیکن جب شاہزادے نے شہر سے ہو کر مشرق کی جانب جانا چاہا تو اس وقت راجہ رام نرائن کو جیسے ہی کہ میرن کی آمد کی خبر (مع انگریزی فوج اور کرنل کلایو) فوراً شہر کے باہر نکلوا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولیعہد نے (سپہ سالار محمد قلی خاں) نے ۲۳ ویں مارچ کو جنگ شروع کر دی۔ ادھر راجہ رام نرائن نے بھی زیر حصار مورچال قائم کیا، آٹھ روز تک صبح سے شام تک لڑائی ہوا کی نویں روز مہدی گنج کا برج ٹوٹ کر راستہ پیدا ہو گیا اور بقول نواب غلام حسین خاں ۔

"مردم محمد قلی خاں ہجوم آورده یورش نمودند محصوران ہم پائداری نموده سنگ آسیا و سلبوچہ ہائے باروت آتش داده بر سر مردم ریختند" (سیر المتاخرین)

نیز اسی مورخ کا بیان ہے کہ "دوسو سے زیادہ جانیں اس موقعہ پر تلف ہوئیں لیکن کارے پیش نرفت"

دوسرے دن صبح کو شاہزادہ اور محمد قلی خاں کے درمیان یحییٰ خاں بیرزکریا خاں کے ذریعہ رام نرائن سے مخفی مفاہمت کے سبب ملال عظیم رونما ہو گیا اور محمد قلی خاں نے اپنی فوج بائیں حصار سے واپس بلوالی، بالآخر شاہزادے نے محمد قلی خاں کے خیمے میں جا کر بصد دقت اُسے راضی کیا اور تب محاصرہ پھر شروع ہوا۔ راجہ رام نرائن اور دیگر محصورین کا قافیہ اب تنگ تھا اور قریب تھا کہ قلعہ کو چھوڑ کر سب فرار کر جائیں کہ ناگاہ ۵ ویں اپریل کو کلایو کا ہراول جون میتھو ایک انگریزی دستہ لے کر آن پہنچا اور پھر عقب سے میرن اور کرنل کے آمد کی خبر دی اس خبر کے ساتھ ساتھ محمد قلی خاں کو بقول منالال یہ خبر بھی ملی کہ

"شجاع الدولہ از مختار شدن او حسد برده بسرعت تمام خود را در قلعہ الہ آباد رسانید و عذر و مکر انگیختہ قلعہ را متصرف شده اہل و عیال او را از اں بند نمود" (شاہ عالم نامہ نسخہ صفحہ ۲ب)

۵؎ مراۃ السلاطین (اُردو ترجمہ سیر المتاخرین) مطبوعہ نولکشور پریس۔

[redacted]

ان اخبار نے محمد قلی خاں کو ایسے بے ہوش و حواس غائب کر دئے اور باوجود شہزادے کے سمجھانے اور روکنے کے وہ دوسرے روز الٰہ آباد روانہ ہو گیا اور مجبوراً شہزادے کو بھی واپس جانا پڑا۔ وہ ابھی پھلواری شریف ہی تک پہنچا تھا کہ فرانسیسی جنرل لوسی لال نے شہزادے کو دوبارہ جنگ پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ جب شاہزادہ اور آگے بڑھا تھا تو پہلوان سنگھ زمیندار نوکھا Nokha (پرگنہ سہسرام) نے بھی اپنی خدمتیں پیش کیں لیکن شہزادہ کو اعتماد نہ ہوا۔ اس اثنا میں میرن اور کرنل کلایو مع فوج عظیم آباد پہنچ چکے تھے چنانچہ راجہ رام نرائن انہیں ساتھ لیکر شہزادے کے تعاقب میں بھوجپور اور چین پور (علاقہ سہسرام) میں ۲۷ ویں اپریل کو آ دھمکا۔ ۱۰ ویں مئی کو پہلوان سنگھ زمیندار نوکھہ پر حملہ کیا گیا اس نے اطاعت قبول کر لی۔

شہزادہ صوبہ بہار چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ ۱۴ ویں مئی کو مرزا پور اور ۲۰ ویں مئی کو ریاست ریواں پہنچا۔ یہاں کے راجہ نے موسم برسات تک اس جلیل القدر مگر بدنصیب مہمان کی خاطر مدارات کی۔ اپنے قیام ریواں کے دوران میں شاہزادے نے نواب غلام حسین خاں (صاحب سیر المتاخرین) کے ذریعہ کرنل کلایو سے صلح کی سلسلہ جنبانی کی لیکن فاتح نے صرف اشرفیاں بطور نذرانہ بھیجنے پر اکتفا کی۔

اسی درمیان میں ولندیزوں (ڈچ قوم) اور انگریزوں کے درمیان آویزشیں شروع ہو گئیں و نیز میر جعفر اور اسکے بیٹے میرن کی بخالتیں ستم رانیاں اور بدعنوانیاں بھی حد سے بڑھ چلی تھیں اور ان میں حالات کے پیش نظر کامگار خاں، دلیر خاں، اصالت خاں اور قادر داد خاں وغیرہ کے عرائض شاہزادہ عالی گوہر کے دوبارہ تسخیر بہار کی توجہ کے باعث ہوئے چنانچہ ماہ اکتوبر کے آخر میں شاہزادہ مذکور ریاست ریواں سے روانہ ہو کر مرزا پور اور سہسرام ہوتا ہوا ۱۷۵۹ئ دسمبر کو جب موضع گھٹولی[۵۱] کے قریب پہنچا تو اس کو عالمگیر ثانی کے قتل کی خبر دہلی سے موصول ہوئی اور نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ کے مشورہ سے فوراً اسی مقام پر دربار آراستہ ہوا۔ شہزادہ شاہ عالم کے لقب سے تخت نشیں ہوا عطایات و مناصب کی تقسیم شجاع الدولہ کا وزارت پر تقرر اور احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں سفارت کی روانگی قرار پائی۔ کامگار خاں پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ پہنچا منصب ہفت ہزاری، پالکی جھالردار، علم و نقارہ اور عقیدت الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ دلیر خاں اور اصالت خاں ہزار سوار و پیادہ کے ساتھ حاضر ہوئے و نیز اکثر زمینداران و راجگان اکٹھا ہوئے۔

ادھر راجہ رام نرائن کی بھی ہمت بڑھی ہوئی تھی، پہلوان سنگھ زمیندار نوکھا، رحم خاں روہیلہ، مراد خاں بلوچ، احمد خاں قریشی (نبیرہ نواب داؤد خاں[۵۲] قریشی فاتح پلاموں) و نیز دوسرے زمینداران کو ساتھ لیکر پٹنہ سے باہر نکلا اور شہر سے تقریباً چار پانچ کوس دور دیھوا ندی کے کنارے جنگ کے ارادے سے خیمہ زن ہو گیا۔ جب شاہی فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو بعض سرداروں کے بہکانے سے مغرور ہو کر انگریزی فوج کی آمد کے قبل (ریا اپنا خیال کہ کامیابی کا شمار کہیں ان کے نام نہ کیا جائے) نویں فروری مطابق ۲ ویں جمادی الثانی ۱۱۷۳ھ کو بمقام معصوم پور[۵۳] شاہی فوج سے مقابل ہوا۔ اس لڑائی میں کامگار خاں نے راجہ رام نرائن کے ہاتھی سے اپنا گھوڑا ملا دیا اور اتنے تیر و نیزے مارے کہ گویا اپنی دانست میں رام نرائن کو مار ڈالا لیکن راجہ رام نرائن نے ہودج کے اندر لیٹ کر تختوں کی آڑ میں اپنی جان بچائی اور بھاگ کر قلعہ عظیم آباد میں روپوش ہو گیا۔ دلیر خاں اور اصالت خاں اس لڑائی میں مارے گئے

---

۵۱ یہ مقام سون الیسٹ بینک (بارون) ریلوے اسٹیشن سے تقریباً پانچ میل جانب شمال واقع ہے ۵۲ نواب داؤد خاں قریشی فاتح پلاموں بعہد اورنگ زیب (عالمگیر) صوبہ بہار کا گورنر تھا، اس نامور شخصیت کے متعلق ناچیز کا ایک مضمون ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء میں ملاحظہ فرمایئے۔ ۵۳ یہ مقام درمیان فتوحہ اور باڑھ ضلع پٹنہ میں واقع ہے

اس کے بعد بادشاہ بنگالہ کی طرف روانہ ہوا، ایک دو منزل گیا تھا کہ میرن انگریزوں کی ایک فوج لیکر آدھمکا پہلے ہی مقابلے میں میرن تیر سے زخمی ہوکر بھاگ نکلا مگر پھر انگریزوں کے استقلال سے شرماکر لوٹ آیا آخرکار اس لڑائی میں بادشاہ نے ہزیمت اٹھائی اور وہ چند روز قصبہ بہار شریف میں ٹھہرکر مرشدآباد کی طرف روانہ ہوا میرن دریا کے راستے سے سدراہ ہوا، ناچار بادشاہ کو واپس لوٹنا پڑا اور وہ مانپور (ضلع گیا) کی طرف روانہ ہوگیا لیکن انگریزوں نے اس شکست کے بعد بھی بادشاہ کا بڑا خیال کیا اور راجہ شتاب رائے کو مصالحت کی غرض سے بادشاہ کے پاس بھیجا۔ راجہ شتاب رائے نے شاہ عالم کو سمجھایا کہ انگریز بنگال اور بہار پر قابض ہوچکے ہیں تاہم وہ آپ کی تابعداری پر تیار ہیں لیکن کامگار خاں نے بادشاہ کو بہکایا نواب ہدایت علی خاں اسد جنگ نے فہمایش کی کہ کامگار خاں سپاہی پیشہ ہے اور لڑنا بھڑنا اُس کا کام ہے مگر بادشاہوں کے لئے گریز پایاں مناسب نہیں۔ اسی اثنا میں شجاع الدولہ نے بادشاہ کی خدمت میں بغرض طلبی عرضداشت بھیجی اور شاہ عالم نے بھی وہاں جانا مصلحت سمجھا اس لئے ادھر کے معاملات کو بمصالحت طے کرنا مناسب سمجھا چنانچہ بذریعہ راجہ شتاب رائے مصالحت ہوگئی۔

دوسرے دن میجر کارنک مانپور (گیا) آکر شاہ عالم کو پٹنہ لے گیا، اُسی وقت نواب میر قاسم بھی پٹنہ پہنچا۔ انگریزی کوٹھی میں دیوان عام ہوا، تخت کی جگہ کھانے کی میز پر مسند شاہی آراستہ کی گئی۔ شاہ عالم نے اس پر جلوس فرمایا، انگریز صف باندھ کر کھڑے ہوئے۔ نواب میر قاسم بھی حاضر دربار ہوا اور مجرا بجالاکر ایک ہزار اشرفی نذر دی، خلعت نظامت عطا ہوئی، میر قاسم نے چوبیس لاکھ روپئے خراج دینا قبول کیا۔ غرض اس وقت عجلت میں شاہ عالم ان ہی اُمور کو طے کرکے صوبہ اودھ کی طرف روانہ ہوگیا۔

(۵)

بلاشبہہ اس وقت صوبہ بہار کے لئے میر قاسم ایسے ہوش وگوش اور مستحکم ارادہ رکھنے والے حکمراں کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ انگریزوں کے ہاتھوں اُس کا جو حشر ہوا اس کو یہاں لکھکر مضمون کو طول دینا مقصود نہیں ہے البتہ اس مضمون کی آخری سطروں میں نہایت اختصار کے ساتھ نواب میر قاسم اور راجہ رام نرائن کی کشیدگی تعلقات کا (جو دراصل راجہ رام نرائن کے آخری ایام زندگی سے متعلق تھا) بیان کردینا ضروری ہے۔

سنہ ۱۷۶۰ء (۱۱۷۴ھ) میں میر قاسم بنگال وبہار کی مسند نظامت پر متمکن ہوا تو اس نے راجہ رام نرائن سے زرخزانہ کا محاسبہ کیا، کاغذات سے راجہ رام نرائن پر کثرت سے غبن اور خیانتیں ثابت ہوئیں اور گرچہ راجہ رام نرائن نے بہت سے روپئے دوسروں کے گھروں میں رکھواکر خزانہ خالی کردیا تھا مگر پھر بھی ستر لاکھ روپئے اس سے وصول کئے گئے لیکن میر قاسم نے اسی پر بس نہ کی بلکہ راجہ رام نرائن کو قید کردیا اور جب کچھ دنوں بعد اس کی کچھ انگریزوں سے بگڑگئی اور نوبت جنگ کی پہنچی تو مونگیر سے بھاگتے وقت اس نے راجہ رام نرائن کے گلے میں مٹکا بندھواکر اور اسے ریت سے بھرکر گنگا میں ڈبو دیا۔ بہرحال میر قاسم اور راجہ رام نرائن کے درمیان ظاہری نزاع کب اور کیوں شروع ہوئی جس کا مفصل بیان طوالت سے خالی نہیں مگر مختصراً حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی بدظنی اور دشمنی کا آغاز میر قاسم کی مسند نشینی کے قبل ہی سے ہوچکا تھا۔ ظاہر ہے کہ خاندان علی وردی سے راجہ رام نرائن کی شیفتگی کے باعث اس کا دل حقیقی معنوں میں غدار میر جعفر اور اس کے داماد میر قاسم کی۔ سچے دل سے کیونکر اطاعت کرسکتا تھا، خصوصاً جب کہ خود ان کے طرز عمل نے جذبۂ برگشتگی کو اور بھی ابھار دیا تھا۔ لیکن اب اس کو انگریزوں کا اقبال کہیئے یا ان کی قوت کا رعب یا ہندوؤں کی طرف خاص میلان کہ شروع میں تو راجہ رام نرائن کی انگریزوں کے خلاف نواب کی حمایت میں رسّہ کشی پائی جاتی ہے لیکن کلایو کا پٹنہ کی طرف رُخ کرنا تھا کہ تعلقات میں

کایا پلٹ ہو گئی

قارئین کرام اگلے صفحات پر ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ دانایانِ مغرب کی حمایت سے راجہ رام نرائن نواب میر جعفر کے مقابلے میں کیسا شیر بنا ہوا تھا۔ کیا معاملہ فہم اور دُور بیں دماغ رکھنے والے میر قاسم سے یہ باتیں مخفی رہ سکتی تھیں ؟ کلایو گرچہ اس وقت انگلستان میں تھا لیکن اس کا چہیتا افسر میجر کارنک (انگریزی افواج مقیم پٹنہ کا کماندار) نہ صرف میر جعفر کی حکمت عملیوں سے بخوبی خبردار بلکہ نئے نواب (میر قاسم) سے حد درجہ بیزار بھی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میر قاسم یک گونہ شکی مزاج ضرور تھا لیکن میجر کارنک اور راجہ رام نرائن کی ہزیمت یافتہ بادشاہ کے ساتھ خاص مراعات لہ و نیز بعض دیگر اسباب ایسے مہیا ہو گئے تھے جو راجہ رام نرائن اور میر قاسم کی کشیدگی میں اضافہ کرنے کے لئے کافی تھے چنانچہ میر قاسم کے مسند نشیں ہوتے ہی اُس کی طرف سے راجہ رام نرائن کو انگریزوں کی دوستی کی یاددہانی کر کے اس کو اپنے رویہ کو درست کرنے کی ہدایت مل چکی تھی مگر حالات بدسے بدتر ہوتے گئے یہاں تک کہ جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے ۱۷۶۳ء میں راجہ رام نرائن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ؎

گیا جہاں سے خورشید ساں اگرچہ میرؔ ولیک مجلس دنیا میں اُسکی جا ہے گرم

نغمۂ پُر کیف

از جناب شاکر صدیقی

کسی کے دردِ دروں کو بڑھا دیا تو نے
جہانِ رنج و الم کو مٹا دیا تو نے

یہ کیا مرتبہ بخشا، کہ تیرا مجرم ہوں
بڑھا بڑھا کے مجھے کیا گھٹا دیا تو نے

مرے عیوب ترے سامنے تو چھپ نہ سکے
میں تجھ پہ صدقے کہ سب کو چھپا دیا تو نے

ہزاروں رنگ کے جلوے دکھا کے بندوں کو
خود اپنی یاد سے غافل بنا دیا تو نے

مری سمجھ میں نہ آئی تری کریمی کچھ
صدف سے چھین کے گوہر لٹا دیا تو نے

اسی لئے کہ تری دید سے رہوں محروم؟
نگاہِ روشن و قلبِ صفا دیا تو نے

خدنگ ناز سے مجروح ہو گیا شاکرؔ
اسے بھی اپنا کرشمہ دکھا دیا تو نے

لہ جو درحقیقت کبھی شرمندۂ عمل نہ ہوئی۔ رضا قاسم

مسلمانوں کے زمانہ حکومت میں ہندوستان کا نظام تعلیم

از جناب نصیر حیدر رضوی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ میمن سنگھ بنگال

ہندوستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں کے مسلمان بادشاہوں نے ہر زمانہ میں اپنی رعایا کو تعلیم سے بہرہ ور کرنا اپنا ایک بڑا فریضہ سمجھا۔ اور مسلمانوں کے ابتدائی عہد سے لیکر اسلامی سلطنت کے زوال تک ہمارے وطن کے کل باشندوں کو حکومت کی جانب سے بلا استثنا ہر قسم کی سہولت تعلیم کے سلسلہ میں ملتی رہی۔

شروع شروع جب شمالی ہند پر اسلامی فوجیں حملہ آور ہوئیں تو حسب دستور ان کے ساتھ مبلغین کی بھی ایک جماعت اس ملک میں داخل ہوئی۔ مسلمانوں کا معمول تھا کہ جب کوئی نیا مقام فتح کرتے تو وہاں غالبًا اپنے قبضہ کا اعلان کرنے کے لئے ایک مختصر سی مسجد ضرور بنا دیتے۔ اس مسجد کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا مکتب بھی قائم کر دیا جاتا تھا۔ مبلغین کا گروہ خانقاہیں بنوا کر نئے نئے مقامات پر اپنے قیام کا انتظام کرتا۔ اور اس طرح پر دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ مسجدوں۔ مکتبوں اور خانقاہوں کے اخراجات کی کفالت مقامی امراء اور رؤسا کے ذریعہ عمومًا ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کی عنایت سے لاخراج جاگیریں ان مختلف اداروں کو حاصل ہو جاتیں۔ اور اسطور پر کسی مالی دقت کا انہیں سامنا نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ اسلامی سلطنت کے استحکام کے ساتھ ہی حکومت نے ان درسگاہوں اور خانقاہوں وغیرہ کی نگرانی کے لئے ایک نیا شعبہ قائم کر کے انہیں اپنے صدر الصدور کے سپرد کر دیا جس کا اہم فریضہ یہ تھا کہ حسب ضرورت ہر ایسے مفید ادارے کو اپنی سفارش کے ذریعہ حکومت سے امداد دلوائے۔ اور ان کے وجود کو برقرار رکھکر انہیں اندرونی خرابیوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ پرانے کاغذات کی چھان بین کرنے سے اب بھی بہتیرے اسناد اور فرمان شاہی ملینگے جن کے ذریعہ مختلف درسگاہوں۔ خانقاہوں اور مسجدوں کو حکومت اسلامیہ نے جاگیریں اور لاخراج اراضیات بخشی تھیں۔

مغلوں کے عہد سے پہلے جتنے اسلامی خاندان ہندوستان پر حکمران رہے ان کے زمانہ میں رعایا کی تعلیم کسقدر وسعت حاصل کر چکی تھی۔ اس کا معمولی اندازہ محض اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بقول ابن بطوطہ صرف دہلی شہر کے اندر ایک ہزار سے زائد مدرسے موجود تھے۔ اور فیروز تغلق کے زمانہ میں تو ایک خاص محکمہ تعلیم ہی قائم تھا کہ جس کے ذریعہ ہندو اور مسلمان کل رعایا کو تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی۔

لودی خاندان نے اس امر میں جس قدر دلچسپی لی ہے اس کا مفصل ذکر صفحات تاریخ میں آج بھی ملتا ہے۔ امیر تیمور جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو قتل و غارتگری کے دوران میں اپنے سپاہ کو سخت خاص حکم دے رکھا تھا کہ مدرسوں اور خانقاہوں سے الگ رہنا۔ خبردار انہیں یا فقرہ نہ لگانا

عہد بابری کی تاریخ اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ بادشاہ نے اپنی ہندوستانی رعایا کی عام تعلیم کا انتظام محکمۂ شہرت عامہ کے سپرد کر رکھا تھا اور اپنے خزانہ سے ہر طرح کی امداد درسگاہوں کے لئے منظور کر رکھی تھی۔ ہمایوں نے بھی قدم بقدم باپ ہی کی تقلید کی۔ اور اس کے بعد اکبر ی دور تو بے شک مشہور ہے کہ علم و فن کی ترویج و اشاعت جیسی اکبر اعظم کے عہد میں ہوئی ویسی ہندوستانی کے اندر کبھی نہ ہوئی۔ ... الد... س

فتنۂ بیدار

ایک ہندی مہیارہ کو محوِ خواب دیکھ کر

(از جناب وحشی آروی)

بسترِ کمخواب پر وہ محوِ خوابِ ناز ہے
حُسن کی تابندگی برق کا انداز ہے

نور کے دریا پہ یوں اُبھرا ہے خوابیدہ شباب
ناچتا ہے چاندنی کرنوں پہ گویا آفتاب

یا سمٹ آئی ہے آغوشِ تجلّی میں یہ رات
یا شراب و شعر میں ہے غرق ساری کائنات

غافل از تابانیِ جلوہ ہے وہ رشکِ قمر
ہاں! نگاہِ شوق تو بھی آج ہو جا بیخبر

روح کی گہرائیوں میں بادۂ سرجوش ہے
کائناتِ عالمِ مشہود بھی بیہوش ہے

سر جھکاتی ہیں عقیدت سے ملائک بھی یہاں
کفر کے ماحول میں پابندیٔ ایماں کہاں

بے نیازِ شوق شرحِ حُسن کی دوشیزگی
قدسیوں نے بھی نہیں پائی ہے یہ پاکیزگی

چشمِ خوابیدہ نہیں، ہے بند میخانے کا باب
اسکے وا ہونے پہ کتنی ہستیاں ہونگی خراب

کسقدر یہ منظرِ معصوم کیف انگیز ہے
ہلکی ہلکی مُسکراہٹ کتنی معنی خیز ہے

منتشر گیسو ہیں یا لیلائے شب ہے بے نقاب
یا کھلی ہے رازہائے طور کی رنگیں کتاب

ہیں پسینے کے یہ قطرے عارضِ گلفام پر
یا گُہر فرشِ رخامِ مرمریں پر منتشر

موجِ گلزارِ تنفس کتنی عنبر بیز ہے
رنگ و بو میں غرق اسکا عالمِ نوخیز ہے

سُرخ بندی یوں چمکتی ہے جبینِ پاک پر
صبح کا تارہ ہو جیسے آسماں پر جلوہ گر

کسمسا کر کروٹیں لیتا ہے جب وہ لالہ رو
عشق کے دل میں مچل جاتا ہے طفلِ آرزو

یہ طلائی بجلیوں کا جھلملانا ہائے ہائے
چوڑیوں کی یہ صدائے والہانہ ہائے ہائے

یہ ادائیں بھولپن کی یہ جوانی کی بہار
نے حقیقت ہے یہاں بوڑھے فرشتوں کا وقار

لُٹ گئی وحشیؔ مری وہ شانِ تقدیسِ خیال
از سرِ نو کر رہا ہوں آج تاسیسِ خیال

کی تعلیم کا پورا بار سلطنت پر تھا۔ جہانگیر کی علم دوستی کا پتہ خود اس کی تزک سے ملتا ہے۔ اور شاہجہان کے زمانہ میں رعایا کی تعلیم کس حال پر تھی۔ اس کے متعلق مرأت احمدی اور جام جہان نما میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔ اسی طرح عہد عالمگیری کی تاریخیں شاہد ہیں کہ بادشاہ اورنگ زیب نے ہر ہر شہر اور قصبہ و دیہات میں شاہی خزانہ کی امداد سے درسگاہیں کھلوا رکھی تھیں۔ اور اپنے صدر الصدور کے ذریعہ رعایا کی عام تعلیم کا مناسب بندوبست خود ہی کر رکھا تھا۔

یہاں تک تو اختصاراً مرکزی حکومت کا ذکر عوام کی تعلیم کے متعلق کیا گیا۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بھی جہاں کہ ایک طور پر چھوٹی چھوٹی آزاد سلطنتیں تھیں۔ تعلیم کی طرف حکمرانوں کی کافی توجہ رہا کرتی تھی۔ بختیار خلجی اور غیاث الدین بلبن وغیرہ جیسے سلاطین کو عوام الناس کی تعلیم کی ذمہ داری کا کس قدر احساس تھا۔ اس کا مفصل تذکرہ تاریخ فرشتہ میں موجود ہے۔ گجرات کے حکمرانوں کی تعلیمات سے دلچسپی کا حال تاریخ مرأت احمدی میں ملیگا۔ مالوہ کی حکومت کے ضمیمۂ تعلیمات کے متعلق مآثر رحیمی میں معلومات کا کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ اسی طرح دکن کی تاریخوں اور شاہانِ اودھ کے تذکروں میں وہاں کے سلاطین کی سرپرستی میں عامۂ خلائق کی سہولت کے لئے جس قدر درسگاہیں کھولی گئیں اور انہیں خزانۂ حکومت سے امداد و اعانت حاصل ہوئیں ان کا سب کچھ حال موجود ہے۔ ان سب بادشاہوں کے عہد میں علم و فضل کی جس قدر ترقی اور تالیفات و تصنیفات کی کثرت ہوئی ان باتوں سے جس واحد نتیجہ پر ہم پہنچتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ ہندوستان کے کل مسلمان سلاطین کو علم و فن کے فروغ کے سلسلہ میں کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اسی کے باعث ہندوستان کے باہر سے بھی ہر عہد میں علماء و فضلاء کی کافی تعداد ہمارے ملک اور وطن میں آکر قیام کرتی رہی۔ اور ان کی سرپرستی و ہمت افزائی کی خاطر خزانہ حکومت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ بہر ظاہر ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم یہاں کے امراء اور رؤسا نے بھی اپنے اپنے مقام پر علم و فن کی ترویج اشاعت کے لئے ہر طرح اپنے علم دوست حکمرانوں کی پیروی کی اور ہندوستان کے ہر خاص و عام کے درمیان علم کا چرچا جاری رہا۔ ہر امیر و رئیس کا گھر بذاتِ خود ایک ایک علیحدہ علمی مرکز تھا۔ اور ملک کے ہر ہر گوشہ میں علم کا چراغ اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔

ہندوستان کے اندر اسلامی دور حکومت میں چھوٹے چھوٹے مکتبوں کا درجہ موجودہ زمانہ کے پرائمری اسکولوں کے برابر تھا اور فارسی زبان کی اوسط تعلیم کے لئے آجکل کے سکنڈری اسکول کی طرح مدرسے جابجا قائم تھے۔ اسی قسم سے عربی زبان کے اعلیٰ مدارس گویا اس وقت کے کالجوں کی طرح تھے۔ ان تینوں قسم کی درسگاہوں کے لئے مرکزی حکومت کی طرف سے نصاب تعلیم عموماً مقرر ہوا کرتا تھا۔ اور ایک ہی نصاب تمام ملک میں رائج تھا۔ اکبر اعظم کے عہد میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے متعلق جو نصاب اور طریقے رائج تھے۔ ان کا مفصل ذکر آئین اکبری میں موجود ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم کچھ ایسا مناسب تھا کہ اس کی ترقی یافتہ صورت اٹھارہویں صدی عیسوی تک ہندوستان کے اندر ہر دیہاتی مدرسہ اور پاٹ شالہ میں موجود نظر آتی تھی۔ اور بقول مورخین دیہات کا بچہ بچہ تھوڑی مدت میں لکھنے پڑھنے پر قادر ہو جایا کرتا تھا۔

نصاب تعلیم کے سلسلہ میں جب کوئی تبدیلی کسی خاص وقت میں ہونے کی نوبت آتی تو اس کا اعلان مرکزی حکومت کی طرف سے باقاعدہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس کے متعلق عوام الناس کی مختلف ذہنیت اور ملک کے مختلف صوبوں کی حالت کا باضابطہ اندازہ لگایا جاتا کیونکہ [illegible] طرح کا نصاب تمام ملک میں رائج کیا جاتا تھا۔

اختتام تعلیم کے بعد طلباء کی صلاحیت کے متعلق ممتاز اساتذہ کے سامنے امتحانوں کا بھی دستور جاری تھا۔ اسی طرح شرفاء کے



حضرت نصرت آروی



اودھ کشور نمائندہ کنندہ
وکیل گیا



محمد فضل الرحمن صاحب پھلواروی

مجمع میں کسی معزز شخصیت کے ہاتھوں اسناد بھی تقسیم کئے جاتے تھے۔ عہد شاہجہانی میں سرکاری حکام کے ذمہ ملکی درسگاہوں کا معائنہ کرنا ایک لازمی فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ دستور آخر تک قائم رہا۔ مسلمانوں کی حکومت کے پچھلے زمانے کی تاریخیں ان حالات سے بھری پڑی ہیں۔

مسلم حکمران اپنی ہندو اور مسلمان رعایا کیلئے یکساں طور پر تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ دونوں کی مذہبی تعلیم کے لئے الگ الگ نصاب خود مرکزی حکومت مقرر کرتی تھی۔ اور اس خصوص میں کسی طرح کے تعصب کو کبھی دخل نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی علیحدہ درسگاہیں ہندوؤں کی خاص تعلیم کیلئے مسلمان سلاطین نے قائم کی تھیں۔ اور ان کی امداد خود حکومت کی جانب سے ہوا کرتی تھی۔ بنارس۔ دربھنگہ۔ پوری۔ ندیا۔ بکرم پور وغیرہ خاص خاص مقامات میں ہندوؤں کی جتنی درسگاہیں تھیں وہ سب کی سب مسلمان حکمرانوں کی سرپرستی میں رہیں۔ چنانچہ ان مقامات پر سنسکرت زبان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ لارڈ منٹو کا بیان ہے کہ ہندوؤں کی تیرتھ گاہوں سے جو کچھ رقم مسلمانوں کے حکومت میں بطور محصول لی جاتی تھی۔ وہ سب کی سب ہندو قوم کے بچوں کی تعلیم پر صرف ہوتی تھی۔ اور یہ کام خود ہندو عمال کے سپرد تھا۔

تعلیم نسواں کی طرف سے بھی مسلمان غافل نہ تھے۔ مکتبوں میں تو لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم پاتے۔ مگر بڑی عمر کی لڑکیوں اور عورتوں کو عموماً گھر کے اندر پڑھانے کا دستور تھا۔ تاریخ فرشتہ میں سلطان غیاث الدین خلجی کی تعلیم نسواں کے متعلق سرگرمی کا حال جو کچھ درج ہے۔ وہ البتہ ایک حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے کہ سلطان نے عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک ایسی بڑی اور مکمل درسگاہ کا بندوبست کیا تھا جہاں علاوہ پڑھنے لکھنے کے صنعت و حرفت کی بھی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ان درسگاہوں کی تعلیم یافتہ عورتیں خیاطی۔ نجاری اور آہنگری میں بھی ماہر نظر آتی تھیں۔

فغانِ حسرت

از جناب حکیم سید شاہ فضل حق حسرت شاہجہانپوری

پھر ہوئی ہلکی سی جنبش نوکِ مژگاں دیکھئے
چبھتے نشتر ہیں یہ پھر رگِ جاں دیکھئے

مجھ سے کہتا ہے خیالِ زلفِ جاناں دیکھئے
دیکھئے اور رات بھر خوابِ پریشاں دیکھئے

سوئے داماں دیکھئے سوئے گریباں دیکھئے
دیکھئے زورِ جنون فتنہ ساماں دیکھئے

وہ پڑی ہے سامنے اک نعش بے گور و کفن
آئیے اب خاک میں ملنے کے ساماں دیکھئے

اس سے کھل جائے گا میعادِ اسیری کا پتہ
پہلے زنگ آلود قفلِ بابِ زنداں دیکھئے

ہے حدِ منزل پہ اب بیمارِ غم کا اضطراب
اس کی مشکل ہو رہی ہے آج آساں دیکھئے

کس قدر فرحت اثر ہیں حسن کی رنگینیاں
ہو اگر ذوقِ نظر تا حدِ امکاں دیکھئے

توڑتا ہوں آج زنجیرِ عناصر کی کڑی
آیئے اور راحتِ تامِ قیدِ زنداں دیکھئے

آفتابِ حشر پوشیدہ ہر اک ذرے میں ہے
چشمِ دل سے منظرِ گورِ غریباں دیکھئے

پھول تربت پر چڑھائیں یا چڑھائیں تیوریاں
روحِ عاشق پر وہ کیا کرتے ہیں احساں دیکھئے

یاد ہے حسرت کسی کا ہنس کے کہنا یاد ہے
آپ کرتے ہیں مجھے ناحق پریشاں دیکھئے

گریۂ رائگاں

از جناب فراقؔ گورکھپوری ایم اے پروفیسر انگریزی الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

اُٹھ گئے پر رنگِ محفل کو کہانتک روئیے
حال جس کا یہ ہو اُس دل کو کہانتک روئیے

یاد آتے ہیں فریب امتیازِ قرب و بعد
شامِ غربت صبحِ منزل کو کہانتک روئیے

اس سے ملکر اور مٹ جانیکی حسرت دل میں ہے
عشق کی تحصیلِ حاصل کو کہانتک روئیے

تیرنے والے فریبِ جزر و مد کھاتے رہے
وحدتِ گرداب و ساحل کو کہانتک روئیے

کچھ تغافلہائے پنہاں بنگئے لطف و کرم
اب اس آسانی و مشکل کو کہانتک روئیے

کچھ صداؤں نے بسا رکھا ہے زندانِ حیات
شورشِ سازِ سلاسل کو کہانتک روئیے

عشق کو اکسیر ہو جانے پہ کتنا ناز تھا
اس فریبِ سوزِ کامل کو کہانتک روئیے

اپنا اپنا رنگ اپنا اپنا اندازِ سلوک
[illegible]ل حسنِ قاتل کو کہانتک روئیے

دل کی ہر دھڑکن ہے تصویرِ سکون و اضطراب
ہستیٔ آسان و مشکل کو کہانتک روئیے

اس نے پیمانِ وفا بھی کر دیا پورا فراقؔ
حق اگر یہ ہے تو باطل کو کہانتک روئیے

فریبِ نظر

ایک بہترین افسانہ جدید طرز نگارش میں

از پروفیسر شیخ عبد اللطیف تپش ایم۔ اے۔ ام او ال۔ لکچرار ایمرسن گورنمنٹ کالج ملتان (پنجاب)

"تو کیا ضرور جاؤ گے؟"

"مجبوری ہے جانا ہی پڑے گا۔"

"پھر مجھ سے پوچھنے کے کیا معنی"

(ٹھنڈا سانس لیکر) نہ پوچھوں تمہاری اجازت کے بغیر چلا جاؤں۔

اچھا آؤ گے کب؟

"ایک ہفتہ میں"

یہ سن کر شیلا نے اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کی۔ مگر منڈ اہوا دن آنکھوں سے برسنے لگا۔

ہریش۔ (شیلا کی ٹھوڑی کو انگلی سے اٹھا کر) کیوں؟ ہائیں۔ شیلا۔ شیلا۔ یہ کیا؟

شیلا۔ (ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ہریش کی طرف دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں) کیا؟

ہریش۔ روتی کیوں ہو؟

شیلا۔ میں؟ روتی ہوں؟

ہریش۔ ہیں تو کیا ہنس رہی ہو؟

شیلا۔ سبب؟ ہریش! خیر!! جلدی آنا!!!

یہ کہتے کہتے ایک دفعہ پھر اسکے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

ہریش۔ (بے چین ہو کر) شیلا تمہیں آج کیا ہو گیا ہے۔ کچھ کہو تو۔

شیلا۔ کیا کہوں!

ہریش۔ یہ رونا کیسا؟

شیلا۔ روتا کون ہے!

ہریش۔ کیا خوب! اور یہ آنسو یونہی ٹپک رہے ہیں۔

شیلا۔ یہ تو میرے دل کی پیاس بجھانیکو ذرا پریم ساگر چھلک گیا ہے۔

ہریش۔ شیلا۔ بڑے کچے دل کی ہو۔ میں کہیں سمندر پار تو نہیں جاتا۔ لاہور جا رہا ہوں۔ بابی بیچ ہے۔ اس میں شریک ہونا ہے۔ دو دن میں نہیں تو چار دن میں آجاؤنگا

شیلا۔ تو میں کب روکتی ہوں۔ میرا تم پر کیا بس۔ جاؤ۔

ہریش۔ تمہارا مجھ پر کیا بس؟ یہ کیا کہا!

شیلا۔ میرا بس ہوتا تو ——————

ہریش۔ اچھا تو میں نہیں جاتا۔

شیلا۔ (ہریش کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ کر) نہیں تمہارا جانا ضروری ہے۔ تو ضرور جاؤ۔

ہریش۔ خوشی سے کہتی ہو۔؟

شیلا۔ (آنسو پونچھ کر) ہاں خوشی سے۔ پر ہریش: میری خوشی کیسی!

ہریش۔ کیوں!

شیلا۔ نہ جانے کیا بات ہے؟ ڈھارس نہیں بندھتی۔

ہریش۔ (شیلا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر) مجھے کبھی اس صورت کو دیکھے بنا چین آسکتا ہے۔ پیچ ختم ہوا اور میں چلا۔

شیلا۔ اچھا سدھارو۔ پر ماتما کو سونپا۔

ہریش۔ پریم ساگر تو اب نہیں چھلکے گا؟

(نظر سے نظر ملا کر) تم تو نہیں ٹھکراؤ گے!

ہریش۔ تم نے رات کو کوئی سپنا تو نہیں دیکھا۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو۔

شیلا۔ پر اپنی اس پریم پجارن کو بھول نہ جانا۔

ہریش۔ نری پگلی ہو۔ (گھڑی دیکھ کر) اوہ! ریل کا وقت آگیا۔ شیلا تو اب مجھے جانے دو۔

شیلا۔ جاؤ۔ بس پہلے تو جلدی آنا۔

ہریش چلا جاتا ہے۔ شیلا کی نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ اس کے بعد وہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ٹھنڈے سانس لیتی اپنے کمرے میں جاکر ڈراؤنے اور بھیانک خواب میں محو ہو جاتی ہے۔

——(۲)——

نیا دور ہے —— پرانی رسمات ترک ہوتی جاتی ہیں —— ترقی کے جنون کی سرشوریاں —— اللہ اللہ —— تعلیم گاہوں کی دنیا بدل چکی ہے۔ لڑکے لڑکیاں دونوں سبق میں شریک۔ دونوں کی شوخیاں ایک دوسرے سے ہم بغل۔ سچ پوچھو تو سوشل زندگی اسی صورت سے بنا کرتی ہے۔

کالج کے تمام طلبہ اور طالبات ایک جگہ جمع ہیں۔ ہاکی کے میچ کا دن ہے۔ نظریں آزاد —— دل کھلے ہوئے —— چھیڑ چھاڑ جاری —— شرم و حیا کی جگہ بیباکیاں —— تبسم کے بدلے قہقہے۔ فیشن کارفرما —— سب نوخیز —— چنچل اور شوخ۔

ہریش ایک طرف خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔

ایک لڑکا۔ (ہریش کی طرف اشارہ کرکے) لال! ان بگلا بھگت کو دیکھتے ہو۔

لال۔ ان سے نہ بولو۔ میچ کا نقشہ جما رہے ہیں۔

دوسرا۔ نہیں بھائی امتحان کی تیاری کر رہے ہیں۔

تیسرا۔ امتحان کیسا؟

کمال۔ تین مہینہ پہلے ہی امتحان کی فکر؟

دوسرا۔ مگر تم سمجھے ہی نہیں۔ اجی کالج کا امتحان نہیں۔

کمال۔ پھر؟

دوسرا۔ امتحان محبت؟

لال۔ اچھا اچھا میں سمجھا۔ شیلا کا سبق یاد ہو رہا ہے۔

ہریش۔ کیا واہیات ہے؟ میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتا۔

سعداللہ۔ واقعی لال۔ تم بڑے بدتمیز ہو۔ ایسی بے ادبی سے نام لیتے ہو۔

بگلی۔ (ایک طرحدار لڑکی) مس شیلا کون ذات شریف ہیں۔ میں پوچھ سکتی ہوں۔ کیوں مسٹر ہریش!

سعداللہ۔ (کن انکھیوں سے ہریش کی طرف دیکھتے ہوئے منہ بنا کر) ان کے گاؤں کی ایک گنوارن ہے۔

کمال۔ وہ وہ جو ایک دفعہ بڑے بڑے بوٹوں کی لال ساری باندھ کر تم نے انارکلی میں مجھے دکھائی تھی۔

سعداللہ۔ ہاں ہاں تمہیں خوب یاد رہا چمپا کا چمن کی بہن معلوم ہوتی ہے۔

کمال۔ لاحول ولا قوت۔ کہاں۔ ال ٹھکی ہے ہریش! کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں!

ہریش۔ بدمعاش۔ پاجی۔ نالائق۔

بگلی۔ یہ کس کے خطاب ہیں۔

کملا۔ (ایک دوسری لڑکی) بہن۔ تم کو ایسا نہیں چاہئے۔ مجھے مسٹر ہریش کے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔

بگلی۔ مگر شاید آپ نے شیلا کو دیکھا نہیں۔

اتنے میں ایک پروفیسر رام بہاری اس حلقے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پروفیسر۔ ہلو۔ ہریش تم آ گئے۔

سعداللہ۔ آ تو گئے۔ لیکن۔

لال۔ پیٹ میں درد ہے۔

ہریش۔ (بگڑ کر) نہایت بیہودہ ہو۔

کمال۔ پروفیسر صاحب جب سے آئے ہیں۔ بیچارے کی عجیب حالت ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ ہریش۔ کیا واقعی طبیعت کچھ خراب ہے۔

سعداللہ۔ کوئی اندرونی روگ ہے۔ دیکھئے بولا بھی نہیں جاتا۔

(ہریش کھڑے ہو کر غصے میں کچھ بڑبڑانے لگتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔)

پروفیسر۔ دیکھو ہریش! ہمارے کالج کی عزت تم سے وابستہ

ہے۔ تم اس کشتی کے ناخدا ہو۔ اگر آج تم نے ہاتھ دکھانے میں سستی
تو آبرو پر پانی پھر جائے گا۔ ادھر تو پروفیسر صاحب لکچر دے رہے تھے
ادھر ہریش فیلا کے خیال میں غرق۔ اس کے منہ سے نکلا۔ ہاں
ں۔ دو چار دن میں ضرور آجاؤنگا۔
ل۔ سنا پروفیسر صاحب؟
بال۔ ڈوبنے کی تیاری ہے۔
ھلگی۔ مسٹر ہریش تو کسی اور ہی دریا میں غوطے کھا رہے ہیں۔
سعداللہ۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا۔

ہریش پھر طیش میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔

پروفیسر۔ آرڈر۔ آرڈر۔ ہریش ہریش کیا ہے؟ کیا ہمیں تمہاری
طرف سے نا اُمید ہو جانا چاہیئے۔
ہریش۔ (ہوش درست کر کے) آپ کچھ خیال نہ کیجئے۔ میں بالکل
تیار ہوں۔ ہمارے کالج کا نام اور ڈوبے (گھڑی دیکھکر) اب جلدی
کیجئے تین بج چکے ہیں۔ (پھر کسی خیال میں محو) آخر تمہیں فکر کس بات کا ہی شیلا!
پروفیسر۔ (غور سے دیکھکر) ہریش تم کس سے باتیں کرتے ہو۔
بلگی۔ تو گرجے والی سے؟
سعداللہ۔ چمپا کا چن کی بہن سے!

ہریش غصہ میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ پروفیسر نے تحکمانہ انداز میں آرڈر آرڈر پکارا۔ اور ہریش سے بولے۔ لیکن ہریش یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم برابر بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارے ساتھی تمہارا ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اور تم اپنی حالت درست نہیں کرتے۔ اگر امتحان کا فکر ہے۔ اور یہ سمجھتے ہو کہ تم روک (Detained) لئے جاؤ گے۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایسا نہیں ہوگا۔

سعداللہ۔ مگر جناب یہ تو دوسرے کالج میں داخل ہو گئے ہیں۔
پروفیسر۔ (حیرت سے) کیا کہا؟
ہریش۔ تم اپنے شہدپن سے باز نہیں آؤ گے۔ پروفیسر صاحب
آپ فیلڈ تشریف لے جائیں۔ میں ابھی کپڑے بدل کر آتا ہوں۔
لال۔ یونیفارم کون پہنائے گا!
بھگی۔ وہ تو ابھی آئی تھی۔
کمال۔ مس راج رانی ذرا آپ اپنی بہن کی ڈیوٹی ادا کریں۔
مس۔ چمپا کا چن کو بلا لائیے نا۔

یہ کہتے ہوئے سب میدان کی طرف چلے۔ اور ہریش ان کی طرف سخت پریشانی اور کڑی نظر سے دیکھتا رہا۔

—— (۳) ——

میچ شروع ہو گیا ہے۔ اپنی اپنی ٹولیوں کے دل بڑھائے جا رہے ہیں۔ ہر کھلاڑی چوکنا اور مستعد نظر آ رہا ہے۔ سوائے ہریش کے جو قدم قدم پر ٹھٹک جاتا ہے۔ مخالف پارٹی دبائی چلی آتی ہے۔ اور ہریش دلے دبتے چلے جاتے ہیں۔

یکایک ایک طرف سے آواز آئی —— "ہریش! کیا لٹیا ڈبو دوگے؟ اپنی نہیں تو اپنے دیکھنے والوں ہی کی لاج رکھو"۔ یہ آواز کچھ ایسی سریلی تھی کہ ہریش کے تن بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اپنی سٹک سنبھالی اور جھرجھری لے کر چلا۔ دو منٹ میں آدھا میدان پار۔ اور میچ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ پھر وہی آواز آئی۔ "مک اپ ہریش مک اپ۔ کیا کہنا ہے۔ تم تم ہی ہو۔ آہاہاہا! واہ! واہ! ہاں۔ ہاں۔ لئے جاؤ۔ رکو نہیں"۔

اس مرتبہ یہ طلسمی صدا فردوس گوش ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی۔ آنکھیں چاروں طرف دوڑنے لگیں۔ دیکھتا کیا ہے۔ کہ ایک ماہ پارہ حسین تیتری اپنی رنگینیوں سے فضا کو بیتاب کر رہی ہے۔ ہریش کے دل پر ایک نئی بجلی گر پڑی۔ اس کی نظروں نے تیر برسائے۔ کلیجہ پکڑ کر گرا ہی چاہتا تھا کہ سنبھلا۔ سٹک ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گیند کہیں سے کہیں پہنچی۔ اور یہ ہوش باختہ گم صم کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ —— کھیل بگڑا۔ کالج

کی تھم دبی۔ اِدھر ہر دو فیسروں کی آوازیں۔ اُدھر کھلاڑیوں کا شور۔ قریب تھا کہ مخالف پارٹی بازی لیجائے کہ پھر آواز سنائی دی۔ کہ کچھ کالج کی بھی لاج ہے۔ ہریش چونک پڑا اسٹک اُٹھائی اور چلا۔ دل بڑھانے والوں نے دل بڑھایا۔ آناً فاناً گیند آگے تھی اور ہر پیچھے۔ بیہوٹ کھلاڑی۔ اس پر کسی کی نگاہوں میں اعتبار قائم کرنے کا خیال۔ گویا پر لگ گئے۔ گول کے قریب بڑی کشمکش ہوئی۔ مگر یہ جنون زدہ کب رکتا۔ ایک ہی سٹروک میں گیند پار تھی۔ شور مچ گیا۔ ہریش کو لڑکوں نے گود میں اُٹھا لیا۔ سانس درست ہوا۔ تو کیا دیکھا کہ وہی جادوگرنی جس نے بیتی ہوئی بازی کو ہرا کر پھر ایک فقرے سے جتوا دیا تھا۔ سامنے کھڑی ہوئی مسکرا رہی ہے۔

(۴)

شانتا۔ (یہ وہی دل بڑھانے والی لڑکی تھی) ہریش! تم بڑے کامیاب کھلاڑی ہو۔

ہریش۔ دیوی یہ سب تمہاری عنایت ہے۔

شانتا۔ (نیچی نگاہ کرکے) جھوٹ۔

ہریش۔ افسوس تم اپنی توتوں کو نہیں سمجھتی۔

شانتا۔ تیوری چڑھا کر کیا مطلب؟

ہریش۔ (سر کھجاتے ہوئے) تم نے اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے؟

شانتا۔ جی نہیں۔ مجھے اپنی صورت کیوں نظر آنے لگی!

ہریش۔ اپنی آواز بھی سنی ہے؟

شانتا۔ آپ نے یہ کیونکر سمجھ لیا کہ میں بہری ہوں

ہریش۔ (ٹھنڈا سانس لیکر) مگر میری آنکھوں سے نہ تم نے اپنی صورت دیکھی نہ تم میرے کانوں سے آواز سنی۔

شانتا۔ پھر۔

ہریش۔ کاش ایسا ہوتا۔ (یہ کہہ کر ہریش للچائی ہوئی نظروں سے شانتا کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

شانتا۔ تمہاری آنکھیں بڑی چنچل ہیں۔ مجھے اس طرح نہ دیکھو۔

ہریش۔ پھر کیسے دیکھوں (ٹھنڈا سانس لیکر) تم میرے من کے مندر کی مورتی ہو۔ یہ آنکھیں تمہاری پوجا کرتی ہیں۔ (اور آگے بڑھتا ہے۔

شانتا۔ نان سنس (Nonsense) تمہارا دماغ چل گیا ہے۔

ہریش۔ مگر ——— تم نے کیونکر جانا!

شانتا۔ (ذرا تیوری بدلکر) معلوم ہے۔ تم یہ باتیں کس سے کررہے ہو۔

ہریش۔ شانتا سے!

شانتا۔ اپنی کٹ کے باہر یا اندر!

(اس نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا۔ کہ ہریش منہ دیکھنے لگا)

شانتا بولی۔ تم سماج کا دستور نہیں جانتے۔ پہلے کسی سے سبق لو۔ پھر ملنا۔ یہ کہکر شانتا اپنی ترچھی نظروں کے تیروں سے ہریش کا دل برماتی تیتری کی طرح اڑ گئی +

(۵)

ہریش کو اپنے گاؤں واپس جانا چاہئے تھا۔ چنانچہ وہ چلا لیکن زخمی کلیجہ لیکر۔ اب اس کے لئے محبت کی شرمیلی اور سادہ اداؤں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شانتا فیشن کی پتلی نے اس کی نگاہوں کو موہ لیا تھا۔ شیلا پریم کی پجارن کے بھولے بول پھیکے معلوم ہونے لگے۔

شیلا مایوس ہونے لگی۔ جب ملنا ہوتا ہریش کی طبعیت کا بدلا ہوا رنگ دیکھکر اندر ہی اندر گھلی جاتی تھی۔ پہلی سی بات ہی نہ تھی۔ ساتھ ہی ہریش کا دل بھی اب گاؤں میں نہیں لگتا تھا۔ چلتے عشرے کے بعد کالج سے چھٹیاں ملنے کے پہلے ہی لاہور چل دیا۔ اور چلتے وقت اپنی ساتھ کی کھیلی ہوئی۔ بچپن کی رفیق سے اور منگیتر سے ملا تک نہیں۔

لاہور پہنچکر ہریش کی پہلی کوشش شانتا کی جستجو تھی۔ اِن فیشن کی پریوں کا رمنا اسے معلوم تھا۔ جو ہندرہ پابندرہ ایک روز پائیسکوپ میں آنکھیں چار ہو ہی گئیں۔

شانتا۔ ہیلو مسٹر ہریش۔ آپ آ گئے!

ہریش۔ (ٹھنڈا سانس لیکر) جی آ تو گیا......... نہ کیوں آتا۔

شانتا۔ کالج تو ابھی کھلا نہیں۔

ہریش۔ کالج سے مجھے کیا کام؟

شانتا۔ تعلیم ترک کر دی؟

ہریش۔ کیسی تعلیم؟

شانتا۔ کیا بی۔ اے کا امتحان نہیں دو گے؟

ہریش۔ دونگا۔ مگر جنونِ عشق سے فرصت اگر ملی۔

شانتا۔ اچھا۔ میں سمجھی۔ کیا شیلا کو بھی ساتھ لائے ہو؟

ہریش۔ شانتا۔ مجھ کو زیادہ نہ ستاؤ۔ ایسا مذاق مجھ کو نہیں بھاتا۔

شانتا۔ کیا اس کا خیال چھوڑ دیا؟

ہریش۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

شانتا۔ سچ کہتے ہو! (مسکراتی ہے)

ہریش۔ (آنکھیں بند کر کے) آہ! یہ بجلیاں اسکی مسکراہٹ میں کہاں۔ وہ بھی پھول تھی۔ مگر۔

شانتا۔ آنکھیں کیوں بند کریں۔ کہو مگر!

ہریش۔ مگر جنگلی۔ خودرو۔ مکدر فضا کا پروردہ

شانتا۔ (متانت سے) مگر تم نے کیوں پسند کیا تھا۔

ہریش۔ جہاں روکھ نہ ہو وہاں ارنڈ ہی روکھ ہوتا ہے۔ جنگل میں رہا۔ جنگلی بوٹوں ہی کو دیکھا۔

شانتا۔ (مسکرا کر) اور شہر میں آئے تو چمن کے پھول دیکھے۔

ہریش (نیچی نگاہ کر کے) اب اس کا حال مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔

شانتا۔ بس ریجھ گئے۔

ہریش۔ جو تم سمجھو۔ (ٹھنڈا سانس لیتا ہے)

شانتا۔ تو اب اس جنگلی پھول میں تمہیں کوئی دلفریبی نظر نہیں آتی۔

ہریش۔ آخر ان باتوں سے کیا فائدہ؟

شانتا۔ خوب! ہریش میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم اس قدر ہرجائی ہو۔

ہریش۔ (کھسیانے ہو کر) کیا معنی؟

شانتا۔ کیا معنی! ایسے بھورے۔ ایک پھول کا رس چوسا اور جب اس کی بہار لوٹ لی تو دوسرے پھول پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئے۔ یہ ہوس ہے اور محبت کا دعویٰ۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ شانتا شیلا جیسی بھولی چڑیا نہیں کہ تمہارے پھندے میں پھنس کر پھڑپھڑاتی رہے۔

ہریش۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) تم مجھے دھتکارتی ہو۔ خیر دھتکار لو۔ اور جو کچھ چاہو کہو۔ لیکن شانتا میں تمہارا ہوں۔ دیکھنا تمہارے چرنوں میں میری جان جا کر رہیگی۔

شانتا۔ تم جیسا ہرجائی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔

یہ کہتی ہوئی ہریش کو بیچین چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مگر وہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔

(۶)

ہریش ایک دولتمند زمیندار کا بیٹا ہے۔ فیشن ایبل۔ اور محبت نے اسے چونکہ باتیں بنانے میں استاد کر دیا تھا اسلئے شانتا پر فتح پانے میں کامیاب ہو گیا۔ نمائشی عورتیں نمائش پر مرتی ہیں۔ دولت کی چمک سے شانتا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ شانتا معمولی ماں باپ کی بیٹی تھی۔ انہوں نے ہریش کو سونے کی چڑیا سمجھا۔ شانتا کی بدولت اِن کے دلدّر پار ہوتے تھے۔ ایسا بَر کہاں ملتا تھا۔ ادھر حسن کی کلیوں کا شوق۔ ادھر فیشن کی تکمیل کا ارمان۔ دونوں ہوا پرست۔ جذبات کی رنگینیوں میں محو۔ رفتہ رفتہ شادی کے پیام سلام ہونے لگے۔ وہاں کیا دیر تھی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔

اب ہریش کے لئے اپنے گاؤں میں کیا دھرا تھا۔ سسرال ہی گھر بن گئی۔ بی۔ اے کے امتحان تک تو اس کے ماں باپ نے کچھ نہیں کیا۔ سمجھے کہ بیٹا پڑھ رہا ہے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ امتحان ختم ہو گیا۔ اور سنا کہ پاس بھی ہو گیا تو بلاوے آنے لگے۔ اول اول ہریش ٹالتا رہا۔ کوئی نہ کوئی بہانے کر دیتا۔

لیکن جب زیادہ تقاضا ہوا تو اس کی ماں نے لکھا کہ "شیلا والے اب زیادہ صبر نہیں کر سکتے۔ یہاں سب تیاری ہو چکی۔ جلدی آو۔ سہالک کے دن نکلے چلے جاتے ہیں"۔ تو ہریش نے گھنی سادھ لی۔

مثل مشہور ہے۔ کہ عشق اور مشک چھپا نہیں رہتا۔ ہریش کی والدہ کو بھی کہیں سن گن لگ گئی۔ مگر یقین نہیں آتا تھا کہ بیٹا اپنے خاندان کے ماتھے پر ایسا اَمِٹ کلنک کا ٹیکہ لگائے گا۔ اور شیلا ایسی دیوی کو چھوڑ کر روغنی مورتی سے شادی رچا سکتا ہے۔ اس نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے ہریش کو بلایا۔ ہریش بادل ناخواستہ بھوڑ آیا۔ یہاں کا حال دیکھ کر بہت گھبرایا۔ چاروں طرف سے دے ہونے لگی۔ سارا گھر پرانی وضع کا اور یہ رنگین صحبت کا متوالا۔ پہلے تو سب کی سنتا رہا۔ لیکن جب کوئی بات بنتی نظر نہ آئی تو صاف کہدیا آپ لوگ برا کہیں یا بھلا۔ میں اپنے فعل کا مختار ہوں۔

دو یادتی۔ (ہریش کی ماں) ہریش کیا ہم نے تجھے اس لئے پالا تھا کہ برادری میں ہماری ناک کٹے۔

شیلا غریب میں کیا برائی تھی۔؟ ارے تو نے ہمیں کسی کام کا نہیں رکھا۔ اب ہم گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے برسوں کی بیماری اس توڑ دی۔

ہریش۔ اچھا اب ان باتوں سے کیا مطلب؟

ماں۔ رام رام۔ ماں باپ کا اپنی اولاد پر کوئی زور ہی نہیں۔ ہا کلجگ!

ہریش شادی بیاہ میں کچھ زور نہیں۔ جس سے اپنا سکھ دیکھا شادی

ماں۔ چاہے پاپ ہی کیوں نہ ہو۔

ہریش۔ پاپ کیسا؟

ماں۔ پرائی کنیا کو کانس میں ڈالکر چھوڑ دیا۔ اسکے ماں باپ کو کلپایا اور کہتا ہے پاپ کیسا؟

ہریش۔ پھر کیا ہوا۔ اس کی سگائی کسی اور سے کرادو۔ میں ایسی ان پڑھ گنوارن سے شادی نہیں کر سکتا۔

ماں۔ ہاں تیری تو شہر میں۔ ہنتے رہتے آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ وہ بال بکھرے ہوئے اچھلتی کودتی ڈائنیں پسند ہیں۔ یہ بچاری گھونگھٹ والی کاہے کو بھاتی۔ خیر ہریش! یاد رکھو۔ کسی کو دکھ دینے والے سکھ نہیں بھوگا کرتے۔ دیر سویر پچھتاوے اور پھر پچھتاوے +

ہریش کا باپ پرانے خیال کا آدمی تھا۔ ماں بیٹا کی بات سنتا رہا۔ اور جب بیٹے کو یہ کہتے سنا کہ "دیکھا جائیگا۔ محبت کی شادی کبھی ناخوشگوار نہیں ہوتی۔" تو جھلا کر تیہے میں کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا "ہریش! ہم نے بڑی خطا کی کہ تجھے انگریزی پڑھائی۔ اپنا ہزاروں روپیہ برباد کیا۔ پھل یہ ملا کہ آج تو ہمارے سفید بالوں پر سیاہی ڈال رہا ہے۔ خیر تو اب اپنے کئے پر بھگت۔ اس گھر میں بہو آئے گی تو شیلا"۔

ہریش۔ جو وہ نہ آئی۔

باپ۔ وہی آئے گی۔

ہریش۔ وہ میرے کام کی نہیں۔

باپ۔ وہ تمہارے کام کی نہیں تو تو ہمارے کام کا نہیں۔

ہریش۔ جادین مجھے اسی لئے بلایا تھا۔

باپ۔ جا۔ چلتا بن۔ آج سے میں سمجھوں گا کہ تو مر گیا۔ تو نے باپ کی پسند کو ٹھکرایا ہے۔ پتی کو پتی سمجھنے والی سے آنکھ پھیر کر جھوٹے موتیوں کی مالا گلے میں ڈال کر خوش ہو گا؟

ہریش۔ پھر کیا ہو گا۔

باپ۔ دیکھ لیجیو۔

ہریش۔ تم بھی دیکھ لینا۔

باپ۔ ہم بھی دیکھ لینگے۔

ہریش جوش میں روانہ ہو جاتا ہے۔ ماں پکارتی ہے مگر وہ نہیں سنتا۔

(۷)

شانتا۔ چپ چپ کیوں ہو۔ ماتا تو اچھی ہیں۔ (ہریش خاموش ہے)

رہتا ہے "شیلا سے ملے تھے؟"

(خاموش نگاہوں سے شانتا کی طرف دیکھتا ہے) کیا پرانی پریم یاد آرہی ہے (ہریش شانتا کو گھورنے لگتا ہے) اندازہ کر رہے ہو کہ کون اچھی ہے۔ اسے ساتھ لیتے آتے تو مقابلہ خوب ہو جاتا۔

ہریش۔ ایسی دل لگی مجھے پسند نہیں۔

شانتا۔ دل لگی نہیں ہا

ہریش۔ پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔

شانتا۔ یہ بھی ایک فیشن ہے۔ (اور مسکراتی ہے)

ہریش۔ فیشن نہ ہوا۔ بلائے جان ہوا۔

شانتا۔ اور کیا۔ اچھا چپ کیوں ہو؟

ہریش۔ اس وقت مجھے چپ ہی رہنے دو۔

شانتا۔ خیر چپ رہو۔ مگر بازار کب چلو گے؟

ہریش۔ دیکھا جائیگا۔

شانتا۔ دیکھا نہیں جائیگا۔ رات کو مجھے ایک جلسے میں جانا ہے۔ بہت سی چیزیں خریدنی ہیں۔

ہریش۔ کیا کہنا

شانتا۔ ایک ساڑی۔ ایک شوز۔ ایک نکلیس۔ اور چند معمولی چیزیں۔

ہریش۔ ابھی نہیں۔

شانتا۔ نہیں ابھی۔ اچھا میں خود لے آؤنگی۔ یہ کہکر ہریش کی جیب میں ہاتھ ڈالتی ہے۔

ہریش۔ اس میں کیا رکھا ہے۔

شانتا۔ گھر سے خالی ہاتھ آئے؟

ہریش۔ (ٹھنڈا سانس لیکر) کیسا گھر؟

شانتا۔ کیا معنی؟

ہریش۔ میں گھر سے نکال دیا گیا۔

شانتا۔ پھر کام کس طرح چلے گا؟

ہریش۔ ایشور مالک ہے۔

شانتا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ آج سے تم مفلس ہو کے کنگال ہو۔

ہریش۔ یہی سمجھنا چاہئے۔

شانتا۔ اس صورت میں میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا۔

ہریش۔ کیا کہا؟

شانتا۔ تم نے کیا سنا!

ہریش۔ میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں؟

شانتا۔ اس لئے کہ تم میری خواہشات کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہے

ہریش۔ کیا تمہاری میری شادی محبت کے منتروں سے نہیں دولت کے منتروں سے ہوئی تھی۔

شانتا۔ لیکن تم کیا چاہتے ہو کہ میں تمہاری بدولت اپنی فیشن ایبل زندگی تباہ کر دوں؛

ہریش۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں نے بھی تو تمہاری بدولت سب کچھ چھوڑ دیا۔ ماں باپ۔ دھن دولت۔ ہر چیز تم پر قربان کر دی

شانتا۔ یعنی اگر تم احمق بنے تو میں بھی بنوں!

ہریش۔ شانتا ــــــ مجھے یہ امید نہ تھی۔

شانتا۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ موجودہ زمانے کی لڑکیاں محبت سے نہیں خریدی جاتیں۔

ہریش۔ افسوس! میں نے دھوکا کھایا لیکن کیا میں۔ شانتا ہمیشہ مفلس ہی رہونگا۔

شانتا۔ تم نے دھوکا کھایا یا دھوکا دیا۔ اور فی الحال تو تم ایک قلاش آدمی ہو۔ میری ضروریات پوری نہیں کر سکتے

ہریش۔ تھوڑے دن صبر کرو۔

شانتا۔ اور اپنی ہجولیوں میں نکو بنوں۔ نہ سینما جاؤں نہ کسی جلسے میں شریک ہوں

ہریش۔ کیا حرج ہے۔ میری خاطر تمہیں اتنا بھی گوارا نہیں۔

شانتا۔ یہ خوب۔ سنو ہریش۔ میں نے تم سے شادی سوسائٹی میں اپنی

خود کے لئے کی ہے۔ لونڈی بن کر تمہارے چرن سیوا کو نہیں کی۔ اگر تم میری خواہش پوری کر دو گے تو۔

ہریش۔ تو تم میری بیوی رہو گی۔ (بات کاٹ کر)

شانتا۔ ہاں۔

ہریش۔ ورنہ؟

شانتا۔ ورنہ۔ ورنہ تمہارا (دروازے کی طرف اشارہ کر کے) وہ راستہ۔ میرا یہ زاویہ کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

ہریش کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔

شانتا۔ یہ آنسو بہانے فضول ہیں۔

ہریش۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) تمہارا فیصلہ اٹل ہے۔؟

شانتا۔ بالکل۔

ہریش۔ محبت نمائشی تھی!

شانتا۔ اپنے دل سے پوچھو۔ آجکل کی ہر چیز نمائشی ہے۔ اگر نمائشی نہ ہوتی تو شیلا کو چھوڑ کر میری طرف متوجہ نہ ہوتے۔ حسن و شباب ادھر بھی تھا مگر چھپا ہوا۔ اور یہاں ظاہر۔ وہ اپنی دوکان اس طرح نہیں سجا سکتی تھی۔ جس طرح میں سجا سکتی ہوں۔ اسلئے تم نے میرے مقابلے میں اس کو نہ چاہا تھا۔ میری رنگینیاں تمہیں بھا گئیں۔ گویا تم مجھ پر نہیں بلکہ میرے فیشن پر ریجھے۔ تو تم غور کر سکتے ہو کہ میں اپنا وہ فیشن ترک کر کے تمہاری آنکھوں میں حقیر نہ بن جاؤنگی۔ شیلا اور مجھ میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں ہرگز اپنا زوال نہیں چاہتی۔

(۶)

یک طرف تو اس گفتگو نے ہریش کے دل پر کاری زخم لگائے۔ وہ اپنی جلد بازی پر نادم تھا۔ دوسری طرف والدین کی ناراضگی کا خیال۔ اپنی بیکسی اور کس مپرسی۔ اور ساتھ ہی شانتا کی زبان پر جو شیلا کا نام آیا۔ تو اسکی معصوم محبت یاد آگئی۔ ایک پردہ آنکھوں سے اُٹھ گیا۔ اسکی بھولی صورت کا تصور بندھ چلا۔ دو چار ٹھنڈے سانس لئے۔ رومال سے آنکھیں پونچھیں کھڑا ہوا۔ اور شانتا پر ایک معنی خیز نظر ڈالی اور دروازے کی جانب آہستہ آہستہ بڑھا۔ گمان تھا کہ وہ ضرور روکے گی۔ لیکن وہ سماج میں تماشہ بننے والی خود پرست بیٹھی دیکھتی رہی۔

ہریش کیلئے اسکے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا کہ لاہور رہیں۔ پھر اپنے کسی دوست سے مدد لے۔ یا اپنے گھر جا کر غلطیوں کا اعتراف کرے۔ اسے اکثر دوستوں کی چکنی چپڑی باتوں پر بھروسا تھا لیکن اہل علم میں دوستی بھی ایک فیشن ہے۔ دو چار دن یار دوستی دل لگی کا سامان ہے۔ جس دروازے پر پہنچا ٹھوکر کھائی۔ رہا سہا بھرم بھی گیا۔ آخر گاؤں کی جانب راہ لی۔ کچھ پاس نہ تھا کہ ریل میں بیٹھے۔ پیدل ہی چل نکلا۔ کئی دن کے بعد رات کے بارہ بجے کرتے پڑتے گاؤں میں پہنچا تو تھکن سے چور۔ اور بھوک سے نڈھال۔ کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ مقابلہ کی سکت نہ تھی۔ دہشت زدہ ہو کر ایک گھر میں گھس گیا۔ چور چور کا غل مچا۔ بستی میں جاگ ہو گئی۔ پکڑ لیا روشنی آئی تو صاحب بہادر کوٹ پتلون دربر ہیٹ برسر ایسا چور گاؤں والوں نے کب دیکھا تھا؟ لوگ دیکھنے آنے لگے چودھری ہرنس لال کے والد ماجد بھی تشریف لائے۔ دیکھا تو صاحبزادہ بلند اقبال ہیں!

الغرض ہریش کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ ماں کی ممتا نے باپ کو ملامت کرنے سے روکا۔ گرم دودھ پلایا۔ دل ٹھہرا۔ جان میں جان آئی۔ رات گذر گئی۔ صبح تک کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ دن نکلتے ہی گھر گھر چرچا ہونے لگا۔ ہریش کو بے حد ندامت تھی۔ اور اب منتظر تھا کہ موقعہ میں کہیں شیلا مل جائے تو اس سے معافی مانگے۔

جس دن شیلا نے سنا تھا کہ ہریش نے دغا کی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر بیمار ہو گئی تھی۔ اس کے لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

ہریش نے جو سنا تو بیتاب ہو گیا۔ چپکے سے نکل شیلا کے گھر پہنچا۔ ایک گاؤں کا معاملہ۔ پھر دونوں گھروں میں یگانگت۔ شیلا ساتھ کی کھیلی ہوئی۔ دندناتا گھر میں گھسا چلا گیا۔ شیلا آنکھیں بند کئے کھٹیا پر پڑی تھی۔ شیلا کی ماں نے ہریش کو دیکھتے ہی آنسو پونچھ کر کہا۔ ارے ہریش آگیا۔ کب آیا؟۔ دیکھ تو شیلا کا کیا حال ہے۔ بھیا تو نے اچھا نہیں کیا۔

شیلا کے کان میں ہریش کا نام پڑنا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرائی اور بولی

"پیچ کھیل آئے۔ ہارے یا جیتے"؟

صریش۔ (نیچی نگاہ کرکے) قسمت میں ہار ہی۔ ہارا۔ اور بری طرح ہارا۔ مگر تم کیسی ہو؟

شیلا۔ (مسکراتے ہوئے) تو میں جیت گئی۔

صریش۔ ہاں۔

شیلا۔ پھر تمہیں اپنے ہارنے اور میرے جیتنے کا رنج ہے؟

صریش۔ نہیں۔

شیلا۔ اچھا۔ ہنسو۔ میں بھی ہنستی ہوں۔

صریش۔ اپنے آنسوؤں کو ضبط کرکے ہنسی کی سی صورت بناتا ہے۔

شیلا۔ سنو صریش۔ میرا دھرم تمہیں ملامت کرتا نہیں۔ میں تمکو اپنے سر کا تاج بنا چکی ہوں۔ میرا دکھ سکھ تمہارے ساتھ ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟

صریش اب جوشِ ندامت سے شیلا کے پاؤں کی جانب جھکتا ہے۔ شیلا ڈھکر فوراً ہی صریش کے قدم چھوتی ہے۔

شیلا۔ یہ تمہارا کام نہیں میرا کام ہے۔

اس کے بعد دونوں جانب شادی کی تیاری ہونے لگی ہے۔ چند روز بعد شیلا دلہن بنی اور صریش دولہا۔ بیاہ ہوا۔ اور دونوں کو سچی خوشی نصیب ہوئی۔

(طبعزاد)

جمالیاتِ صبر

(از جناب سید بدرالدین احمد صبر رضوی مخدوم آبادی سریری)

میں کملایا ہوا اک پھول ہوں صحنِ گلستاں میں
یہ دستِ باغباں میں ہوں نہ ہوں گلچیں کے داماں میں

محبت کیا یہی ہے کیا اسی کو عشق کہتے ہیں
لگا دیتا ہے نشتر کوئی رہ رہ کر رگِ جاں میں

بھڑک اٹھی وفورِ گریۂ غم سے لگی دل کی
قیامت ہے مرا گھر جل رہا ہے جوشِ طوفاں میں

صدائے نالۂ زنجیر سے اک حشر برپا ہے
وہ قیدی ہوں کہ میرا ہر طرف ماتم ہے زنداں میں

اس آئینے میں خود آئینہ گر محوِ تماشہ ہے
نہیں تو اور کیا رکھا ہوا ہے حسنِ انساں میں

زمانے سے الگ کتنی ہے حسن و عشق کی دنیا
کہ لیلیٰ پردۂ محمل میں ہے مجنوں بیاباں میں

جو نکلا آنکھ سے آنسو دلِ مضطر تڑپ اٹھا
عجب کیا بجلیاں گرتی ہیں اکثر فصلِ باراں میں

ہزاروں کا سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے
ملے کیا کیا نہ عبرت کے سبق گورِ غریباں میں

تپش بھی درد بھی اندوہ بھی حسرت بھی حرماں بھی
الٰہی اتنے ساماں اک دلِ بے ساز و ساماں میں

کہاں ناخواندہ مہماں بنکے تم اے صبر آئے ہو
تمہیں پہچانتا ہے کون اس بزمِ سخنداں میں

ــہ ۵ ... کے مشاعرہ کی طرح ... نظم

سفید پانی کی بیمار عورتیں

جو عورتیں سفید پانی کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ یعنی وقت بے وقت زردی مائل یا سفید رطوبت اُن کے خفیہ جسم سے نکلتی رہتی ہے، وہ اپنی ہری بھری جوانی کو چند روز میں خاک کر دیتی ہیں۔ کیونکہ سفید پانی کی بیماری سے غفلت برتنا اور اس کا علاج نہ کرنا بیحد خطرناک ہوتا ہے۔ یہی سفید رطوبت دراصل جوانی اور شباب کا جوہر ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ بدن سے خارج ہو جاتا ہے اور عورت کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس بیماری کے شروع میں عورت کے تمام بدن میں بیکلی اور پنڈلیوں کمر ناف کے نیچے میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے۔ پھر سر چکرانے لگتا ہے۔ کام کی زیادتی یا چلنے پھرنے سے بے حد تکان اور کمزوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ اُس کے بعد ماہواری ایام میں کچھ ایسی گڑبڑی پڑتی ہے۔ جو بعض اوقات عورت کی صحت کا بالکل ہی خاتمہ کر ڈالتی ہے۔ پس ایسی حالت میں سفید بیماری (یعنی سیلان الرحم) سے عورت کو غفلت ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

سفید پانی کو روکنے کی ترکیب

اگر کوئی عورت سیلان الرحم کی مریض اور اُسکے خفیہ جسم سے سفید پانی یا رطوبت نکلتی رہتی ہے تو اُس کے روکنے اور اس کا علاج کرنے کی سب سے آسان اور سب سے سستی ترکیب یہ ہے کہ وہ ایک شیشی دوا **"روک"** استعمال کرلے۔ یہ دوا تقریباً بارہ سال سے تجربہ میں آرہی ہے اور سیلان الرحم کی بیماری کو تیسرے دن ختم کر دیتی ہے۔ ہزارہا عورتوں نے اس دوا کے ذریعہ اس بیماری سے نجات حاصل کی ہے۔ دوا شروع کرنے کے تیسرے دن ہی مریضہ بول اُٹھتی ہے کہ دوا "روک" نے کتنی جلدی اُسے صحت کا یقین دلا دیا۔ کیونکہ استعمال شروع کرنے کے تیسرے روز سفید رطوبت کا خارج ہونا بند ہو جاتا ہے اور پھر پوری شیشی ختم ہونے تک مرض کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ پس جن عورتوں کو سفید پانی کی بیماری ہو اُنہیں چاہئے کہ اپنی جوانی کی حفاظت کریں اور **لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ الیبس۔ آر۔ بی ۲۴۳ دہلی** کے پتہ پر خط لکھکر دوا "روک" کی ایک شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگا کر استعمال کرلیں۔ سفید رطوبت سے نجات ملجائیگی۔ ایک شیشی دوا روک کی قیمت صرف تین روپے ہے اور سات آنے محصول پارسل لگتا ہے۔

موسمِ بہار کا ساقی

از
(علامہ سید محمد اسمعیل رسا ہمدانی گیاوی ٹرپل ایم۔ اے۔ ایڈوکیٹ)

بن کے ساقی چمنستاں میں بہار آئی ہے
زلف کی طرح سرِ باغ گھٹا چھائی ہے

آنکھ ساقی کی مگر نرگسِ شہلائی ہے
جنبشِ سرو نہیں نشہ کی انگڑائی ہے

جتنے اشجار ہیں گلشن میں وہ مستانے ہیں
گلِ خنداں نہیں مٹتے ہوئے پیمانے ہیں

شاخِ گل کب ہے کلائی ہے مرے ساقی کی
لال پھول انہیں نہیں سرخ گلابی ہے بھری

سبز سی چادر چمنستاں میں ہے سبزے کی بچھی
غنچے پہنے ہیں پوشاک ہے جن کی اودی

نشہ سے لال ہیں ہنستے ہوئے چہرے گل کے
نالہ کہتا ہے کہ بیتاب ہیں دلِ بلبل کے

طائرِ باغ کا مستی میں چہکنا دیکھو
جھومنا شاخوں کا پھولوں کا مہکنا دیکھو

رند کی طرح گھٹاؤں کا جھومنا دیکھو
ہلکی بارش سے وہ سبزے کا لہکنا دیکھو

یوں چٹکتی ہے کلی جب کہ ہوا آتی ہے
مرے ساقی مرے ساقی کی صدا آتی ہے

ساقیا پھول پلا پھول کھلے ہیں ہر سو
نکہتِ عطرِ بہشتی کی ہے پھیلی خوشبو

رقص میں کھل گئے سنبل کے ہوا سے گیسو
چشمِ نرگس ہے کھلی تا کہ جگائے جادو

لالہ و گل نہیں ساغر ہیں مئے عشرت کے
باغ میخانہ ہے قربان تری قدرت کے

آنکھ نرگس کی مئے ناب کا پیمانہ ہے
پھول جو ہے وہ شبیہِ رخِ جانانہ ہے

جنبشِ بادِ صبا لغزشِ مستانہ ہے
نغمہ بلبل کا نہیں نعرۂ رندانہ ہے

بوئے گل ہے کہ مئے ہوش ربا ہے ساقی
ہوش آئے تو بتا دوں کہ یہ کیا ہے ساقی

چمنِ دہر کو میخانہ بنایا کس نے؟
گلِ خوش رنگ کو پیمانہ بنایا کس نے؟

جنبشِ شاخ کو مستانہ بنایا کس نے؟
بلبلِ زار کو دیوانہ بنایا کس نے؟

کس نے خوشبو سے گلستاں کو بسا رکھا ہے
نکہتِ گل کی صراحی کو لنڈھا رکھا ہے

سرخ یہ گل کی قبا، اور چمنستاں کی فضا
مست چڑیوں کی صدا، اور چمنستاں کی فضا

ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا، اور چمنستاں کی فضا
اودی اودی یہ گھٹا، اور چمنستاں کی فضا

اب پتہ مجکو چلا کون رسا ساقی ہے
میکدہ ہے یہ جہاں اور خدا ساقی ہے

حضرت عطا بہاری

از

(جناب از رخشاں ابدالی۔ اسلام پور ضلع پٹنہ)

آج کی صحبت میں قصبہ بہار شریف کے ایک کہنہ مشق، پرگو اور قادر الکلام شاعر کا تعارف، نظر ہے۔ ان سطور کو تعارف؟ کہنا شاید صحیح نہ ہو، کہ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ وہ مغتنم ہستی ہم میں موجود تھی اور شاید آج بھی بہار شریف کی مجالس سخن کے سامعین کے کانوں میں اس کے رشحات سخن گونجتے ہوں، آج سے آٹھ برس پہلے تک بہار کے مشاعروں میں اس کی غزل سرائی غلغلہ تحسین کا سبب بنتی تھی۔

میرا اشارہ ان سطور سے بہار شریف کے مشہور شاعر حضرت عطا بہاری کی طرف ہے۔ آپ کا پورا نام شاہ عطا کریم، اور تاریخی نام مظاہر الحق اور عطا تخلص تھا بہار شریف کا مشہور محلہ مرار پور، آپکا مولد و مسکن تھا آپکے والد کا نام سید نیاز حسین تھا، جو ولیۂ با کمال حضرت بابا ابدال کی اولاد میں تھے، جنکا مزار بہار سے تقریباً ایک میل پچھم دیپی سرائے میں واقع ہے۔ آپ کا خاندان اپنی سیادت و شرافت اور دولت و ثروت اور علم و فضل میں شہر میں ممتاز تھا آج بھی مرار پور کے کھنڈر اپنی شوکت رفتہ کے غمّاز اور عظمت پیشیں کے نوحہ خواں ہیں، لیکن حضرت عطا کے ہوش سنبھالتے ثروت، امارت داستان پارینہ بن چکی تھی۔

آپ کی ولادت کی تاریخ ۱۳ صفر ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۶ء) ہے اور ۹ صفر ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۴ جون ۱۹۳۲ء کو جبکہ رہوار عمر چھیاسٹھ منزلیں طے کر چکا تھا، رگرای عالم جاودانی ہوئے اور محلہ سوہ نمحلات شہر بہار میں آخری آرام گاہ بنی۔

ابتدائی ضروری تعلیم گھر پر ہوئی، پھر بارہ تیرہ برس عربی و فارسی کی تعلیم ایک جید عالم مولوی یوسف جان بہاری سے ہوئی اور غالباً مولانا وحید الحق علیہ الرحمہ بانی مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے آگے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا، فارسی میں بہرۂ وافر تھا اور عربی میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی، تکمیل کی نوبت نہ آئی، تصوّف کا ذوق بھی تھا، سلسلۂ زاہدیہ میں بیعت کی تھی، چنانچہ ایک مقطع میں لکھتے ہیں ؎

عطاؔ! یہ سب ہے فیضِ بدرِ عالم کا ... وگرنہ ہم تو کیا ہیں اور کیا تھے

آپ طبعاً خلیق اور ملنسار تھے، بجنۃ وضع، سادہ معاشرت کے خوگر اور سادگی پسند تکلف سے گریزاں اور منکسر المزاج تھے،

شعر و سخن کا ذوق تھا تو بچپن ہی سے، لیکن ۱۳۰۹ھ سے مستقل طور پر شغل سخن فرمانے لگے اوائل میں چند ابتدائی فارسی اور اردو کی غزلیں اپنے استاد مولوی یوسف جان صاحب کو دکھائیں پھر ۱۳۱۲ھ میں منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور ذریعۂ خط و کتابت ۱۳۲۰ھ یعنی آٹھ برس تک اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ فارسی کلام حضرت شاہ امین احمد علیہ الرحمہ ثبات و امین سجادہ نشیں بہار اور جناب شاہ محمد ولی صاحب رائے پوری کو دکھایا اور آخر میں حضرت سید شاہ فرزند علی صوفی منیری علیہ الرحمہ تلمیذ غالب سے بھی کچھ اصلاحیں لیں آپ کی نسبت تلمذ بہ دو واسطہ حضرت مومن تک منتہی ہوتی ہے یعنی عطا، تسلیم، نسیم، مومن۔

مشق سخن آخر عمر تک جاری رہی، ایک ضخیم اردو کلیات جو تمام اصناف سخن، غزلیات، قصائد، قطعات و رباعیات، مسدس و مخمس پر حاوی ہے، آپ کی یادگار ہے۔ ایک دیوان اردو جس میں تقریباً تمام ردیفوں کا التزام ہے، اس کے علاوہ ہے، حضرت خواجہ عطار کے پند نامہ کا اردو منظوم ترجمہ "خضر طریق" کے نام سے کیا، آخر عمر میں اردو نثر میں جزو ڈیڑھ جزو کا قدیم طرز کا ایک افسانہ "دل" بھی تصنیف

کیا تھا، موخرالذکر کے سوا کہ غالباً وہ محفوظ نہیں ہے، کلیات دو دیوان محفوظ ہیں، "درخضر طریق" طبع ہو چکی ہے۔ فارسی میں ایک آدھ مثنوی بھی لکھی تھی، لیکن ابتدائی کلام کا لحاظ کرکے خود ہی ضائع کر دیا فارسی کا دیوان مکمل تو نہیں، البتہ معتد بہ غزلیں اور بعض دوسرے اصناف کلام ہیں۔

پختگی اور برگوئی آپ کا وصف ہے، اور کہنہ مشقی اور قادر الکلامی آپ کے کلام میں نمایاں ہے، ایک ایک زمین میں دوغزلہ، سہ غزلہ، اور چہار غزلہ تک موجود ہے سنگلاخ زمینوں "خنجر نہ خنجر" وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اساتذہ کی پامال زمینوں میں بھی فکر سخن کی گئی ہے، مختلف ردیفوں کے دو چار شعر ضیافت طبع کے لئے حاضر ہیں ؎

کیونکر سمجھ میں آئے کسی کی بیانِ شمع — سوزِ الم سے لال ہو مطلق زبانِ شمع
نیرنگی زمانہ سے ہیں خونہائے دل — خندانِ رنگ گُل کبھی گریاں بسانِ شمع
ظاہر خموشیوں سے ہوئیں دل کی شورشیں — گویا مری زبان بنی ہے زبانِ شمع
لب پہ باہر جو ہوا، ہو گیا ٹکڑے ٹکڑے — کچے دھاگے کے برابر بھی نہیں تارِ نفس
برسات میں گم ہوا خورشید کا جلوہ — گویا کہ مرا خواب فراموش ہوئی دھوپ
کوئی میرے دل سے پوچھے لذتِ صبح وصال — عمر بھر پھرتی رہی ہے آنکھوں میں تصویرِ صبح
غمزہ سے حیا شوخ حیا سے ہے ادا شوخ — سر تا بقدم ہے وہ بتِ ماہ لقا شوخ
ہر بات نرالی ہے تری اور بتِ پُرفن — اندازِ تبسم ہے بلا طرزِ ادا شوخ
عاشق کی سمت آنکھ جا کے نہ اُٹھ سکی — نیچی نظر سے دیکھ لیا سر سے پاؤں تک

حضرت عطا لکھنؤ اسکول کے متبع ہیں، اور یہ ہونا بھی چاہئے اس لئے ہی نہیں کہ وہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں، بلکہ اس لئے بھی کہ ہمعصر مقامی شعراء کی اکثریت نے لکھنؤ سے کسب فیض کیا تھا اسلئے بہار کا ماحول یہی تھا، یہی وجہ ہے کہ ہم کلام عطا میں لکھنوی طرز کی جھلک دیکھتے ہیں مثلاً ؎

مانا کہ فراموش ہوئے عہدِ وفا سب — بھولے سے مری یاد بھی جانی نہیں آتی
ٹھیوں بگڑنے بوسہ پھیر لو جب یہ کہا — بولے یہ اپنی وضع نہیں جو دیا، دیا

لیکن یہ ابتدائی کلام کی بات ہے، آخری دور میں یہ "چیزیں" کم ہو گئی ہیں۔ اسی طرح رعایت لفظی کی مثالیں بھی ملتی ہیں ؎

افشاں بھری جبیں جو یاد آئی رات بھر — گن گن کے تارے صبح کا تڑکا بنا دیا
نکلے ہیں شعر صبح میں دندانِ یار کے — گوندھے ہیں ہم نے ہار دُرِ شاہوار کے

اور لکھنوی محاورات و تشبیہات بھی استعمال کئے ہیں ؎

جب اُس نے کہا اے میرے عطا! اُس وقت مرا انفاس کھٹکا

کس واسطے طرزِ سخن بدلا، کیوں حیلہ دفن کو چھوڑ دیا

اور یہ ؎ جب مرے قاتل نے خون کو چوس لیا، اشک آنکھوں سے ٹپکا نیل کی طرح

یاقوت بدخشاں میں نہ رہا، موتی نے سدن کو چھوڑ دیا

یا ؎ لاکھا جمائے سُرخ لبوں پر غضب کیا + گل برگ تر کو آپ نے سوسن بنا دیا

مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

کبھی ہم محو روئے دلربا تھے — کبھی دل بستۂ زلفِ دوتا تھے
کبھی مانند نقشِ بوریا تھے — کبھی ہم سایۂ بالِ ہما تھے
کبھی تھے شوخیِ نازِ حسیناں — کبھی آنکھوں میں ہم شرم و حیا تھے
کبھی بلبل کی صورت سینہ صد چاک — کبھی گل کی طرح رنگیں نوا تھے
کبھی شعلہ، کبھی تھے برقِ خاطف — کبھی ہم ابرِ رحمت تھے، صبا تھے
کبھی تھے آیۂ رحمت کی تفسیر — کبھی شمعِ حریمِ کبریا تھے
کبھی تھے غازۂ روئے حسیناں — کبھی دستِ عروساں کی حنا تھے
عطا! چشمِ بصیرت سے جو دیکھا — سراپا مظہرِ ذاتِ خدا تھے

قطعات کا نمونہ دیکھئے، فرماتے ہیں ؎

عیسیٰ نے قم سے سیکڑوں مُردے جِلا دیئے — موسیٰ نے ہاتھ کو یدِ بیضا بنا دیا
کیا پوچھتے ہو معجزۂ شاہِ دوسرا — جس جس پہ آنکھ ڈالی خدا سے ملا دیا

سودا کا مشہور قطعہ ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسّامِ ازل نے — جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا — غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

یہ تو تھا اجمال، اب اس کی تفصیل جناب عطا سے سُنئے فرماتے ہیں ؎

جب دیدۂ حق بیں سے اُٹھا پردۂ غفلت   قسامِ ازل، حاکم و عادل نظر آیا
قُرب در دلدار دیا جبریلِ ملک کو   جن عالمِ پرواز کا عامل نظر آیا
تمکین کا رُتبہ شجرِ طور کو بخشا   جو جلوۂ رخسار کا منزل نظر آیا
انسان کے حصّہ میں ہوئی بادہ پرستی   یہ خاک کا پُتلا اسی قابل نظر آیا

رباعیات کا عمومی انداز دیکھنے کیلئے دو رباعیاں درج ہیں ؎

گذری پہلے تو عمر سوتے سوتے   اب جان پر آبنی ہے روتے روتے
عصیاں کا قبائے تن سے دھبّا نہ مٹا   شل ہوگئے دونوں ہاتھ دھوتے دھوتے

دل پہلے گنوا کے اب وہ کیوں روتے ہیں   بیفائدہ غم سے جان کیوں کھوتے ہیں
اس گریۂ بے محل کا حاصل کیا ہے   شبنم سے کہیں کھیت ہرے ہوتے ہیں

دو چار مطلع بھی سُن لیجئے ؎

برقِ نظر نے طور کا جلوہ دکھا دیا   صحرائے دل کو وادیِ ایمن بنا دیا
چڑھ کے سولی پہ ہوا یار کا دیدار مجھے   آج حاصل ہوئی معراج سرِ دار مجھے
قربِ جامِ دھر اک خُمِ شراب بھی ہے   جو ماہتاب ہے حاضر تو آفتاب بھی ہے
ہے فروزاں جو کنول لالۂ صحرائی کا   عرس جنگل میں شاید ترے سودائی کا
لا کر گرا دیا ہمیں قدموں پہ یار کے   قربان جائیں لغزشِ بے اختیار کے
بیکسی بھی شبِ غم آنکھیں جھکا جاتی ہے   موت کے صدقے، خبر کو مری آجاتی ہے

وہ کیسا ہے مہرِ عالم آرا کہ خود تو لاکھوں حجاب میں ہے
اسی سے روشن ہے ماہِ کامل اسی کی ضو آفتاب میں ہے
یہ زورِ فصلِ بہار کا ہے چمن بھی جوشِ شباب میں ہے
بلا کی دلکش نوائے بلبل، چٹک غضب کی گلاب میں ہے

ایک شعر بھی سہی ؎

نگاہ کیا غرضِ راز کرتی کہ اس کو پاتی نہیں ہے تنہا
سفرِ حضر میں مثالِ سایہ ہمیشہ شوخی رکاب میں ہے

مجبوریِ عشق کا عالم دیکھئے ؎

ہست کو نابست جو مرضی کیسکو دخل کیا   دل تری مٹھی میں ہے اور تیری تمنا دل میں ہے

دل بے صبر کو یوں بہلایا جا رہا ہے ؎

بن آئیگا کیا کام اے حضرتِ دل!   اگر آپ دن رات تڑپا کریں گے

شاعر معلّمِ اخلاق کے روپ میں آتا ہے ؎

آدمیت تو یہی ہے کہ پئے خاطرِ غیر   صنعتِ لاؤ گل برگِ حنا ہو جانا

اغیار طعنہ زن ہیں طنز سے انسان گھبرا اٹھتا ہے، لیکن شاعر اپنے مسلک و وضع میں اتنا مستقل ہے کہ اسے پرواہ بھی نہیں ہوتی ؎

کریں طعنۂ غیر سے ترکِ مسلک؟   نہ ایسا کیا ہے نہ ایسا کریں گے!

عاشقِ محبوب کے جلوہ بے حجاب کا متمنّی ہے خوش طالعی سے دیدار میسّر بھی ہوا تو کثرتِ شوق خود پردہ بن گیا، اور وہی حرمان نصیبی جو پہلے تھی اب بھی ہے ؎

وہ آئے سامنے بے پردہ لیکن وائے محرومی!   کھڑی کر دی فروغِ شوق نے دیوار حیرت کی

اسی غزل کے دو شعر یہ بھی ہیں ؎

ادھر سر میں خیالِ گیسوئے پُر پیچ و خم آیا   ادھر آنکھوں میں صورت پھر گئی شامِ مصیبت کی
کیا ہے سحر کیسا نرگسِ جادو نے اے ظالم!   نرا شیدا سراپا بن گیا تصویر حیرت کی

ردیف ہے "کیا مشکل ہے" فرماتے ہیں ؎

ساری دُنیا نے ہے گھیر ڈالا   ایک انسان ہے، کیا مشکل ہے
برقِ رخسار کی ارمانی آنکھ   پردہ دربان ہے کیا مشکل ہے
عیش و غم، کس سے ملوں دونوں سے   جان پہچان ہے کیا مشکل ہے
زیست برہم ہے، اجل آزردہ   عقل حیران ہے کیا مشکل ہے
مجھکو آئینہ بنایا جس نے   آپ حیران ہے کیا مشکل ہے

ایک دوسری غزل کے چند شعر ہیں ؎

نہ دھو اپنے دامن سے دھبّے لہو کے   یہ قاتل ترا نام اونچا کریں گے
وہ ایفائے وعدہ کا وعدہ تو کرلیں   اسی کو ہم اپنا سہارا کریں گے
کرشمہ ستم پیشگی کا دکھا کے   حسینانِ صبر آزما کیا کریں گے
مسافر ہیں اپنا پتہ کیا بتائیں   جہاں شام ہوگی ٹھکانا کریں گے

ہو کے بے پردہ خریدار کی پروا نہ رہی   حُسن پردے ہی میں مشتاقِ تماشائی تھا

متفرق اشعار کہاں تک، میں سمجھتا ہوں کہ اتنے اشعار شاعر کے عمومی رنگِ سخن کو پرکھنے کے لئے کافی ہوں گے۔ چند غزلیں، نمونۂ کلام کے لئے حاضر ہیں ؎

سراپا پرتوِ نیرنگیٔ دنیا ہوں میں   کبھی خالی، کبھی لبریزِ تمنا ہوں میں
اختیاری نہیں ہر ایک قدم پر لغزش   دل گرفتارِ خمِ زلفِ چلیپا ہوں میں
خندۂ گل ہے نہ کچھ نغمۂ بلبل کی غرض   نخلبندِ چمنِ حسن کا جویا ہوں میں
برق نے اس سے کچھ اندازِ طپیدن سیکھا   کبھی بیتابیٔ فرقت میں تڑپتا ہوں میں
کیوں مجھے کرتی ہے آوارہ وطن وحشتِ دل   نکہتِ گل ہوں نہ بلبل کا ترانا ہوں میں
ہو اسی دُھن سے عطا مہرِ خموشی لب پر   کہیں پردہ نہ پڑے جلوہ اگر جا ہوں میں

آپ کی ایک پرکیف غزل راجگیر کے "صحیفہ فطرت" میں اشاعت پذیر ہوئی تھی، جسے پڑھکر صوبہ کے ایک مشہور ادیب نے ادارہ کو لکھا تھا کہ اسے پڑھکر اُن پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ جناب عطا کے کلام و حالات کے طالب ہیں، سنئے کتنی پُرکیف غزل ہے ؎

کہاں کی غفلت یہ چھا گئی ہے کہ دھیان مطلق نہیں کہیں کا
یہ عالم اپنے جمود کا ہے نہ فکرِ دنیا نہ غم ہے دیں کا
نہیں ہے کم مارِ آستیں سے ہر ایک تارا پنی آستیں کا
فریب پردے ہیں دوستی کے معاملہ ہے یہ ہمنشیں کا
بھرا ہے جنون سے سر میں سودا کسی کے گیسوئے عنبریں کا
جو دیکھے اُلجھن میں مبتلا ہو، ہوا یہ عالم دلِ حزیں کا
خیال سر میں نہ دل میں سودا، نہ آہ لب پر نہ چشم پُرنم
مکان خالی پڑے ہوئے ہیں پتہ نہیں ہے کہیں مکیں کا
طلسمِ صحرا، شکست توڑو، خیالِ حزن و سرور چھوڑو
مٹاؤ دل سے دورنگیوں کو نہیں ہے وقت اب خیالِ چنیں کا
بہاریں کیا کیا نظر سے گزریں، خزاں کے موسم بھی کتنے دیکھے
مگر کبھی کاتبِ ازل کو نہ دیکھا بدلے رقم جبیں کا
سمجھ میں آتا نہیں ہے کچھ بھی، روش یہ کیسی ہے بات کیا ہے
بُلا کے در پر شکستہ [illegible]، پھر دکھانا آنکھوں پہ [illegible] کا
کہاں سے آنکھیں [illegible] کہاں سے دوڑے لہو رگوں میں
جفا میں اتنی [illegible] کہ آخر کلیجہ پھٹ رہے مجھ حزیں کا

دکھائی یاروں نے جانفشانی، نکالے کانٹے جگہ جگہ کے
ہوا بس اتنا ہی نفع اس سے مٹا ہے کھٹکا کہیں کہیں کا
کسی کے نقشِ قدم کا لے دل ہوا ہے حاصل شرف ہر اک کو
زمیں نے چوما فلک کا دامن، فلک نے بوسہ لیا زمیں کا
وفا سے لذت، جفا سے کلفت عطا! ہے عشق و ہوس کی سرحد
مگر دو عالم سے بے نیازی اثر ہے اُلفت کی سرزمیں کا

نہ لغزش ہو نہ بو چھوڑے یہ پھر بیہوش ہو جانا   تکلف فی ہے دو اک جام میں بیہوش ہو جانا
کہیں بیانگِ نالے ہجومِ آرزو! دیکھو   میانِ انجمن قفلِ لب خاموش ہو جانا
مآل اندیش ہونے پر مدامیش عشرت ہے   بُرا ہے آدمی کے حق میں غفلت کوش ہو جانا
طلب کی نہیں پرواہ مگر کچھ تجھ سے کہنا ہے   ذرا میری طرف اے ساقیٔ گلپوش ہو جانا
بہت کچھ یہ چلکے دردِ خمار اب وقت آتا ہے   عطا سرمستِ کیفِ بادۂ سرجوش ہو جانا

رُخ سے پردہ ہٹا دیا کس نے   سینہ ایمن بنا دیا کس نے
جال پھیلا کے زلفِ مشکیں کا   پھر بلا میں پھنسا دیا کس نے
مرنے والے پر آفریں کرکے   مرتے مرتے جلا دیا کس نے
چھو کے زلفوں کو اے نسیمِ سحر!   سویا فتنہ جگا دیا کس نے
اے عطا! کچھ کہا نہیں جاتا   کیا بتاؤں رُلا دیا کس نے

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جناب عطا پر لکھنؤ اسکول کا اثر غالب ہے، لیکن نمونہ کلام میں لکھنؤ کے خارجی مضامین سے زیادہ داخلی مضامین کے اشعار درج ہوئے ہیں، جو شاید قارئین کے لئے اُلجھن کا باعث ہو اس لئے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوا کہ انتخابِ کلام میں شاعر کے انفرادی رنگِ سخن سے زیادہ انتخاب کنندہ کا ذاتی نقطۂ نگاہ کارفرما ہوتا ہے۔

مضمون کے اختتام پر آپ کے تلامذہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ باضابطہ طور پر آپ سے اصلاح لینے والوں کی کوئی "فوج" نہ تھی، البتہ جناب [illegible] ارمان [illegible] عزیز شاگرد کی حیثیت سے متعارف ہی ہیں [illegible] اور لوگوں نے بھی اصلاحیں لی ہیں۔

پروازِ شوق

جناب ادیب مالیگانوی

بیکسی میں یوں تڑپنے کا مزا پاتا ہوں میں / آگے پیچھے دیکھ کر آنسو بہا لیتا ہوں میں
اُنکو در پردہ شریکِ غم بنا لیتا ہوں میں / بے تکلف ہر غمِ تازہ اٹھا لیتا ہوں میں
دل جہاں مجبورِ سجدہ ہو وہ سنگِ در نہیں / یوں تو اک اک آستاں پر سر جھکا لیتا ہوں میں
اب اسی سے کیجیے اندازۂ طوفانِ غم / ناخدا کو چھوڑ کر نامِ خدا لیتا ہوں میں
شیوۂ زنداں کہاں اک مجرمِ سرکش کہاں / یعنی میعادِ اسیری خود بڑھا لیتا ہوں میں
عشق جب دیتا ہے دل کو فرصتِ پروازِ شوق / وسعتِ عالم کو پہلے آزما لیتا ہوں میں
دل مچلتا ہے اگر بربادیِ امید سے / سو طرح کی بات کہہ سن کر منا لیتا ہوں میں
عشق کی یہ مصلحت اندیشیاں یہ احتیاط / جب نظر آتے ہیں وہ نظریں چرا لیتا ہوں میں

جان کر نذرِ محبت داغِ حسرت کو ادیب
کس خوشی سے دامنِ دل میں چھپا لیتا ہوں میں

معنفہ آر-ال-اسٹیونسن

نیرنگ خیال

مترجمہ:- جناب اختر قادری-بلیاروی-ایم-اے-گولڈمڈلسٹ

یہ فسانہ انیسویں صدی عیسوی کے مشہور انگریز شاعر وادیب-آر-ال-اسٹیونسن کے شاہکار افسانے - ول او دی مل Will O' The Mill کا آزاد ترجمہ ہے۔ اسٹیونسن آزاد منش اور تفریح طلب انسان تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت میں گذارا۔ آخر عمر میں وہ جزیرہ سیموا Samoa میں مقیم ہوا۔ وہان کے باشندون نے اس کی بڑی قدر کی اور اس کی دلچسپ کہانیون سے محظوظ ہوکر اسے قصہ گو کا لقب دیا۔ وہ جرات عمل اور جدوجہد کا حامی تھا۔ مندرجہ ذیل افسانہ اس نے اس تجربے کے لئے لکھا تھا کہ مخالف رائے کی حالت میں کہان تک لکھا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ اسٹیونسن نے اپنا یہ فرض نہایت ہی خوبی سے ادا کیا ہے۔ اور نقادون نے اسے شاہکار کی حیثیت دی ہے۔ (ا-ق)

حیرت

ولیم جس مل میں رہتا تھا۔ وہ ایک گھنے جنگل اور فلک رس پہاڑون کے بیچ کی وادی میں واقع تھا؛ آس پاس کوئی دوسری بستی نہ تھی - ہان! پہاڑ پر چڑھنے سے ایک قصبہ کی آبادی کچھ دھندلی سی دکھائی دیتی تھی؛ جہان سے اکثر موافق ہوا اور پرسکون فضا میں گرجا کے گھنٹون کی دھیمی دھیمی آواز وادی میں سنائی دیتی تھی -!

یہ وادی کچھ دور آگے جاکر ایک وسیع میدان میں ملگئی تھی، وادی سے ہوکر ایک پہاڑی ندی میدان میں نکلی تھی۔ کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے سے ندی کا دور تک گھومتے ہوئے سمندر میں ملنے کا دلکش سمان نظر آسکتا تھا؛ ندی کے کنارے کنارے ایک سڑک میدان سے ہوکر ایک دوسری سلطنت کو جاتی تھی؛ یہ سڑک نشیب پر واقع تھی، اس لئے دوسری سلطنت میں جانے والی گاڑیان اور سیاح وغیرہ آسانی کے خیال سے جانے کے لئے اسی طرف سے [illegible] ایک دوسری راہ اختیار کرلیتے تھے۔ جس کی چڑھائی اتنی زیادہ نہ تھی؛ یہ وادی چونکہ دو مختلف تمدن اور مختلف سلطنت کے درمیان واقع تھی، اور اس کی سڑک بھی نشیب کی وجہ سے آرام دہ تھی اس لئے؛ مل میں رہنے والون کے لئے طرح طرح کی گاڑیون، پیدل مسافرون اور تاجرون کے قافلون کے جانے کا سمان ایک قسم کی دلچسپی کا سامان تھا؛ کمسن ولیم شوق سے یہ نظارہ دیکھا کرتا۔ لیکن اسے یہ دیکھکر بڑی حیرت تھی کہ اس راہ سے جاتے تو ہین بہت لوگ لیکن ان جانے والوں میں سے کوئی کبھی واپس نہیں آتا؟ وہ اپنے دل میں برابر یہی سوچتا کہ آخر یہ کونسی ایسی جگہ جاتے ہین کہ جہان سے واپس آنے کا نام بھی نہین لیتے؟ وہ ابھی یہ معمہ حل کرنے میں مصروف ہی تھا کہ ان دونوں سلطنتوں میں جنگ چھڑگئی۔ اخبارات شکست و فتح کی خبرون سے بھرے رہتے تھے۔ اکثر دور سے توپوں کے دغنے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے صبح سویرے دیکھا کہ سوار ... کی ایک پلٹن مل کی طرف آرہی ہے۔ سوار سب کے سب ایک قسم

[illegible] یہ لوگ بھی میدان کی طرف
روانہ ہوئے تھے اور یہ سلسلہ تین رات دن تک جاری رہا۔ ولیم نے اتنے
آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اشتیاق سے ان کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔
لیکن معمول کے مطابق وہ بھی اس راہ سے واپس نہ آئے؛ اب ولیم
کی حیرت کی کوئی انتہا باقی نہ تھی؛ شب و روز میدان کی طرف لوگ جانے
میں مصروف ہیں۔ لیکن ان میں سے واپس کوئی نہیں آتا؛ اسے یہ
سوچکر عجیب بے کلی سی ہوئی کہ آخر یہ ہزاروں ہزار سپاہی، یہ روز جانیوالی
گاڑیاں، پیدل مسافر، سیاح اور تاجروں کا گروہ کہاں گیا؟ یہ واپس کیوں
نہ آئے؟ بلکہ اب تو اس کا مشاہدہ یہاں تک بڑھا کہ ندی کا پانی، اور ہوا
کا جھونکا بھی اسی طرف جاتا ہے! اسے یہ یقین ہو گیا کہ یہ دنیا کی تقریباً
سب کی سب جاندار اور بیجان چیزیں کسی وجہ سے میدان ہی کی طرف
جا رہی ہیں۔ صرف وہ اور ان کے چند آدمی اس وادی میں معطل زندگی
کاٹ رہے ہیں؛ اکثر وہ اس لاینحل مسئلہ پر غور کرتے کرتے گھبرا سا جاتا۔
اور ندی کے کنارے جا بیٹھتا؛ یہاں؟ سے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پانی
کی سطح پر نظر آتیں۔ اور یہ خیال کرکے کہ کم سے کم یہ مچھلیاں وفاداری کے
ساتھ اسی کی طرح زندگی بسر کر رہی ہیں؛ اور اسے چھوڑ کر میدان کی
طرف چلی نہیں جاتیں، وہ ایک حد تک مطمئن ہو جاتا!

آرزو!

آخر کار اس نے ایک دن اپنے باپ سے دریافت
کیا کہ "یہ ندی کہاں جاتی ہے"؟

اس کے باپ نے جواب دیا — "یہ ندی پہاڑ سے نکل کر
وادی سے ہوتی ہوئی میدان میں پہنچتی ہے۔ اس درمیان میں اسکے
کنارے بہتیرے شہر آباد ہیں؛ ہم نے سنا ہے کہ ان شہروں میں بڑے
بڑے دولتمند بادشاہ رہتے ہیں۔ جن کے دروازوں پر تلوار اور بندوق
سے مسلح سنتری خوبصورت پوشاک پہنے ہوئے کھڑے رہتے ہیں؛

اکثر [illegible]
نکلتے ہیں۔ اور پانی کی دلکش روانی کا سلسلہ دیکھکر خوش ہوتے
ہیں؛ ان شہروں سے یہ ندی ہوتی ہوئی سمندر میں چلی جاتی ہے۔
جہاں بڑے بڑے جہاز دوسری دنیا سے تماکو وغیرہ لاتے ہیں۔
خدا اس کو رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ اس ندی سے آدمی کو بڑا
فائدہ ہے"!

ولیم ندی کی عجیب کارگذاریوں کو تعجب سے سنتا رہا۔
لیکن "سمندر" کی حقیقت اسکی سمجھ میں نہ آئی اور اس نے پوچھا۔
"سمندر کیا چیز ہے"

اس کا باپ جو بیٹے کی میٹھی میٹھی باتوں سے خوش ہو رہا تھا۔
اس سوال سے کچھ گھبرا سا گیا۔ لیکن آخر ذہن پر زور دیکر اس نے
جواب دیا — بیٹا! سمندر! اُف خدا کی پناہ! یہ خدا کی بنائی ہوئی
چیزوں میں سب سے بڑی چیز ہے۔ یہ کھارے پانی کی بہت ہی
بڑی...... بہت ہی بڑی جھیل ہے۔ جس میں سارے جہان کی
ندیوں کا پانی جاکر اکھٹا ہوتا ہے۔ عام طور سے اسکا پانی ساکن رہتا
ہے۔ لیکن مجھکو ایک جہازی سے معلوم ہوا ہے کہ کبھی کبھی سمندر
میں طوفان آتا ہے۔ اس کی لہریں اونچائی میں ہمارے پہاڑ کی
چوٹیوں سے بھی بڑی ہوتی ہیں۔ اور جو جہاز اس آفت میں مبتلا ہوتا
ہے وہ زیادہ تر غرق ہی ہو جاتا ہے؛ سمندر کے پانی کے چلنے
کی آواز ساحل پر میلوں سنائی دیتی ہے؛ اس میں بھینسوں کے
برابر بڑی بڑی مچھلیاں ہوتی ہیں؛ اور پانی کی تہ میں ایک سانپن
ہے جو لانبائی میں اس دریا سے بھی زیادہ ہے؛ اور اس کی عمر دنیا کی
تمام دوسری چیزوں سے زیادہ ہے۔ اسکے سر پر چاندی کا چھوٹا
سا تاج ہے، یہ سانپن سمندر کی رانی ہے"!

ولیم ان خبروں کو سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور
اس نے باپ سے دنیا کے متعلق بہتیرے سوال کر ڈالے؛ باپ
بیٹے کی بھولی بھولی باتوں سے بہت مسرور ہوا۔ اسی نے ولیم کو

شفقت سے اٹھایا۔ اور بولا کہ چلو تم کو ندی اور میدان کی خوبصورتی کا نظارہ دکھا دیں۔ وہ ولیم کو لیکر سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جا پہونچا +

شام قریب تھی۔ آفتاب کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا؛ شفق نے کائنات کی ہر چیز پر ایک دلکش رنگ چڑھا دیا تھا۔ ولیم نے زمین کا اتنا بڑا حصہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ندی کی روانی، گھنے جنگل اونچے اونچے پہاڑ، اور دور کے شہروں کے دھندلے مناظر بڑی مسرت سے دیکھنے شروع کئے۔ بہت دور آگے دنیا پر آسمان کا سہرا کنارہ حد فاصل بنا ہوا تھا؛ یہ سب دیکھنے کے بعد اس نے پہاڑ کے نیچے تل کی طرف دیکھا۔ اس کی طبیعت کچھ عجیب طرح سے گھبرا اٹھی؛ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سر میں چکر آگیا۔ ہر چیز گھومنے لگی؛ معلوم ہوا کہ آفتاب چکر کھا رہا ہے۔ اور اب گرنے کو قریب ہے۔ ولیم بے حد پریشان ہوگیا۔ اور اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوگئی کہ اس نے منہ کو ہاتھوں سے ڈھک کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اس کا باپ اس خلاف قیاس واقعہ سے بددل ہوگیا۔ اور ولیم کو لیکر پہاڑ سے اتر گیا!

اس دن کے بعد سے ولیم نئے جذبات نئی امنگوں اور نئے تمناؤں کا آماجگاہ بن گیا؛ وہ اپنے دل میں ایک نامعلوم خلش محسوس کرنے لگا؛ دریا کی روانی اس کے ارادوں کو اپنی ہمراہی کی ترغیب دیتی درختوں کی چوٹیوں سے گذرتی ہوئی ہوا کی موجیں اسے ہمت افزا الفاظ میں خوش آمدید کہتیں؛ جھومتی ہوئی شاخیں اسے نیچے کی طرف جانے کا اشارہ کرتیں اور کشادہ سڑک اسے چل نکلنے کے لئے بیچین کر دیتی تھی!

وہ گھنٹوں پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا، ندی اور میدان کی طرف بدلیوں کو جاتے ہوئے حسرت سے دیکھا کرتا۔ سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر گاڑیوں کے نشیب کی طرف جانے کا نظارہ کرتا؛ مختصر یہ کہ میدان کی طرف جانے والی ہر چیز خواہ وہ بادل ہو یا گاڑی، چڑیا ہو یا ندی کا پانی، سبھوں کے ساتھ وہ اپنے دل کو اسی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرتا!

حکماء کہتے ہیں کہ پہاڑ والوں کے تمام بحری کارنامے، قوموں اور خاندانوں کی ہجرت کے تمام واقعات جنسے کتب تاریخ اوراق پریشان بنی ہوئی ہیں۔ ان کا راز تمنائے حصول معاش اور فراہمی دولت کی آرزو میں ہے۔ مگر حالات پر غور کرنے سے یہ جواب تشفی بخش ہونیکی بجائے بعض اوقات لغو اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ قومیں جنہوں نے شمال سے جنوب کی طرف ہجرت کی۔ انہیں دوسری قوموں نے نکال بھگایا تھا۔ تو بھی یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اپنی جائے پناہ کے انتخاب میں جنوب کی مقناطیسی کشش بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے؛ یہ صحیح ہے کہ انکے کانوں میں دوسرے ملکوں کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ وہ عالم جاودان کی جانفزا لذتوں کی خبر پا چکے تھے؛ لیکن وہ مہاجرین نہ تھے انکی حیثیت زائرین وحجاج کی سی تھی۔ کیونکہ اگرچہ وہ انہیں ملکوں میں جاتے تھے۔ جہاں سیم وزر کی فراوانی اور شراب وکباب کی ارزانی ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی ان کا دل تن آسانی کی بجائے کسی اور ہی جذبہ عالیہ سے متاثر رہتا تھا؛ یہ وہی روحانی خلش وہی فطری اضطراب تھا جو روز ازل سے آجتک اولاد آدم کے دلوں میں چٹکیاں لے رہا ہے؛ اور انسانوں کی تمام عظیم الشان کامیابیوں اور عبرتناک ناکامیوں کا سبب رہا ہے؛ یہی وہ جذبہ تھا جس نے ایکاریس کو قوت پرواز بخشی اور کالمبس کے سر نئی دنیا کے حصول کا سہرا چڑھایا؛ ایک کہاوت ہے کہ کسی زمانہ میں سیاحوں کی ایک جماعت کی ملاقات اثناء سفر میں ایک ضعیف آدمی سے ہوئی۔ جس کے کپڑے چاک چاک اور گرد وغبار سے آلودہ تھے۔ اور پاؤں میں لوہے کے جوتے تھے؛ بڈھے نے سیاحوں سے دریافت کیا کہ وہ لوگ کس تلاش میں نکلے ہیں؛ سیاحوں نے یک آواز جواب دیا کہ "عالم جاودان کی جستجو میں" بڈھے نے انہیں حسرت سے دیکھا اور کہا کہ میں بچپن سے اسی تلاش میں سرگرداں ہوں

اور دنیا کا چپہ چپہ چھان چکا ہوں، چنانچہ اس کوشش میں ایسے ایسے لوہے کے تین جوڑے جوتے توڑ چکا ہوں، اور یہ چوتھا پہنے ہوا ہوں۔ لیکن آہ منزلِ مقصود تک رسائی نہ ہوئی! بڈھا یہ کہہ کر تیزی سے اپنی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ اور سیاح حیرت زدہ کھڑے رہ گئے!

ولیم کے دل میں بھی میدان کی جانب جانے کے لئے کچھ ایسا ہی بے پناہ جذبہ موجزن تھا! وہ محسوس کرتا تھا کہ اگر وہ کسی طرح وہاں پہنچ جائے تو عجیب و غریب نعمتوں اور لذتوں سے نہال ہو جائے گا۔ اُس کا دل و دماغ زیادہ روشن اور پاک ہو جائے گا۔ وہ اس آرزو میں اتنا ہی بیتاب رہتا تھا جتنا کہ غریب الوطن مسافر کا دل اپنے وطن کے لئے بیچین رہا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے دماغ میں اس نے میدان کی دلکشیوں کا ایک خیالی خاکہ بھی تیار کر لیا۔ جہاں خوبصورت شہر اونچی اونچی عمارتیں، روح پرور باغات، اور مال و دولت کی فراوانی تھی؛ جہاں شوخ و شنگ حسینان خوش گلو محبت و مسرت کی نغمہ سرائی میں مصروف تھیں، جہاں قدم قدم پر عظمت و شوکت انسانوں کے پاؤں چومنے کو چشم براہ تھیں! یہ تھی وہ دنیا جس کی دلربائیاں ولیم کو دعوتِ نشاط دے رہی تھیں۔ اور جہاں جانے کی تمنا میں وہ حد درجہ مضطرب تھا!

اپنی محرومی پر وہ غمگین تھا، اور التجائیں کرتا کہ کاش خدا اسے اس اوعزا پہاڑوں کی دنیا میں سے جائے۔ اور مرنے سے پہلے ایک دفعہ بھی وہاں کی حیات بخش نعمتوں سے مستفیض ہونے کا موقع عنایت فرمائے!

غایت پریشانی کی حالت میں وہ ندی کی ادھر سے ادھر دوڑنے والی مچھلیوں کو مخاطب کرتا اور کہتا، کہ اے خوش نصیب مچھلیو! تم آزاد ہو، اور خوشی سے اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل میں جہاں چاہو آ جا سکتی ہو۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو! غریب مچھلیاں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی تیزی سے نکل جاتیں۔ اور ولیم یاس و ناامیدی کی تصویر بنا ہوا حسرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا کرتا۔

انقلاب!

کچھ دنوں کے بعد ولیم کے باپ نے اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے مل کے قریب ہی ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی کھول دیا! مسافروں کیلئے یہ ہوٹل نہایت آرام دہ تھا کیونکہ سفر کی تکان سے خستہ حال انسانوں کے لئے ایسے اجاڑ علاقہ میں ناشتہ اور گرم چائے کا آسانی سے مل جانا نعمتِ غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا؛ چنانچہ ہوٹل سے کافی آمدنی آنے لگی۔ اور ہر وقت دو ایک گاہک ضرور موجود رہنے لگے؛ ولیم کو اس کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا پڑا اور اس کے ذمہ گاہکوں کی ضروریات فراہم کرنے کا کام سپرد ہوا؛ اس کام سے ولیم کو ایک دوسرا فائدہ ہوا کہ شہروں سے واقفیت رکھنے والے مسافروں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتک شہروں کے متعلق جو خیالات اس نے محض تخیل کی بنا کر قائم کئے تھے۔ ان میں سے اکثر کی پوری تصدیق ہو گئی! اُسے شہری لوگوں سے خاص اُنس ہو گیا تھا۔ اور ان کے احکامات کی تعمیل میں خاص دلچسپی لیتا۔ ایک مرتبہ اتفاق سے ایک آزاد خیال اور خوش مزاج مسافر شب باشی کے خیال سے ہوٹل میں پہنچا۔ ولیم نے معمول کے مطابق اس کے احکام کی تعمیل میں خاص دلچسپی لی۔ مسافر اس نوعمر لڑکے کی مستعدی اور ہوشیاری سے نہایت خوش ہوا۔ اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ولیم کو پہلی مرتبہ ایک ایسا آدمی ملا جو خوشی اور آزادی سے اس کے سوالات کا جواب دیتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مسافر سے شہروں کے متعلق اپنا خیال اور وہاں جانے کا اشتیاق بھی ظاہر کر دیا!۔

مسافر اس کی باتیں سنکر مسکرایا اور بولا ــــــ میرے نوعمر دوست! اس میں شک نہیں کہ تم ہو بڑے دلچسپ، لیکن ایسی چیزوں کی تلاش میں ہو جو جیتے جی کبھی حاصل نہ کر سکو گے،

تھیں یہ سنکر مسٹر ماد نے کہ تم نے شہروں کے متعلق جو تخیل قائم کر لیا ہے اور وہاں جانے کا جتنا اشتیاق رکھتے ہو، اکثر دیہاتی شہری بھی دیہاتوں کے بارے میں ایسا ہی احمقانہ خیال رکھتے ہیں۔ سنو! جو لوگ دیہاتوں سے شہروں میں قدم رکھتے ہیں انہیں وہاں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں دیہات واپس آنے کے لئے تڑپنے لگتے ہیں۔ آخر ان شہروں میں رکھا ہی کیا ہے۔ وہاں بھی تو سی آفتاب اور ماہتاب کی روشنی کا سہارا ہے۔ بلکہ شہروں کے مقابلہ میں دیہاتوں کی ہوا نہایت ہی مفید اور صحت بخش ہے۔ ہاں وہاں تمہیں خوبصورت انسان نظر آئینگے۔ لیکن ان میں سے کچھ تو عزت سے تنگ حال ہونگے کچھ بداعتدالیوں کے باعث صحت و تندرستی کھو کر قابل رحم نظر آئینگے! اور سچ تو یہ ہے کہ شہروں میں سامانِ حیات اتنا گران ہوتا ہے، اور ایسی ایسی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے کہ غریب اور حساس طبع لوگ تو ایسی زندگی پر موت کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔!

ولیم نے جواب دیا ——— سنئے جناب! آپ مجھے سمجھتے ہونگے نہایت سادہ لوح، اور اگرچہ میں نے اپنی اتنی زندگی دیہات ہی میں گذاری ہے لیکن آنکھیں بند کرکے یہ دن نہیں کاٹے، میں جانتا ہوں کہ اس دنیا میں چاروں طرف پیکارِ حیات جاری ہے۔ اور ہر چیز اپنے سے کمزور شئے کو ہضم کر جانے کی فکر میں ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں، گدڑیا گود میں بھیڑ کا بچہ لاتا ہوا کتنا نیک اور اچھا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وہی اس غریب جانور کو ذبح بھی کر ڈالتا ہے۔ میں یہ امید نہیں کرتا کہ شہروں میں اس اصول فطرت کے خلاف واقعات ہونگے، اور ان خطرات سے میں گھبراتا بھی نہیں، بچپن میں، میں نے شہروں کے متعلق بہت کچھ غلط تخیلات قائم کر لئے تھے۔ لیکن مجھے جیسے جیسے موقع ملتا گیا لوگوں سے واقعات معلوم کرکے اپنے خیالات کی اصلاح کر لی ہے، آپ شہروں کو نا بہتر کرتے ہیں۔ لیکن میں پھر بھی یہ سمجھتا ہوں کہ آپ نہیں چاہتے ہونگے کہ میں کتوں کی طرح ایک ہی دروازہ پر پڑا اپنی زندگی بے لطفی اور جمود میں گذار دوں۔ اور کائنات عالم کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کئے بغیر اپنی عمر اسی وادی اور ندی کے کنارے ٹہل ٹہل کر گذار دوں، بلکہ آپ مجھے یہ صلاح دینگے کہ ہر وہ کام جو ایک انسان نے کیا ہے، میں بھی اسے کرنے کی کوشش کروں۔ مانا کہ مجھے خطرات کا سامنا ہوگا۔ لیکن خطروں میں پڑے بغیر کون سا کام انجام پا سکا ہے! میں تن آسانی کی زندگی پر موت اور خطرات کو زیادہ ترجیح دیتا ہوں!"

مسافر نے کہا ——— "تمہارے جیسے ہزاروں آدمی اس تمنا میں جان کھو چکے ہیں۔ لیکن اس سے ان کو حاصل ہی کیا ہوا!"

ولیم نے حسرت سے کہا ——— کاش! اُن ہزاروں آدمیوں میں ایک بھی میری جگہ آنا پسند کرتا اور مجھے پیکارِ حیات میں شامل ہونے کا موقع ملتا۔

مسافر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، اور ولیم کا ہاتھ پکڑے ہوئے مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

شام ہو چکی تھی، آسمان چمکیلے تاروں سے پُر نور بنا ہوا تھا۔ مسافر نے ولیم سے پوچھا

——— تم نے کبھی ستاروں کے متعلق غور کیا ہے؟

ولیم ——— "جی ہاں! اکثر!"

مسافر ——— "تم جانتے ہو یہ کیا ہیں؟"

ولیم ——— میں نے ان کے بارے میں مختلف نظریات قائم کئے ہیں!"

مسافر ——— "ستارے بھی ہماری دنیا کی مانند ہیں۔ ان میں بعض تو ایسی دنیائیں ہیں جو بعض اپنے بڑے کمال کے مقابلہ میں ہماری دنیا کی حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ

نہیں! ہم لوگوں کو معلوم نہیں کہ ان میں ہے کیا، لیکن کیا عجب ہے کہ ان ہی میں ہماری تمام آرزؤں کی تکمیل کے ذرائع، تمام بیماریوں کا علاج اور تمام الجھنوں کا حل موجود ہو، مگر یہ جان لو کہ ہماری رسائی وہاں تک ناممکن ہے، عاقل ترین انسان بھی کوئی ایسا آلہ تیار نہیں کر سکتا کہ جس کی مدد سے ہم وہاں پہنچ سکیں، اور اگر کوئی ایسی سواری دستیاب بھی ہو جائے تو ہماری عمریں اتنی کم ہیں اور یہ اتنی دوری پر آباد ہیں کہ ہم وہاں پہنچنے کے قبل ہی موت کی نذر ہو جائینگے! جب ہم کسی بڑے مہم میں ناکام ہوتے ہیں یا ہمارا کوئی عزیز ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے جاتا ہے یا جب کسی ایسے ہی دوسرے روح فرسا مصائب میں گرفتار ہو کر ہم غم میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ان ستاروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اسی طرح ٹمٹماتے رہتے ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ اگر ساری دنیا کے انسان بھی اکٹھے ہو کر انہیں پکاریں تو خواہ چلاتے چلاتے وہ مر ہی کیوں نہ جائیں لیکن ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگے گی! ہم لوگ اونچے سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کیوں نہ چڑھ جائیں لیکن انہیں قربت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ جان لو کہ تلاش امن و سکون میں ان تک پہنچنے کی سعی لاحاصل سے بہتر یہی ہے کہ ہم دوری سے اس کا نظارہ کریں۔ کیونکہ ہمارے بس کی یہی بات ہے!

مسافر کی تقریر نے ولیم کے خیالات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اب اس کے سامنے ایک طرف تو انسانوں کے بلند ارادے تھے اور دوسری طرف ناقابل عبور خندقیں جن کا لازمی نتیجہ جیسا کہ اسے بتایا گیا ناکامی اور بربادی تھا! اس نے حیرت سے کہا ——— آہ! تو گویا ہم لوگ ایک ایسے پنجرے میں قید ہیں کہ "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن!"

مسافر نے نہایت مدبرانہ انداز میں کہا! "بالکل درست!

واقعات یہی بتاتے ہیں!! کبھی تم نے ایک گلہری کو پنجرے میں بیٹھے دیکھا ہوگا؟ اور دوسری کو فلسفیانہ انداز سے کسی پھل کے قریب بیٹھا ہوا پایا ہوگا؟ میرے خیال میں یہ پوچھنے کی حاجت نہیں کہ ان دونوں میں تمہاری نظر میں کون زیادہ بیوقوف معلوم ہوتی ہے"

عشق

کچھ دنوں کے بعد ولیم کے والدین پہلے بعد دیگرے بیمار پڑ کر راہی ملک عدم ہوئے۔ ولیم نے ان کی تیمارداری میں کوئی کمی نہ کی۔ اور مرنے کے بعد بھی انکی یاد میں اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا۔ اس کے والدین کے مرنے پر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ ولیم اپنی جائداد فروخت کر کے قدیم خبط کے مطابق وادی چھوڑ کر کہیں چلا جائے گا لیکن انہیں کیا معلوم کہ مسافر نے اس کے دل کی دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ولیم نے ہوٹل کو اور زیادہ اچھے پیمانہ پر قائم کیا۔ دو نوکر بھی رکھ لئے! اب وہ شباب کے پُر بہار عالم میں پورا چھ فٹ کا کشادہ سینہ، تنومند نوجوان تھا۔ جس کی خوش مزاجی اور جدت طرازی لوگوں کو اس کا دلدادہ کر دیتی تھی، چند ہی مہینوں میں اس کا کاروبار بھی چل گیا۔ اور اس کی دولت کا تذکرہ بھی عوام میں پھیل گیا، تھوڑے دنوں تک اس کی زندگی میں کوئی اور اہم واقعہ نہ ہوا، لیکن اتفاق سے ایک ایسی نئی بات بھی پیدا ہو گئی جس کا اس کے مستقبل پر پورا اور گہرا اثر پیدا ہو گیا!

واقعہ یہ ہوا کہ پاس کے کلیسا کے پادری صاحب کا مکان پرانا ہونے کی وجہ سے مرمت کی ضرورت رکھتا تھا، اور اس سبب سے پادری صاحب کو مکان خالی کرنا پڑا۔ ولیم کا ہوٹل اپنی آرام رسانی اور ارزانی کے باعث مشہور ہو چکا تھا۔ پادری صاحب نے کچھ دنوں کے لئے اپنے رہنے کا سامان یہیں کیا! ان کے ساتھ

انکی لڑکی مارجوری جو حسن وسلیقہ اور علم و کمال میں کافی شہرت رکھتی تھی وہ بھی آ گئی۔ مارجوری کچھ بددماغ کہلاتی تھی، کیونکہ اکثر دولتمند نوجوان نے اس سے شادی کی تحریک کی تھی اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بدمزاج یا مغرور لڑکی نہ تھی بلکہ ولیم ہی کی طرح خاموش وخود دار اور مستقل مزاج واقع ہوئی تھی، پادری صاحب کو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ معمول کے مطابق لوگ اس انتخاب قیام کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے، بعضوں کا خیال ہوا کہ پادری صاحب کے یہاں ٹھہرنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ہو سکے تو مارجوری کی شادی ولیم سے کر دیجائے۔ اڑتے اڑتے یہ بات ولیم کے کان میں بھی پہنچی۔ اس نے اس پہ کوئی زیادہ توجہ نہ کی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے دماغ میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ آخر مارجوری میں کون سی ایسی خصوصیت ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس پر شیفتہ ہو جاؤں گا؟ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب موقع بموقعہ وہ مارجوری کی حرکات کا جائزہ لینے لگا، اس نے اس میں کوئی خاص وصف نہ پایا لیکن اُسے دل ہی دل میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مارجوری کی آواز میں کچھ عجب کشش اور باتوں میں ایک حد تک معقولیت ہوتی ہے۔ مارجوری اس قدر کم سخن تھی کہ سوائے بجی باتوں کے ولیم کو کبھی اس سے کھل کر گفتگو کرنے کا موقع نہ ملسکا، اور چند ہی دنوں میں ظاہرا اس کا دماغ اس کی طرف سے خالی الذہن ہو گیا۔ اس مدت میں بہار کا موسم اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ آپہنچا، اب مسافروں کی آمدورفت بھی بڑھ گئی۔ اور ولیم کا زیادہ وقت ہوٹل کی مشغولیت میں صرف ہونے لگا۔ دوپہر کے وقت مارجوری طعام سے فراغت کر کے آرام کرتی تھی۔ اور یہی وقت ولیم کے فرصت کا تھا، اس وجہ سے پہلے پہل لگاتار دو دنوں تک ولیم اسے دیکھ بھی نہ سکا! اس درمیان میں اس کا دل کچھ عجیب اچاٹ سا رہا، ولیم نے اس بےچینی کو کاموں کی یکایک زیادتی پر محمول کیا، ایک دوپہر کو کھانے سے فراغت کر کے وہ سگار کا دھواں اڑا رہا تھا کہ مارجوری خلاف معمول اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ اور تھوڑی دیر تک ولیم سے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے چلی گئی، ولیم نے محسوس کیا کہ مارجوری کی ملاقات سے اس کی طبیعت بحال ہو گئی، چند بار کے تجربات سے اس نے محسوس کیا کہ زیادہ دیر تک مارجوری سے جدا رہنے سے اس کا دل بلا وجہ کچھ اداس سا ہو جاتا ہے، اور اسکی ملاقات سے خلش مٹ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ مارجوری کی رفاقت کے بغیر اس کا دل خوش نہیں رہ سکتا!

ایک شام ولیم ہوا خوری کے خیال سے وادی کی طرف جا نکلا، اس کا دل امنگوں سے سرشار تھا، اور وہ کائنات پر بہار کی دلکشیوں سے شادان وفرحان غنچہ نیم شگفتہ کی مانند مسرور ومتبسم تھا، آج دریا کی آہستہ خرامی کلیوں کا چٹکنا، سرسبز ڈالیوں کا جھومنا، اور چڑیوں کا چہکنا اسے بھا رہا تھا، فطری طور پر اسے وہ دن بھی یاد آ گئے جب وہ ترک وطن پر آمادہ تھا، اس کے دل نے کہا کہ واقعی لطف وسکون جستجو سے نہیں ملتا، کیونکہ قدرت نے بغیر تلاش وجستجو اسکے پاس مارجوری جیسی نعمت بھیجدی ہے جس کی موجودگی سے اس کی زندگی مسرت وانبساط سے لبریز ہو رہی ہے۔ ہوا خوری سے واپس آنے پر اس نے پادری صاحب کو سگار نوش کرتا ہوا پایا۔ مارجوری بھی ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی، ولیم کچھ اسطرح بیخود ہو رہا تھا کہ اس نے رسم ورواج کی پرواہ کئے بغیر ان لوگوں کے پاس بیٹھکر مزاج پرسی کے بعد فوراً ہی اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا،

———— مس مارجوری! آج تک کوئی آدمی مجھے تمہاری مانند پسند نہ آیا، میں خشک مزاج سا آدمی معلوم ہوتا ہوں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرا دل ہی ایسا ہے بلکہ میں اپنے دل اور خیالات میں دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف واقع

اور اسی باعث اوروں میں مجھے اجنبیت سی معلوم ہوتی ہے، یوں سمجھو کہ ہمارے گرد ایک دائرہ ہے جس کے اندر تمہارے سوا اور کوئی نہیں آتا۔ میں اوروں کو ملتے ہوتے سکتا ہوں لیکن صرف تمہیں ہمیشہ کی باتیں سمجھے بھاتی ہیں۔ کیا میں تم سے رفاقت کی اُمید کرسکتا ہوں؟

ماجوری خاموش رہی، پادری صاحب نے سنجیدگی سے کہا!

———" ماجوری! میرے خیال میں تمہیں کوئی صائب رائے قائم کرکے مسٹر ولیم کو مطلع کر دینا چاہیئے"!

ماجوری اس پر بھی خاموش رہی، ولیم کا دل اُمید و بیم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اس خاموشی نے ایک حد تک مایوس کردیا اور وہ بول اُٹھا! ———

"مس ماجوری صاحبہ! کیا آپ کو مجھ سے کوئی اختلاف ہے؟!"

ماجوری نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے جواب دیا!

"اختلاف! نہیں مجھے آپ سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی!"

پادری نے شفقت سے پھر کہا!

———" پیاری بچی! تمہیں صاف صاف کہنا چاہیئے۔ بولو! کیا تم اس رائے کو پسند کرتی ہو یا نہیں؟"

———" جی ہاں" ——— ماجوری نے آہستہ سے کہا

ولیم فرطِ مسرت سے کہہ اُٹھا ——— بس! میں اپنی تقدیر سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا!

پادری صاحب نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے فرمایا

———" خیر تو اب تم لوگوں کی شادی ہوجانی چاہیئے؟"

یہ سنکر مارجوری آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگئی، اور ولیم خوش و خرم اپنے کاموں کی دیکھ بھال کے لئے چلا گیا۔

کشمکش

دو تین دن گذر چکے ہیں۔ ولیم جذبات مسرت سے نہال ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی ظاہری حالت سے کسی دوسرے آدمی کیلئے اسکے دل کی کیفیت کا اندازہ کرنا محال ہے۔ اب وہ مارجوری ہی کے ساتھ کھاتا ہے، اور پادری صاحب کے موجودگی کے باوجود اُسے اشتیاق آمیز نظروں سے دیکھا کرتا ہے؛ لیکن مارجوری سے تنہائی میں ملنے کی اب تک اس نے کوئی کوشش نہ کی، نہ کبھی اظہار محبت ہی کیا، ماجوری اس کے اس رویہ سے جائز طور پر ایک حد تک بددل ہو رہی ہے؛ لیکن اگر کسی کے محبت بھرے دل میں ہمہ دم موجود رہنا، اور اس کے تمام احساسات پر حاوی رہنا اسکی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دینا، ایک دوشیزہ کی کامیابی تصور کی جاتی ہے تو اسمیں کوئی شک نہیں کہ ماجوری قابلِ مبارکباد ہے؛ کیونکہ اس مدت میں اس کا خیال ولیم کے دل سے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوسکا، وہ دریا کی موجوں کا نظارہ کرتا، شفقِ شام کی رنگینیوں کو دیکھتا، چڑیوں کے ترانۂ مسرت سنتا، اور حیرت سے سوچتا کہ اب خلاف معمول اسے ان چیزوں میں ایک نئی دلکشی اور ایک نئی جاذبیت کیوں نظر آتی ہے، وہ اتنا ہی مسرور تھا کہ راتوں کو نیند بھی مشکل سے آتی تھی۔ اس کی ہر وقت یہی خواہش ہوتی کہ مارجوری اس کے قریب بیٹھی ہوتی لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس سے ملنے کی بجائے دیدہ و دانستہ جدا رہنا چاہتا ہے،

ایک مرتبہ اتفاق سے وہ گلاب کے کنج کی طرف جا پہنچا، ماجوری پھول توڑ رہی تھی، دونوں کی نگاہیں ملگئیں، ——— ولیم نے مسکراتے ہوئے سوال کیا

——— "تمہیں پھول پسند ہیں؟"

——— "ہاں! بہت پسند ہیں، تم بھی انہیں چاہتے ہوگے!"

——— "کیوں نہیں! لیکن میں انہیں بہت زیادہ پسند بھی نہیں کرتا! میں نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی پھولوں کا قدر دان پایا ہے، مگر پھر بھی تمہارے اتنا کسی کو نہیں!"

——— "یعنی:"

——— "تم انہیں توڑ توڑ کر اپنے پاس رکھ رہی ہو، میرے خیال میں وہ اپنی جگہ پر زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں"

——— میں انہیں توڑ توڑ کر ہار بناتی ہوں، اور یہ ہار گلے سے لگاتی ہوں، پھول مجھے بہت بھاتے ہیں، اور جب میں انہیں دیکھتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے اپنے حصول کے ملتجی ہیں، انہیں توڑ لینے کے بعد وہ میرے ——— صرف میرے! ——— ہو جاتے ہیں، اور میں انہیں جی بھر کر پیار کر سکتی ہوں"

——— تم ان پر اس لیئے قابو پانا چاہتی ہو کہ پھر ان کا خیال، اپنے دل سے نکال دو، یہ ٹھیک ایسا ہی کہ جیسے کوئی سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو فریب ہوس کھا کر ذبح کر ڈالے۔ بچپن میں میرا بھی قریب قریب یہی حال تھا؛ میں میدان کی آبادیوں میں جانے کا بہت خواہشمند تھا تاکہ وہاں کے دلکشیوں کے نظارے سے لطف اندوز ہو سکوں؛ لیکن میں اگر وہاں پہنچ جاتا تو یقیناً وہاں کی ساری نیرنگیاں، جن کے تصور سے میں آج بھی ایک حد تک محظوظ ہوتا ہوں، میرے لیئے بے معنی سی ہو کر رہ جائیں، کیا یہ عمدہ دلیل نہیں ہے! پیاری ماجوری! اگر دنیا میرے اس نظریہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو سب کے سب میرے ہمخیال ہو جائینگے، اور تم بھی اگر سوچو تو پھر انہیں توڑنا چھوڑ دو کیونکہ اگرچہ یہ پھول توڑ کر تم کچھ دیر کے لیئے ان سے زیادہ سے زیادہ مسرت اندوز ہو سکوگی! لیکن فوراً تمہارا دل آسودہ ہو جائیگا، اور پھر تمہارے لیئے ان میں کوئی جاذبیت باقی نہیں رہیگی! اور وہ شئے جو تمہیں محبوب ہے۔ تمہاری نگاہوں سے گر جائیگی، آہ یہ جذبۂ محبت کی توہین ہوگی، سخت توہین!"

یہ کہکر وہ کسی نئے جذبہ سے سخت متاثر ہو گیا اور انتہائی انتشار میں "خدا کی پناہ" پکار اٹھا؛ مارجوری اس کے اچانک منتشر ہو جانے کا مطلب نہ سمجھ سکی، لیکن مارجوری کے پوچھنے پر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور جس طرح کوئی ڈراونا خواب دیکھنے سے انسان کے چہرہ پر حیرت و پریشانی چھا جاتی ہے۔ ولیم بھی کچھ ایسی ہی صورت بنائے خاموشی کے ساتھ ماجوری کے پاس سے ہٹ گیا؛

اس واقعہ کے بعد چند دنوں تک اس کی کچھ عجیب حالت رہی، اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی نہایت ہی اہم مسئلہ پر غور کر رہا ہے، ایسا مسئلہ جس کے فیصلہ کا اس کی زندگی پر سے نہایت گہرا لگاؤ ہوگا؛ خلاف معمول اب وہ ہمیشہ خاموش اور متفکر نظر آتا، یہاں تک کہ کھانے پر بھی ماجوری یا پادری صاحب سے گفتگو نہ کرتا، الغرض اس کے دل میں کچھ ایسی الجھنیں پڑگئیں کہ جس سے ہر وقت تردد و فکر میں ڈوبا معلوم ہوتا تھا، ایک رات بستر پر پڑے پڑے نیند کی آرزو میں اس نے گھنٹوں گزار دیئے۔ لیکن پریشانی میں انسان کو نیند کب آتی ہے۔ آخر تھک کر وہ پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور صحن

تن چمکنے لگا، چاندنی میں نیلے نیلے پہاڑ ، اور ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان سے ایک عجیب کیف برس رہا تھا، مارجوری کے کمرے کی دریچی کھلی ہوئی تھی، جس سے نارنجی رنگ کی دھیمی دھیمی دلکش روشنی معلوم ہو رہی تھی، ولیم نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور دریچہ کی روشنی اور ستاروں کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے بول اٹھا، اس کمرے میں میری دلربا خواب راحت میں مصروف ہے۔ اور آسمان پر وہ چمکیلے تارے ہیں۔ خدا دونوں پر اپنی رحمت نازل کرے" ان دونوں کا ولیم کی زندگی پر ایک خاص اثر تھا، دونو اپنی جاذبیت کے باعث دنیا سے بے نیاز رہکر قناعت کی زندگی گذارنے میں اُسکے معاون تھے، وہ ان سے اور زیادہ کی کیا آرزو کرسکتا تھا؟! اس کے دماغ میں اس مسافر کے نغمے جڑ پکڑ چکے تھے، ستاروں کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک چیخ ماری؛ اس نے محسوس کیا کہ اس کی آواز سنکر ستارے کچھ جھلملا سے گئے۔ اور مارجوری کی دریچی کی روشنی میں بھی ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوگیا۔ ولیم دیکھکر مسکرایا اور بولا" ستارے جھلملا اٹھے، روشنی میں ارتعاش پیدا ہوگیا، واقعی میں بھی ایک جادوگر سے کم نہیں، لیکن افسوس ہے اگر میں نادانی کا مرتکب ہوں تو یقینی میں جرات سے کام لوں گا۔ میں ہرگز بیوقوف نہ بنوں گا!"

اس صبح کو اس نے چمن میں مارجوری سے ملاقات کی اور دونوں میں گفتگو ہونے لگی

—— "مارجوری! میں چند دنوں سے شادی کے مسئلہ پر غور کر رہا ہوں، میرے خیال میں یہ کوئی بہتر شئے نہیں"

مارجوری اس کے اس خلاف امید فیصلہ کو سنکر کانپ اٹھی اس نے ولیم پر ایک کھوئی نگاہ ڈالی۔ اسوقت اس کے معصوم چہرے کی ہیجانی کیفیت انسان تو کیا فرشتوں کے دل میں بھی ایک خلش پیدا کرنے کو کافی تھی؛

ولیم نے محسوس کیا کہ وہ فرط غم سے کانپ رہی ہے۔ اور کہنے لگا،

—— "پیاری مارجوری، تمہیں اس سے زیادہ متاثر نہیں ہونا چاہیئے میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا ہے، اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شادی مفید ہونے کی بجائے نقصان دہ شئے ہے۔ یقین مانو آج ہم تم ایک دوسرے کو جس قدر والہانہ طور پر پیار کرتے ہیں۔ شادی سے اس سے زیادہ قربت میسر نہ ہوگی"

—— مجھے معمون میں گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں، تم نے صاف طور سے انکار کر دیا، اور اب اس خیال سے کہ تم نے اقرار محبت کرنے میں اپنے جذبات کی غلط ترجمانی کرکے مجھے سخت دھوکہ میں رکھا۔ مجھے نہایت تکلیف محسوس ہو رہی ہے"

—— آہ! مارجوری تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تم پر اپنا دل و جان قربان کرتا ہوں۔ شادی سے اختلاف کی بھی یہی وجہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ شادی محبت کی موت ہے، اس لئے میں نے تم سے گذارش کی کہ تم اپنے والد صاحب ہی کے ساتھ رہو، میں جس طرح چرچ میں عبادت کے لئے جاتا ہوں اسی طرح تمہارے دوشن کو بھی آجایا کرونگا۔ اور اس طرح ہماری محبت کبھی زوال پذیر نہ ہوگی۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کے دیدار سے ہمیشہ مسرور و محظوظ ہوا کرینگے۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے، لیکن پھر بھی میں تمہاری خاطر سب کچھ کرسکتا ہوں، اگر تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہی پسند ہے، تو ویسا کہو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا، ——"

—— مسٹر ولیم! افسوس ہے کہ آپ ایک

خاتون کا مذاق اڑا رہے ہیں"

"آہ! غلط ہے، مارجوری، بالکل غلط! اگر صاف گوئی کوئی بری بات ہے تو خیر، ورنہ میں کبھی تمہاری اہانت کا وہم بھی نہیں کر سکتا، دیکھو! میں اپنا محبت بھرا دل تمہاری نذر کر رہا ہوں، تم مالک ہو چاہے اسے قبول کر دیا ٹھکرا دو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں کے دلوں میں محبت کی جو آگ لگ چکی ہے اسے بجھانا اب نہ تمہارے بس میں ہے نہ ہمارے۔

اگر تم شادی پسند کرتی ہو تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں، لیکن میں ایک بار پھر کہتا ہوں میری پیاری! شادی بہتر شئے نہیں، اور مناسب ہے کہ ہم لوگ میاں بیوی بننے کے بجائے ایک دوسرے کے محبوب و معشوق بن کر رہیں! سنو! میں نے اس تھوڑی سی عمر میں کافی تجربہ حاصل کیا ہے، اور نہائت ہی ایمانداری سے تمہیں یہ مخلصانہ مشورہ دے رہا ہوں، بخدا اس میں دھوکا اور فریب کو کوئی دخل نہیں، پھر بھی تمہیں اختیار ہے جو مناسب سمجھو میں تیار ہوں!"

مارجوری نے ولیم کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا، اور حسرت و حیرت کی تصویر بنی کھڑی رہی، ولیم اس خاموشی سے کچھ اکتا گیا اور اس نے پھر کہا!

"معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ مغرور بھی ہو، مجھے دیکھو کہ میں تمہارے سامنے التجائیں کر رہا ہوں اور تم ہو کہ منہ سے ایک لفظ بولنا بھی جبر ہے خدا کے لئے مجھے اپنے خیالات سے مطلع کرو"

مارجوری نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا اور تیزی سے چمن سے اپنے کمرے میں چلی گئی، ولیم اس کے اس رویے سے ایک حد تک شکستہ دل ہو گیا، اور اداس ہو کر ہوٹل کے کاموں پر روانہ ہو گیا!

جب حسب معمول کھانے کیلئے تینوں جمع ہوئے، مارجوری نے اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہا

"ابا جان! مجھے مسٹر ولیم سے گفتگو کا موقع ملا، افسوس ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے میں سخت غلطی کی تھی، چنانچہ مسٹر ولیم نے میری درخواست پر یہ منظور کر لیا ہے کہ ہم لوگ شادی کا خیال دل سے نکال دیں، اور پہلے ہی کی طرح صرف دوستانہ مراسم پر قناعت کریں، مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ہم لوگوں کو ان سے ملاقات کا موقع ملتا رہیگا، لیکن ابا جان! میری درخواست تھی کہ اب ہم لوگ اس ہوٹل سے چلے جائیں۔ آئندہ آپ کی جیسی مرضی!"

ولیم مارجوری کی تقریر کے شروع ہی سے کچھ عجیب طرح بوکھلایا ہوا تھا، جب اس نے ہوٹل سے جانے کی تحریک کی تو وہ زیادہ بیچین ہو گیا، اور احتجاج کے طور پر کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہے مارجوری نے اُسے غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کوشش سے باز رہنے کا حکم دیا۔

ضعیف پادری اس حادثہ سے نہائت بددل ہو گیا، لیکن کیا کر سکتا تھا، پہلے اس نے سمجھا کہ یہ عارضی غصہ کا نتیجہ ہے اور جلدی ہی پھر مصالحت ہو جائے گی، لیکن اس کا خیال غلط نکلا، مارجوری نے نہائت خوبصورتی سے اسے آخر کار تبدیل قیام پر راضی کر لیا،

اس درمیان میں ولیم مارجوری کی مستقل مزاجی اور بلند ہمتی کا غور سے مطالعہ کرتا رہا، لیکن جب وہ چلی گئی اور وہ تنہا رہ گیا تو پھر ایک نامعلوم خلش نے اس کے دل کی وہ تمام مسرتیں اور امنگیں جو مارجوری کی قربت سے حاصل ہوئی تھیں پہلے ہی کے مانند یاس و حرمان سے بدل دیں،

ندی کے کنارے اب اُسے کوئی دلچسپی نظر نہ آتی تنہائی میں بھی وہ پہلی سی دلکشی باقی نہ تھی اور سکوت و انبساط ہمیشہ کیلئے

رخصت ہو چکا تھا، ساتھ ہی ساتھ مارجوری کی حرکات سے وہ بد دل بھی ہو رہا تھا لیکن پھر بھی اس کے خودداری کا دل ہی دل میں قائل بھی ہوتا گیا، اس نے محسوس کیا کہ مارجوری بھولی بھالی عورت کے علاوہ ایک انقلاب انگیز دل بھی رکھتی ہے۔ وہ اگرچہ بادی النظر میں ایک آسودہ حال انسان تھا لیکن درحقیقت یہ تخیلی اور بناوٹی سکون تھا، اور وہ دل سے آسودگی قلب کا تمنائی تھا۔ اس کی حالت اس واقعہ کے بعد ایسی ہی تھی جیسے کہ اس انسان کی ہوتی ہے جس نے ایک مدت تاریکی میں بسر کرنے کے بعد۔ پہلے پہل سورج کی روشنی دیکھی ہو، وہ موجودہ حالت کو ایک یاس انگیز مسرت سے دیکھتا،

الغرض رفتہ رفتہ اس کی الجھنیں بڑھتی گئیں، وہ راہ الفت میں اپنی اس قربانی پر خوش ہوتا، کبھی مارجوری کے فراق کی ناقابل برداشت خلش سے متاثر ہو کر اپنی اس قربانی پر نفرین کرتا۔ کچھ دن اسی کشمکش میں گذر گئے، لیکن وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہونچ سکا، آخرکار جب آتشی فرقت کے تیز شعلوں نے اس کے خرمن دل کو خاکستر بنانا شروع کر دیا اور ضبط و سکون نے کنارہ کشی اختیار کر لی تو مجبور ہو کر اس نے مارجوری کے حصول کو اپنی زندگی کی سلامتی کا واحد ذریعہ سمجھا، اور ہرچہ بادا باد کہتا ہوا، سینے میں تازہ دم امنگوں کے بے پناہ جذبات دباتا ہوا کچھ عجیب حالت بیخودی سے مارجوری کے دولتکدہ کی طرف چل کھڑا ہوا

مارجوری نے ولیم کو دیکھکر نہایت سادگی سے ہاتھ بڑھایا اور ولیم نے اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے کے خیال سے گفتگو چھیڑ دی،

——— "میں اس درمیان میں شادی کے متعلق غور کرتا رہا ہوں مارجوری۔۔۔۔۔۔؟

——— "میں نے بھی اس پر غور کیا، اور خوش ہوں کہ تم نے میرے جذبات کا مجھ سے زیادہ بہتر اندازہ کیا۔ اور تمہاری دانشمندی کی معترف ہوں کہ یہ بہت ہی بہتر ہوا"

مارجوری نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا

——— "لیکن مارجوری ——— ولیم بولا

مارجوری نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا

——— "ہاں! تم سفر کی تکان کی وجہ سے کچھ خستہ ہو رہے ہو، شراب حاضر ہے، میں امید کرتا ہوں کہ تم اکثر ملاقات کی تکلیف گوارا کر سکو گے، میں دوستوں سے ملکر بہت خوش ہوتی ہوں،

——— "بہت بہتر! شکریہ"

ولیم یہ کہکر مارجوری کی حالت کا اندازہ کرنے لگا، اس کو معلوم ہوا کہ مارجوری اس کے اس فیصلے سے بہت خوش ہے۔ اس احساس نے اسے پھر اپنے قدیم فیصلہ کی اہمیت یاد دلائی۔ اور وہ نہایت خوش و خرم دیدار دوست سے سرفراز ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کاش ولیم عورت کے جذبات سمجھنے کی صلاحیت رکھتا!۔۔۔۔۔۔

تین برس تک ان دونوں نے اپنی زندگی نہایت سکون کے ساتھ گذاری، ہفتہ میں دو ایک بار ملاقات بھی ہوا کی۔ لیکن یہ محض دوستانہ ملاقات تھی۔ اس درمیان میں کوئی کبھی محبت کے الفاظ بھی زبان پر نہ لایا اور حقیقت یہ ہے کہ ولیم نے یہ مدت نہایت اطمینان اور چین سے گذاری: لیکن تین برس کے بعد مارجوری نے اچانک ایک دوسرے نوجوان سے شادی کر لی، اور ولیم کے دل کو بری طرح مجروح کر دیا۔ مگر ولیم نے اس مصیبت کا مقابلہ نہایت صبر سے کیا، اور دلاسا کہ "میں نے عورتوں کی فطرت کو سمجھا تھا، اس میں شک نہیں کہ مارجوری سے شادی نہ کر کے میں نے نہایت دوراندیشی سے کام لیا، آخرکار وہ اپنی تمام صفتوں کے باوجود عورت

ہی تو تھی۔ جنکی سرشت میں بے وفائی ہے" اس نے سوچا کہ مارجوری سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ نہایت ہی دوراندیشی کی دلیل ہے اور وہ اس فیصلہ کے لئے قابل مبارکباد ہے!......

لیکن غم و غصہ کے جذبات کے باوجود، ولیم کے دل سے مارجوری کی چاہ نہ جا سکی، اور وہ دو تین ہی مہینے میں گھل گھل کر کانٹا ہو گیا! ـــــــ وادی کے باشندے اس کی اس نامعلوم بیماری سے جس نے اس جیسے حسین و تنومند نوجوان کو اتنا جلد مریض جان بلب بنا دیا، حیرت و افسوس کرتے تھے۔ آہ! انہیں کیا معلوم کہ ان کا ولیم ایک ایسے مرض میں مبتلا تھا جو اپنے مریضوں کو یوں ہی گھلا گھلا کر لقمۂ گور کر دیتا ہے!

ابھی مارجوری کی شادی کو کچھ زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ایک رات ولیم نے دروازہ سے دستک کی آواز سنی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مارجوری بستر مرگ پر اسکے دیدار کی تمنائی ہے! ـــــــ ولیم نے بغیر غور و خوض کئے ہوئے فوراً دیوانہ وار اسکے گھر کی راہ لی، جس وقت وہ مارجوری کے مکان پر پہنچا اس کی حالت ابتر ہو چکی تھی، لیکن چند لمحوں تک تنہائی میں ملاقات کا موقع ملا، اور مارجوری نے ولیم کی آغوش میں ـــــــ جس کی سعادت آج اسے پہلی اور آخری بار نصیب ہوئی تھی ـــــــ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی!

الوداع

ماہ و سال گذرتے گئے، دنیا میں بہتیرے انقلاب برپا ہوئے، کہیں بغاوتیں ہوئیں کہیں نئی نئی ایجادیں، دلکش تماشوں اور قابل قدر ڈراموں سے انسانوں کی دلچسپی بڑھتی گئی، الغرض دنیا کے گوشے گوشے میں کچھ نہ کچھ تازہ واقعات ضرور رونما ہوئے، لیکن وہ وادی اور ہل جس میں ولیم مقیم تھا فطرت کی معجز نمائی سے اپنے قدیم رنگ و روپ پر قائم رہا؛ ولیم اب ضعیف ہو چکا تھا، اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ بال سفید ہو چکے تھے، لیکن آنکھوں میں بینائی اور بدن میں کافی طاقت باقی تھی، اب اس کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا، لوگ اس کی باتیں سنتے اور اس کے تعجب انگیز خیالات پر حیرت کرتے، اکثر فلسفیوں اور پروفیسروں نے اس کے تخیلات اور نظریات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور شائقین نے اس نئے مفکر کو شہروں میں دعوت دی، ڈاکیہ ہر روز دعوتی خطوط ضرور لاتا، لیکن ولیم انہیں پڑھکر حسرت سے علیٰحدہ کر دیتا، اور بولتا "آہ تم وقت گذر جانے کے بعد آئے ہو، اب میں ایک مردہ آدمی ہوں، میں نے اس دنیا میں کچھ دن زندگی گذاری ہے لیکن کب ہی مر بھی چکا، آج سے پچاس برس قبل تم میرے دل کو باغ باغ بھی کر سکتے تھے، مگر اب تمہیں پاکر مجھے کوئی طمع نہیں ہوتی، بڑی عمر پانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں پاتا، طویل عمر اور بڑی ہوس میں صرف تھوڑا سا فرق ہے ـــــــ یعنی دعوت میں شیرینی اخیر میں ملتی ہے! ـــــــ بچپن میں کائنات عالم کو دیکھکر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ قابل دید اور حیرت انگیز شئے دنیا ہے یا میں اب مجھے معلوم ہو گیا کہ دنیا نہیں بلکہ میں ہی حیرت انگیز اور قابل دید ہستی ہوں!

ولیم اب تک اپنے قدیم وضع اور عادات پر قائم تھا، ہاں اب وہ خاموشی پسند ہو گیا تھا اور جب لوگ بحث و مباحثہ کرتے تو ایک ناقدرانہ آمیز تبسم کے ساتھ چپ چاپ ان کی باتیں سنا کرتا؛ جب کوئی خاص کر اس سے استفسار کرتا تو صاف اور سیدھی بات چند الفاظ میں کہتا، حسین اور دلکش چیزیں اسے محو دید رکھتیں۔ اور وہ کہا کرتا کہ میں اتنا زیادہ جی چکا ہوں کہ سیارہ کے مقابلے میں شمع کی زیادہ توصیف کرنے کا اہل ہو گیا ہوں!

اکثر دین برس کے عمر میں، ایک رات وہ اچانک نیند سے بیدار ہوگیا، اس نے اپنے دل ودماغ میں کچھ ایسے ہی بے چینی محسوس کی کہ سونے کی بجائے صحن میں جا بیٹھا، رات اندھیری تھی، ایسی اندھیری کہ آسمان پر ایک ستارہ بھی نظر نہ آتا تھا، دریا کے موجوں کی چلنے کی آواز آرہی تھی، اور ہوا پہاڑی پھولوں سے بسی ہوئی تھی ——— معلوم کیوں ولیم کی طبعت آج غیر معمولی طور پر اداس ہورہی تھی اور اُس کا جی بے اختیار رونے کو چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں اکثر گذشتہ واقعات کی تصویر گھومنے لگی، ——— بچپن کے دن ——— مسافر سے تبادلۂ خیالات کی رات ——— والدین کی وفات ——— مارجوری کی ملاقات اور اسی قسم کے دوسرے واقعات جو عوام کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، لیکن اگر غور کیا جائے تو انہیں معمولی واقعات سے انسانی زندگی کی شیرازہ بندی ہے ——— کی یاد اس کے دل میں تازہ ہوگئی اور وہ انہیں خیالات میں کافی دیر تک غرق رہا،

آدھی رات کے قریب اس کے کانوں میں مردہ باپ کے پکارنے کی آواز آئی، ولیم گھبرا کر پلنگ سے اچھل پڑا، اور غور سے سننے لگا، اس نے اندازہ کیا کہ دریا کے پانی کی آواز کے علاوہ اور بھی ایک آواز ہے، گویا تیز رو گھوڑوں سے کھنچی ہوئی کوئی گاڑی دروازے کی طرف آرہی ہے، لیکن یہ گاڑیوں کے چلنے کا کوئی وقت نہ تھا، اس لیئے ولیم نے اس کا کوئی خیال نہ کیا اور پڑا رہا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر وہی آواز سُنی، اب اس نے سوچا کہ بہتر ہے کہ دروازہ کے پاس جاکر رفع شک کرے، اور چلا گیا، دروازہ زیادہ دور نہ تھا، لیکن ولیم کو وہاں تک پہنچنے میں کافی دیر لگ گئی، راستہ میں اسے ایسا محسوس ہوا کہ چاروں طرف مردے گشت کر رہے ہیں، اور قدم قدم پر وہ اس کا راستہ روکنے کیلئے کوشاں ہیں، چنانچہ وہ بچ بچ کر آہستہ آہستہ جا رہا تھا ———

یکایک اسے نہائت دھیمی دھیمی خوشبو محسوس ہوئی! ——— یہ خوشبو، مارجوری کے دلپسند پھولوں کی تھی، جو مارجوری کی وفات کے بعد سے پھر کبھی لگائے نہ گئے تھے، ———

——— میں بھی کسقدر وہمی ہوتا جارہا ہوں، آہ اب مارجوری اور اس کے پھول کہاں نصیب؟" ولیم نے حسرت سے کہا، اور سامنے نظر اٹھا کر دیکھا، اب اُسے ایک دوسرا حیرت انگیز منظر نظر آیا، مارجوری کبھی جس کمرے میں رہتی تھی، اس کی دریچی سے وہی ہلکی نارنجی روشنی دکھائی دے رہی تھی، یہ کیفیت تھوڑی ہی دیر تک رہی، لیکن اس نے ولیم کو بیحد متردد کردیا۔ اُس نے آنکھیں پونچھ کر پھاٹک کی طرف غور سے دیکھا، وہ دیر تک اندھیرے میں اپنے خیالات میں کھویا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، جب وہ اپنے تخیلات سے آزاد ہوا تو پھر سڑک پر گاڑی کے چلنے کی آواز آئی، وہ فوراً پھاٹک کی طرف بڑھا، دفعتہً اس کی نظر ایک اجنبی پر پڑی جو اس کی جانب لپکا ہوا چلا آرہا تھا، اس کے پیچھے سڑک پر ایک گاڑی بھی کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، اسی اجنبی نے قریب آکر دریافت کیا

"مسٹر ولیم جناب ہی ہیں نا؟"

"جی ہاں کیا ارشاد ہے"

میں نے تمہاری بڑی شہرت سُنی ہے؛ اور اپنی کثیر مشغولیتوں کے باوجود تمہاری صحبت میں دو ایک جام شراب پینے کے خیال سے آگیا ہوں، رخصت ہونیکے قبل میں تم سے اپنا تعارف بھی کرا دونگا!"

ولیم اجنبی کو لیکر کمرے میں داخل ہوا، شمع روشن کی، اور شراب کی بوتل کا کاگ کھول کر ٹیبل پر رکھدیا، ولیم کی طبیعت منتشر تھی، وہ کچھ کھویا سا تھا، اور اس کا دل بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اس بیوقت کی ملاقات پر غور نہ کرسکا۔

اُس کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ گویا وہ گہری نیند میں ہو سب
کچھ کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ اجنبی کے چہرے کی طرف تعجب کی
نگاہ سے دیکھ رہا تھا، اس کوشش میں اس نے چند بار روشنی
اس کی جانب بڑھانی چاہی لیکن وہ اُسے اچھی طرح دیکھ نہ سکا،
شاید اس کی بینائی میں بھی اسوقت کچھ فرق آگیا تھا، ہاں ٹیبل
پر اجنبی کے جسم کا سایہ اسے نظر آیا، وہ شراب جام میں ڈال
رہا تھا۔ اور غور سے اس بھیانک سائے کو دیکھتا جاتا تھا،
یہاں تک کہ اس نے اپنے دل کے قریب کچھ بوجھ سا محسوس
کیا، اب اس کے کانوں میں دریا کی موجوں کے چلنے کی آواز
بھی نہیں آرہی تھی، بلکہ خود اس کے دل کی بڑھتی ہوئی رفتار
کی آواز سے اس کے کان بہرے ہو رہے تھے۔ اجنبی نے
شراب ولیم کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم بھی پیو"

"بہت بہتر!" کہکر ولیم نے شراب جس کا مزا کچھ اترا
ہوا سا تھا، پی لی،

"میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑے خود رائے آدمی ہو!"

ولیم نے ایک ہلکے سے تبسم سے اجنبی کے اس
خیال کی تائید کی،

میں بھی بہت خود رائے واقع ہوا ہوں، مجھے دوسروں
کے جذبات کو کچلنے میں بڑا مزا آتا ہے، اور اپنے سوا کسی دوسرے
کی بات کا پاس نہیں رکھتا، میں نے بڑے بڑے بادشاہوں
سپہ سالاروں ادیبوں اور شاعروں کے خبط کو خاک میں ملا دیا ہے
—— ہاں! اور اگر یہ کہوں کہ آج تمہارے پاس بھی اسی
غرض سے آیا ہوں کہ تمہیں بھی کچھ سبق سکھاتا جاؤں تو تم
کیا کرو گے؟"

ولیم اجنبی کی اس خواہ مخواہ شرارت سے رنجیدہ ہو کر
اسے کچھ سخت جواب دینا چاہتا تھا کہ لیکن وہ ایک کاروباری
آدمی تھا۔ اور درشتی اسکی عادت کے خلاف تھی، اس لئے
وہ پھر مسکرا کر چپ ہو رہا۔

مسٹر ولیم! میرے دل میں تمہاری بڑی وقعت ہے
لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو اپنی قیام گاہ اور موجودہ سامان
زیست پر بڑا ناز ہے .... سنو میں آج تمہارا غرور
توڑنے آیا ہوں، یعنی تم کو اپنے ساتھ لیجانے کا خیال
رکھتا ہوں!"

یہ مجھے بالکل نامنظور ہے، میں نے ایک عمر اسی جگہ
اور اسی طرح کاٹی ہے، خود شیطان بھی آئے تو مجھے یہ جگہ
چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتا، لیکن تم بڑے دلچسپ آدمی
معلوم ہوتے ہو، پھر بھی میں پوری ایک بوتل شرط لگا کر
کہتا ہوں کہ تم اپنی کوشش ایک امر محال کے لئے صرف
کر رہے ہو،" ولیم نے فیصلہ کن انداز سے جواب دیا؛
لیکن اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے آنکھوں کی روشنی زیادہ
دھندلی ہوتی جارہی ہے، اس نے دیکھا کہ اجنبی اس کے
چہرے کی طرف گہری نظریں جمائے ہوئے ہے، اُسکی اس
حرکت سے وہ کچھ چڑ گیا، لیکن پھر بھی اس نے نرمی سے
کہا ——

"یہ نہ سمجھو کہ میں یہاں سے اس لئے نہیں جانا چاہتا ہوں
کہ مجھے دنیا کی کسی شئے سے خطرہ محسوس ہوتا ہے، خدا جانتا
ہے، کائنات عالم کی نیرنگیوں سے میرا دل ٹوٹ چکا ہے،
رہ گیا سفر کا معاملہ تو میں ایک اتنے بڑے سفر کا انتظار کر رہا
ہوں کہ جس کی دوری کا اندازہ تمہارے وہم میں بھی نہیں
آسکتا۔ اُس سفر کا وقت جب کبھی آگیا تو میں خوشی سے
آمادہ ہو جاؤنگا۔

اجنبی نے جام شراب خالی کر کے میز پر رکھدیا، اور ولیم
کے بازو پر اپنی انگلی سے ہلکی ہلکی دو تین ضربیں لگاتے ہوئے کہا

"وہ وقت آگیا ہے!"

"اس گفتگو سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میری طرف نظر اٹھاؤ! تمہاری نظر گھبرا رہی ہے، تمہارے ہاتھ بے حس ہو رہے ہیں، مسٹر ولیم! حقیقت یہ ہے کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے!"

"کیا تم کوئی ڈاکٹر ہو؟"

"میں تمام ڈاکٹروں سے بہتر ڈاکٹر ہوں، کیونکہ ایک ہی نسخہ سے جسم و روح دونوں کا علاج کر دیتا ہوں!"

"مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں!"

"مسٹر ولیم! ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اسے خود کو پیچھا دیکھنا پڑتا ہے، تم چونکہ عقلمند اور خلوص آدمی تھے، اس لئے تمہیں قدرت نے اس دن کی تیاری کے لئے زیادہ مدت عطا فرمائی، تم نے کائنات عالم کا کافی مشاہدہ کر لیا، لیکن اب تمہاری مہلت ختم ہو گئی، اور تمہیں فوراً میرے ساتھ روانہ ہو جانا چاہیئے!"

"تم تو عجیب طرح کے ڈاکٹر معلوم ہوتے ہو؟"

— — میں فطرت کا لازوال اصول ہوں، مجھے اکثر آدمی "موت" بھی کہتے ہیں"

———— "آہ! تم نے شروع ہی میں یہ کیوں نہیں کہہ دیا تھا، میں ایک مدت سے تمہاری آمد کا مشتاق تھا، آؤ ہاتھ ملائیں، خوش آمدید"

———— میرے کاندھے پر جھک جاؤ، کیونکہ اب تمہارے اعضاء بے قابو ہو رہے ہیں؛ ہاں اپنا سارا بار مجھ پر ڈال دو، کیونکہ میں دیکھنے میں تو بوڑھا معلوم ہوتا ہوں، لیکن پھر بھی کافی طاقتور ہوں، یہاں سے میری گاڑی صرف تین قدم پر کھڑی ہے، اس پر پہنچ کر تمہاری ساری شکایتیں دفع ہو جائینگی۔ مسٹر ولیم! میں ایک مدت سے تمہارے لئے بیقرار تھا۔ اتنا بیقرار تھا کہ کوئی اپنے بچے کیلئے ہو سکتا ہے، مجھے اپنی زندگی میں بیشمار آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن تمہاری ملاقات سے مجھے سب سے زیادہ مسرت ہوئی۔ میں کسقدر سخت واقع ہوا ہوں، بعض لوگ ابتدا میں میرے متعلق خراب رائے قائم کر لیتے ہیں، مگر تمہارے جیسے آدمی کیلئے بہترین دوست ہوں"

———— خدا گواہ ہے کہ جب سے ماجوری نے مجھے خیرباد کہا ہے میں سچے دل سے تمہاری دستگیری کا طالب رہا ہوں"

اسکے بعد دونوں سفر پر روانہ ہو گئے، ولیم کے بغل والے کمرہ میں ایک نوکر کراہنے کی آواز سنکر لپکا ہوا ولیم کی پلنگ کی طرف آیا، لیکن ولیم اپنے سفر پر جا چکا تھا! ———— فقط

لمعاتِ اختر

از جناب اختر ماہ پوری

ترچھی نظر سے بزم میں دیکھا نہ کیجئے
اپنی نگاہِ ناز کو رسوا نہ کیجئے

میری نگاہِ شوق ہے آئینہ جمال
اپنے حسین عکس سے پردا نہ کیجئے

کہتی ہے عقل مجھ سے یہ ہنس ہنس کے بار بار
دنیائے رنگ و بو کی تمنا نہ کیجئے

اس راہ میں مذاق ہے رفتار کا کچھ اور
انجام کارِ عشق کو سوچا نہ کیجئے

رازِ نہاں نہ کیجئے ظاہر جنون میں
دلکی تڑپ کو نذرِ تماشا نہ کیجئے

حسنِ عمل کو جوش میں بڑھتے ہی جائیے
جلووں میں کھو کے دل کا تماشا نہ کیجئے

درد و سکوت یا نون کا اظہار ہے فضول
اختر جوان آنکھوں کو رسوا نہ کیجئے

پھولوں کا بادشاہ

فصیح الفصحاء علامہ شفق رضوی مینائی کے خامۂ گلفشاں سے

اے خامہ آج چن کے ریاضِ سخن کے پھول
بو جسکے آگے دے نہ سکیں نارون کے پھول
خوش رنگ و خوشنما وہ بصد آب و تاب ہے
کھل جائیں تازہ فکر سے شاخِ کہن کے پھول
بیرنگ جسکے سامنے ہوں یاسمن کے پھول
پھولوں کا بادشاہ چمن میں گلاب ہے

شاخوں سے گر گئے تھے خزاں میں جو برگ و بار
باغِ جہاں میں آگئی پھر حیت کی بہار
کتنا حسین غازۂ رنگِ شباب ہے
ہونے لگا ہے اُن کا نئے سر سے پھر نکھار
کرنے لگی عروسِ چمن پھر نئے سنگار
پھولوں کا بادشاہ چمن میں گلاب ہے

لہرا رہا ہے سبزۂ خودرو کنارِ جو
سُنبل کے تار تار ہیں گیسوئے مُشکبو
نازک مزاج شاہدِ رنگیں نقاب ہے
ہے تازگی شگوفوں میں شاخوں میں بھی نمو
لالے کے پھول سامنے اِسکے ہیں زرد رُو
پھولوں کا بادشاہ چمن میں گلاب ہے

قدرت نے اسکے چہرے پہ چھڑکا ہے وہ شہاب
کانٹوں میں رہ کے بھی ہے شگفتہ با آب و تاب
ہمدم نسیمِ صبح۔ صبا ہم رکاب ہے
یاقوت گرد، لعل بدخشاں ہو آب آب
شبنم نثار کرتی ہے اِس پر دُرِ خوش آب
پھولوں کا بادشاہ چمن میں گلاب ہے

ہر برگ اِس کا دفترِ عرفاں کا ہے ورق
ہر گُل کا اِس کے سامنے ہوتا ہے رنگ فق
خوشبو میں فرد۔ رنگ میں بھی لاجواب ہے
گویا دلیل صنعتِ باری کا اِک سبق
آگے اب اور کیا کہوں المختصر شفق
پھولوں کا بادشاہ چمن میں گلاب ہے

صحت

(از جناب جنرل منیجر صاحب "صحت گھر" بانکی پور پٹنہ)

ہمارا کام

(۱) پبلک کو صحت قائم رکھنے کے لئے حسب ضرورت مفید ہدایات دینا۔

(۲) بیماروں کو صحیح طبی مشورہ اور علاج بتانا۔

(۳) غیر مقامی مریضوں کے حالات پر غور و فکر کرنے کے بعد صحیح مشورہ دینا۔

(۴) اصلی اور صحیح اجزا کے ساتھ دوائیں مہیا کرنا۔

(۵) مناسب جگہوں میں حسب ضرورت و استطاعت طبی امداد پہنچانا۔

(۶) تجربہ شدہ اور کامیاب دواؤں سے پبلک کو آگاہ کرنا۔

ہمارے یہاں طبیہ کالج مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم دہلی کے مستند قابل تجربہ کار اور ماہر طبیب مقامی مریضوں کی دیکھ بھال اور غیر حاضر مریضوں کے حالات پر غور کرتے اور مشورہ دیتے ہیں۔

خاص امراض کے متعلق خط و کتابت بالکل پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

امراض کے متعلق مشورہ مفت حاصل کیجئے جواب کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

آپ کا خادم
منیجر

جس نے آنکھیں کھوئیں اُس نے سب کچھ کھویا

کحل بصر جواہر والا

بینائی کی حفاظت کرنا، آنکھوں کو صاف رکھنا، پانی روکنا اور سرخی کو زائل کرنا اس کا خاص فعل ہے۔ بچے بوڑھے سب کے لئے مفید ہے بطور سرمہ دو دو سلائی سوتے وقت دونوں آنکھوں میں لگائیے۔ جواہرات ملائے گئے ہیں۔ قیمت فی شیشی جو مہینوں کیلئے کافی ہے ۱۲ر

کحل زرد جواہر والا

نظر کی کمزوری، دور یا نزدیک کی چیزوں کا صاف نہ دکھائی دینا، دھندلا پن پانی گرنا اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے، عینک اُتر جاتی ہے، عینک والے حضرات اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لطف یہ ہے کہ اس سرمہ کا رنگ سیاہ نہیں ہے اس لئے لگانے کے بعد سرمہ دوسروں کو نظر نہیں آتا، جواہرات سے تیار کیا گیا ہے۔ قیمت فی شیشی عہ ر

کحل پیران

آنکھوں کی روشنی بڑھاتا ہے، دھند کو صاف کرتا ہے، پانی کو بند کرتا ہے خاص طور پر بوڑھوں کے لئے تیار کیا گیا ہے اسکے استعمال سے موتیابند نہیں ہوتا بڑھاپے میں آنکھوں کی مجبوری سے بچاتا ہے۔ عجیب و غریب چیز ہے سوتے وقت اور صبح دو سلائی آنکھوں میں لگائیں۔ قیمت بہ خاص رعایت فی شیشی ۸ ر

کحل جالا

ہسپتال کی دقتیں نہ اٹھائیے آپریشن کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ سرمہ جالا، پھولا، ناخونہ کو چند دن میں کاٹتا ہے بہتیرے لوگ اس سے بینا ہو چکے قیمت فی شیشی عہ ر

نوٹ

کوئی تین شیشی سرمہ اکٹھا منگانے پر محصول ڈاک "صحت گھر" ادا کرے گا

خط و کتابت کا پتہ۔ جنرل منیجر "صحت گھر" بانکی پور۔ پٹنہ

نپولین کا خط اپنے بیٹے کے نام

ایک سبق آموز سیاسی مقالہ

از جناب ربط ہاشمی ۔ فاضل ادب

نپولین "سینٹ ہلینا" میں قید و بند کی زندگی گذار رہا تھا۔ اور روز بروز اس کی صحت زبون ہوتی جارہی تھی۔ قید کے ایام میں بھی اس نے اپنی بے نظیر جرأت وہمت سے کام لیا۔ تکالیف وآلام سے وہ کبھی ہراساں نہ ہوا۔ وطن پرستی کا جذبہ اس کے رگ وپے میں ساری تھا۔

"سینٹ ہلینا" میں بھی وہ خاموش نہ بیٹھ سکا۔ گاہے گاہے فرانسیسیوں کیلئے ہدایات بھیجا کرتا تھا۔ حب الوطنی، اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چنانچہ ۱۰/اپریل ۱۸۲۱ء کے دن جبکہ اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی اور اس کے ایام زیست بہت مختصر رہ گئے تھے۔ وہ بیحد ناتوان ہوگیا تھا۔ کچھ لکھنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تو اس نے "کونٹ مونتھولون" Count Montholon کو بلوایا۔ اور اس کو ہدائت کی کہ جو کچھ وہ بولتا جائے۔ وہ اسے قلمبند کرے۔ تاکہ اس کا پیغام اس کے بیٹے تک پہنچانے میں کاؤنٹ کو کوئی دقت نہ ہو اور بعض باتیں کہیں بھول نہ جائے۔ اس نے اس طرح لکھوانا شروع کیا۔

:———— "میرے لڑکے کو میرے انتقام کیلئے متفکر نہ ہونا چاہیئے۔ اس سے اسے بڑا فائدہ ہوگا۔ اسے میرے کارناموں کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری زندگی کے بیش بہا تجربات اور کارناموں کو فراموش کردے۔ نہیں، اسے ہمیشہ میرے کارناموں کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اسی میں اس کی فلاح وبہبود ہے۔ اسے میری تقلید کرنی چاہیئے۔ وہ میرا نمونہ بن جائے۔ جس طرح میں ہر ہر قدم پر ایک بہادر وطن پرست فرانسیسی تھا۔ ٹھیک اسی طرح میرے بیٹے کو بھی ہونا چاہیئے۔ اسکو اپنی پوری طاقت صرف اس بات کے لئے صرف کردینی چاہیئے کہ وہ امن وسکون سے حکومت کرسکے۔ اگر بلا ضرورت اور بغیر کسی احتیاج کے اس نے میری بافہمانہ جنگوں کا آغاز کردیا تو وہ نرا احمق ثابت ہوگا۔ اسے امن وسکون اور صلح وآشتی سے حکومت کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے کئے ہوئے کاموں کو از سرنو پھر کرنا تحصیل حاصل، اور محض تضیع اوقات ہے۔ بلکہ اسے لازم ہے کہ وہ میرے ادھورے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہونچائے۔ اسی سے اس کی عالی حوصلگی اور دانش کی داد دیجائیگی۔ اور یہی کام اس کے لئے زیبا اور موزون بھی ہے۔ ایک ہی چیز ایک ہی صدی میں دوبارہ نہیں کی جاسکتی۔

میں نے ہمیشہ اپنے مخالفوں کو پہلے صلح کا پیام دیا۔ لیکن جب جنگ کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو پھر مجبوراً میں نے جنگ کی اور اسطرح کی کہ سارے یورپ نے میرا لوہا مان لیا۔ سب ہی میرے طاقت کے سامنے سرنگون ہوگئے۔ اس عہد میں بھی ایک طریقہ

موثر بھی تھا۔ جسکی وجہ سے میری عظمت و جبروت کا سکہ یورپ کے قلوب پر ایسا بیٹھا کہ میرے نام سے وہ کانپ اٹھتے ہیں۔

در اصل میں نے فرانس کو ایک ہیبتناک تباہی سے بچا لیا اور اسے زمین سے اٹھا کر ہفت آسمان پر پہنچا دیا۔ اس کی عظمت و سطوت کے سب معترف ہو گئے۔ میں نے یورپ میں جدید اور روشن خیالات کی ایک ایسی مستحکم بنیاد کھڑی کر دی ہے کہ جسکا انہدام ناممکن ہے۔ میرے لڑکے کو چاہیئے کہ وہ میری تخم ریزی کے ثمرہ سے بہرہ مند ہو۔

اسکی حالت دیانا Vienna میں بہت ہی قابل رحم اور افسوسناک ہے۔ کیا آسٹریا والے اسے بغیر کسی شرط کے آزاد کر دینگے؟۔ میرے لڑکے کو چاہیئے کہ وہ کسی بیرونی اور غیر ملکی اثر و اقتدار کے ماتحت تخت شاہی پر متمکن نہ ہو۔ حکم رانی ہی اس کا مقصد وحید نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کے پیش نظر خاندانی روایات بھی ہوں۔ جنپر وہ عمل پیرا ہو سکے۔ اسے میرے خاندان کے ساتھ محبت و مودت کا رشتہ ہمیشہ استوار رکھنا چاہیئے۔ جب کبھی وہ برسر اقتدار ہو تو اسے میرے خاندان والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔ "جوزف" اور "ایگین" اس کو مفید مشورہ دے سکتے ہیں "ہورٹنس" اور "سولائن" بہترین عورتیں ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کی دوستی سے اسے ہمیشہ بہت بڑی استعانت ملتی رہیگی۔ اگر اسے آزادی نصیب نہ ہو اور وہ ہمیشہ فرانس سے جلا وطن ہی رہے تو پھر اسے میری بھتیجیوں میں سے کسی ایک کیساتھ شادی کر لینی چاہیئے۔ اور اگر فرانس پھر اسے طلب کرے تو اسے روس کی شہزادی سے رشتہ مناکحت منسلک کرنا چاہیئے۔ اسی کی قرابت مندی حکومت اور سلطنت میں معین و مددگار ثابت ہوگی۔ جس سلطنت سے بھی وہ معاہدہ کرے اس سے وہ فرانس کی خارجی طاقت و قوت کو بڑھانے میں مدد لے۔ کبھی بھولکر بھی بیرونی اثر و رسوخ کو اپنے کونسل میں داخل نہ ہونے دے۔

میرا بیٹا چند در چند صعوبات و مشکلات کے بعد ترقی کی اعلیٰ منزل پر گامزن ہوگا۔ فرانسیسی اس کے دشمن نہیں ہیں۔ اسے صرف ایک جماعت سے ہوشیار رہنا چاہیئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ "ڈیوک آف اورلین" کی جماعت ہے۔ یہی پارٹی عرصہ دراز سے ہمارے خاندان کی جڑ کھوکھلی کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر چند جماعتیں بھی معاندانہ روش اختیار کر لیں تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ میرے لڑکے کو صرف عوام الناس کا طرفدار اور خیر خواہ ہونا چاہیئے۔ عوام اگر طرفدار رہینگے تو کوئی متنفس بھی کچھ بگاڑ نہ سکیگا۔ اگر ان سے کوئی تقصیر بھی ہو جائے تو در گذر کرنا چاہیئے۔ اور ان کی لیاقت، قابلیت، ہنر، سلیقہ، خدمت، ذکاوت، ہمت اور بہادری کے لحاظ سے انکو اعلیٰ مراتب اور عزت سے سرفراز کرنا چاہیئے۔

فرانس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں سرداروں اور امرا کے اختیار بہت ہی محدود ہیں۔ یہاں صرف عوام کی طاقت، طاقت کہلاتی ہے۔ حامیوں اور روساء پر اعتماد کرنا گویا ریگ پر عمارت کی تعمیر کرنی ہے۔ یہاں بڑا سے بڑا کام صرف عوام کی مدد سے کیا جا سکتا ہے اس لئے میرے لڑکے کو عوام کی ہمدردی ہمیشہ اپنی طرف مبذول رکھنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ انکو اپنا مخالف اور دشمن نہیں بنانا چاہیے۔ میں نے فرانس پر حکمرانی وہاں کے شرفاء، امراء اور سرداروں کی حمایت سے نہیں۔ بلکہ عوام الناس کی مدد و استعانت سے کی ہے۔

میری شرافت میرے لڑکے کے لئے سود مند اور نفع بخش ثابت نہ ہوگی۔ میری شرافت، میرے جیسے اخلاق، اطوار و جرات کے حصول کے لئے ابھی پشتہا پشت کی ضرورت ہے۔ میں نے کبھی اپنی شرافت و نجابت یا کسی مارشل اور کمانڈر پر اعتماد نہیں کیا۔ میں ہمیشہ عوام الناس کی طرفداری اور حمایت کا خیال رکھتا تھا۔ مجھے عوام الناس پر بھروسہ تھا۔ اور مجھے کبھی اس اعتماد میں

فریب خوردگی کا موقع نہ ملا۔

اسمبلی میں وہی لوگ حکم رانی کرتے ہیں جو بڑے مقرر ہوتے ہیں۔ ان کی تقریر تمام ممبروں کو موہ لیتی ہے۔ اور ممبران اسمبلی کی ہمدردی انہی کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ پھر وہ لوگ انہیں کو ووٹ بھی دیدیتے ہیں۔ مزہ یہ ہوتا ہے کہ انہی کو جیت ہو جاتی ہے چاہے وہ سراسر ناحق ہی پر کیوں نہ رہے ہوں۔ ان پر قابو اور فتح پا لینے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ جس وقت وہ اپنی دھواں دھار تقریروں اور موثر مضمونوں سے اسمبلی کے ممبران کو اپنی طرف مائل کرنے میں کوشاں ہوں تو میرے بیٹے کو چاہیئے کہ وہ منطقی دلائل سے ساکت کردے۔ میں ہمیشہ انہیں اسی آسان اور معمولی منطقی دلیل سے شکست دیتا رہا ——— " دو اور دو ملکر چار ہوتے ہیں " ———

میرے لڑکے کو لازم ہے کہ وہ ہر شخص کی باتوں کو بہت غور سے سنے اور اپنی مخالفت سے کبھی ہراساں نہ ہو۔ اس ترکیب سے انسان حقائق اور واقعات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور صداقت کی راہ ان پر منکشف ہو جاتی ہے۔ فرانسیسیوں میں دو چیز کا جذبہ بہت جلد موجزن رہتا ہے ——— آزادی کی محبت اور تفوق مراتب کا خیال۔ ایک ہوشیار حکومت نہایت سہولت سے ان دونوں چیزوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اور یہ صرف انصاف سے ممکن ہے۔ گورنمنٹ کا حکم اور قانون سب کے لئے یکساں اور مساوی ہونا چاہیئے۔ مراتب اور عزت سے مزوران لوگوں کو سرفراز کرنا چاہیئے۔ جو لوگوں کی نگاہ میں اس کے قابل اور اہل ہوں۔ اگر نااہلوں کو مراتب اور درجے ملے اور لائق اس سے محروم رہ گئے تو یقیناً سلطنت کے نظام میں کچھ دنوں بعد ابتری اور فساد برپا ہو جائے گا۔ اس لئے اہل کمال کو عزت سے سرفراز کرنا اپنی ہی سلطنت کی بنیاد کو مستحکم کرنا ہے۔ اور نااہلوں اور نادانوں کو درجات سے نوازنا سلطنت کی جڑ کو اپنے ہی ہاتھوں سے کھوکھلی کرنے کے مترادف ہے۔

میرے لڑکے کو پریس کی آزادی بطیب خاطر منظور کر لینا چاہیئے۔ موجودہ زمانہ میں "مطبع" کی آزادی بہت ضروری اور اہم شئے ہے۔ مگر ہر حالت میں گورنمنٹ اس کی نگراں ہو۔ تاکہ ملک میں ٹھوس تعلیم اور اچھے اصول و قواعد کی اشاعت میں سہولت بہم پہونچ سکے۔ صحافت کو غیروں کے ہاتھوں میں سونپ دینا اور اس سے بالکل غافل ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی خوفناک غار کے دہانہ پر بے خبر محو خواب ہو۔ میں اگر زندہ رہتا تو اپنے خیالات کی اشاعت ملک کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں کرتا۔ پریس کے معاملہ میں ایک دستور العمل بنانا چاہیئے۔ جس کی ترتیب ملک کے مشاہیر عقلا اور دانشمندوں کی ہو۔ اسی دستور العمل کے مطابق پریس کو چلنا چاہیئے۔ یاد رکھو زمانہ تلون پذیر ہے۔ اس میں ہر لمحہ تبدیلی اور انقلاب رونما ہوا کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ تم قدیم دقیانوسی اور فرسودہ خیالات کی حمایت کرو۔ جو تین سو برس پیشتر کے لوگوں کے تھے۔ موجودہ زمانہ میں موجودہ ماحول کے مطابق تعلیم اور خیالات کی اشاعت ہونی چاہیئے۔

میرے لڑکے کو پرانے خیالات کا حامی نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ وہ موجودہ عہد کا ایک روشن خیال شخص ہو۔ قدیم چیزوں کی تقلید موجودہ دور میں بالکل بے سود اور عبث ہے۔ اسے ہر جگہ درسگاہوں کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ وہاں تعلیم و تعلم کا بہترین انتظام کرنا چاہیئے۔ علم ہی ایک ایسی شئے ہے جس کی روشنی میں انسان سچی اور سیدھی راہ پا لیتا ہے۔ اور اس سے فساد اور برائی کی جڑ منقطع ہو جاتی ہے۔ اور برائی بھلائی کے پرکھنے کی سمجھ آجاتی ہے۔

اسے عیسائیت اور تہذیب تمدن کی اشاعت ہر اس ملک میں جہاں غیر مہذب اور وحشی اقوام رہتی ہیں۔ ضرور

کرنی چاہیئے۔

میرے اعداء دشمنان انسانیت ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو غلامی کی بھاری زنجیروں کی بیڑیوں میں جکڑ دیں۔ ان کو وہ لوگ محض بھیڑوں کا گلہ تصور کرتے ہیں۔ ایسوں کے قلوب مادرِ وطن کی محبت سے بالکل عاری ہیں۔

وہ طریقہ جس سے میرے لڑکے کو معلوم ہوگا کہ اس کا انتظام سلطنت بہتر ہے کہ نہیں۔ یہ ہے کہ اسے مجرموں کی سزاؤں کی سالانہ رپورٹ مرتب کرانی چاہیئے۔ اور پھر سالانہ رپورٹ کے مرتب کے بعد اگر جرموں کی کثرت پائی جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ مصائب روزافزوں ترقی پذیر ہے۔ اور سلطنت کا نظم ونسق بہتر نہیں ہے۔ اسکی درستگی اور اصلاح کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر جرموں کی تعداد کم ہے تو نتیجہ خوش آئند ہے۔ اور سلطنت کا انتظام ملک کی فلاح کے عین مطابق ہے۔ اس میں ملک اور قوم دونوں کی بھلائی مضمر ہے۔

مذہبی خیالات کا اثر دماغوں پر بہت زبردست اور گہرا پڑتا ہے۔ اس لئے مذہبی خیالات کی ہمیشہ حمائت کرنی چاہیئے۔ پوپ کی حمائت سے بھی بہت بڑی قوت حاصل کیجا سکتی ہے۔ اس سے لاکھوں اور کروڑوں انسان پر بسہولت حکمرانی کیجا سکتی ہے۔ پوپ "پئیس" Pius ہمیشہ میرے لڑکے کے حامی رہینگے۔ وہ ضعیف انسان ایک عظیم المرتبت شخصیت کا مالک ہے مجھے افسوس ہے کہ "کارڈینل فیخ" Fesch مجھے سمجھ نہ سکا۔ اس نے ہمیشہ مذہبی دشمنوں کی حمائت کی۔

اگر تمہیں فرانس جانیکی کبھی اجازت مل جائے تو پھر تم دیکھو گے کہ اب بھی میرے فدائی ہزاروں کی تعداد میں وہاں موجود ہیں۔ جن کے قلوب مری یاد سے معمور اور آنکھیں میری جدائی میں اشکبار ہیں۔ مگر میری یادگار یہی ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ میرے ان تمام خیالات کو جنکا اظہار میں نے کونسل آف اسٹیٹ میں سلطنت کے باب میں کیا تھا ایک جا جمع کر کے میرے وزراء کو سکھا دیں اور پھر میرے نقش قدم پر چلیں۔

میرے لڑکے کو اکثر تاریخ کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔ اسے تاریخی واقعات اور شواہد کی بنا پر حقیقی روشنی حاصل ہو جائیگی ——— وہ صراطِ مستقیم کو پالیگا۔ اسے بڑے بڑے نامور اور جری کپتان اور جرنیل کے جنگی کارناموں کا مطالعہ کرنا بھی از بس ضروری ہے۔ اسے انکی جنگی قابلیت اور انکی جاں سپاری کو بھی بنظر تعمق دیکھنا چاہیئے۔ اس سے وہ جنگی قواعد واصول سے واقف ہو جائے گا۔ جنگی معلومات کی بہم رسانی کا یہی سب سے بہتر اور اعلیٰ ذریعہ ہے۔ لیکن جو کچھ وہ پڑھے یا کسی سے سنے وہ اسوقت تک اس کے لئے مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا جبتک کہ اسکے دل کی گہرائی میں نکوکاری کی حقیقی آگ روشن نہ ہو۔ مجھے امید واثق ہے کہ وہ اپنے خاندان کے نام کو اجاگر اور اپنے کو اپنے باپ کا حقیقی معنوں میں جانشین ثابت کریگا۔" (ماخوذ از ایبٹ)

غزل

از [illegible] کلکتہ

مانع لطف وکرم حسن جفا سوز ہوا
خوش نصیبی کہ یہ غم مجکو شب و روز ہوا

شکرِ صد شکر کہ اندازِ تغافل تیرا
میری ناکامئ دل کو سبق آموز ہوا

وجہ غیرت ہوئی بے مہریٔ قاتل ایسی
خون آنکھوں سے بہا بہکے زمیں دوز ہوا

لطفِ اندازِ ستم لذتِ ایذائے فراق
مرہم زخم جگر نالۂ جاں سوز ہوا

رات بھر شوقِ شہادت میں غضنفر گذری
ہنستیں مانی تھیں جسکو وہ نکی وہ روز ہوا

جذباتِ مُسلم

(از پروفیسر محمد مسلم صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل سینٹ کولمبس کالج ہزاری باغ)

کرم کہ آئے تم اور اشکِ غم بہا کے چلے
ستم کہ سوئی ہوئی حسرتیں جگا کے چلے

نکلتی دل کی ہوس یا تمہارے غمزے کی
یہ کیا کہ تیر اُچٹتا سا اک چلا کے چلے

اسے بھی ہو گیا ناز اپنی قدر و قیمت پر
جو دل پہ تیر ترے غمزہ و ادا کے چلے؟

نگاہ حسرتِ بسمل نے کر دیا بسمل
نمک چھڑکنے وہ آئے تھے زخم کھا کے چلے

فرشتہ موت کا بھی مسکرا دیا مُسلم
جب آنکھ میں بتِ کافر کو ہم چھپا کے چلے

خون کے آنسو

جناب جی۔ آر۔ قیس شیخپوروی

ناہید پیاری ــــــــــــــ!

تم میرے دکھ کی داستان سننا چاہتی ہو۔ میرے غم کا فسانہ سننا چاہتی ہو۔ میری موت کی کہانی سننا چاہتی ہو ــــــــــ آہ! میں کسطرح کہوں۔ میرے بس سے باہر ہے۔

پھر بھی میں اپنے جلے ہوئے دل کی گہرائیوں سے اُس آہ کو باہر نکالنے کی کوشش کرونگی۔ جو میرے تن من کو جلا رہی ہے۔ شائد اس سے کمبخت دل کی جلن کچھ کم ہوجائے۔ مگر وہ آہ نہیں نکل سکتی۔

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالوں میں۔
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والوں میں۔

میرے دل میں گرم خون کا ایک قطرہ باقی رہگیا ہے۔ تمہاری خاطر آج اُس خون کے قطرہ سے اپنے دل کی کہانی لکھتی ہوں۔ مگر آہ ــــــ

ــــــ آہ!!

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے۔
مگر مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی۔

میرے ہر ہر حرف اور ہر ہر نقطہ میں ویرانی، بربادی اور بے بسی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ کس کس کو روؤں۔ اور کس کس کا ماتم کروں۔

ــــــ؟

میری تو وہ مثال ہے۔ بقول شخصے: ــــــ
جگر کو، سینہ کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جان کو ـــ؟

دلنواز ناہید ــــــــــ!

دنیا کے ہر مذہب میں خودکشی حرام ہے۔ خلاف قانون ہے۔ جرم ہے، اور بدترین گناہ و لعنت۔ لیکن دل یہ کہتا ہے کہ اپنے سینہ میں خنجر بھونک کر، اور نہیں تو گلے میں پھندہ ڈال کر زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ ایک پل کیلئے چین کا نام نہیں۔ گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں۔ اور برس کر نکل جاتی ہیں۔ لیکن میری آنکھوں سے آنسوں کی جھڑی آٹھ پہر میں ایک پل بھی نہیں تھمتی۔ ہر وقت ایک سیل آنکھوں سے رواں رہتا ہے۔ میرے دن بھیانک ہیں۔ اور راتیں ڈراؤنی۔ خدارا ــــــــــ تم میری داستانِ الم اور قصۂ غم نہ سنو۔ رات چھوٹی اور میری کہانی بڑی ہے۔ اُس پر نہایت ہی بھیانک اور غمناک ــــــــــ!

تمہارا نازک دل جلنے لگے گا۔ تم بے چین ہوجاؤ گی۔ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔ اور تم بھی میرے سازِ غم کے اُن تاروں کو نہ چھیڑو جنکی رگوں میں زندگی کی پرکیف شراب کی بجائے، موت کی آگ اور مایوسیوں کی چنگاریاں اور بددعاؤں کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یاالہی ــــ!

ــــ آہ ــــ! تمہیں کیا معلوم کہ میں دن کیسے کاٹتی ہوں۔ راتیں کیونکر گذارتی ہوں۔ سیر و تفریح سے لطف اندوز کیوں نہیں ہوتی؟ لطیف پھولوں کی عطر بیزی سے میں اپنے دماغ کی پرورش کیوں نہیں کرتی؟ موجوں کے ترنم، کلیوں کے تکلم، اور غنچوں کے تبسم سے میرا دل کیوں نہیں بہلتا۔ ناہید! وہ زمانہ اور تھا۔ اور اسوقت میں ہوں اور میری تباہ شدہ زندگی۔ سچی مسرت نام کو حاصل نہیں۔ میری خاموشی لاعلاج ہے۔ اگر کسی کو ہنستا دیکھتی ہوں تو پہروں رویا کرتی ہوں۔ زندہ ہوں؟ لیکن مردہ سے بدتر۔ تم مجھے ایک چلتی پھرتی لاش سمجھو۔

روح نواز ناہید ــــــــــ!

تم مجھے طعنے دیتی ہو۔ برا کہتی ہو، تمہارا الزام یہ ہے کہ میں نے سہیل کو جس کے ساتھ تین سال کی خوش خوش زندگی بسر کی تھی۔ ذرا سی بات پر ٹھکرا دیا۔ آہ ——— ! تمہیں کیا معلوم حقیقت کیا ہے؟

میں نہیں چاہتی کہ اس سلسلے میں اُن کی شکایات لکھ کر اپنی برئت کے لئے کوئی معقول وجہ پیش کروں۔ میرا دل دکھتا ہے۔ کلیجہ پھٹتا ہے میں ہرگز کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن تمہارے پیہم اصرار سے مجبور ہوکر اپنی مصیبت کی رام کہانی لکھ رہی ہوں۔ پھر تم خود ہی فیصلہ کرسکتی ہو۔

ایمی ناہید ——— !

یہ صحیح ہے کہ عورت ——— کی ذات بری ہے۔ اور فتنہ و فساد کی جڑ بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے غمزہ اُن کے حسن، اور اُنکی عشوہ طرازی کی بدولت کتنے گھر اجڑ گئے۔ اور ہمیشہ انسانی خون بہتا رہتا ہے۔ لیکن کیا یہ خوفناک ظلم اور سنگین جرم نہیں ہے کہ مردوں کی معیت، عورتوں کی بے لوث زندگی کو محض اپنی سیر و تفریح کے لئے بے رحمی سے کچل ڈالتی ہے۔ تم نے کبھی غور کیا کبھی سوچا کبھی دیکھا۔ ہرگز نہیں۔ تم رات کو مات سمجھ کر میٹھی نیند میں گذار دیتی ہو۔ اور دن کو دن جان کر ہنس بول کر اڑا دیتی ہو۔ لیکن زندگی میں بہت سی ایسی تلخ راتیں آتی ہیں جو روتے کٹتی ہیں۔ اور بہت سے ایسے دن آتے ہیں جو ماتم کرنے کے لئے مخصوص کردیئے جاتے ہیں ——— ! عورتوں کی معصومیت اور مردوں کی سفاکی دنیا میں چاند کی طرح روشن ہے۔ مرد عورت سے پریم چاہتا ہے۔ عورت پریم کی گڑیا بن جاتی ہے۔ مرد اُس پریم کی گڑیا سے کھیلتا ہے۔ اور جب اُس کھیل سے تھک جاتا ہے تو میٹھی نیند سو رہتا ہے۔ پھر اُسے خبر نہیں رہتی کہ عورت کہاں ہے؟ کس حال میں ہے اور اُس پر کیا گذرتی ہے۔؟ اُف اُن کا سلوک کس قدر ہولناک، کتنا قاتلانہ ہوتا ہے۔ خدا کی پناہ ——— !

ناہید ——— !

میری روح تاریک نہیں ہے اور نہ میں گندی ہوں۔ خدا کیلئے میرے شکستہ دل کے تار کو چھیڑ کر مجھ کو زیادہ پریشان نہ کرو۔ تم کہتی ہو کہ میں سہیل کو چھوڑ کر بالکل بے خبر اور غافل ہوگئی ہوں۔ میں کس طرح اپنا سینہ چیر کر دکھلاؤں کہ نہ میں سہیل سے غافل ہوں نہ بے خبر جب میں اُن کو یاد کرتی ہوں۔ تو ان کی یاد دل کی گہرائیوں میں اس طرح جوش مارنے لگتی ہے۔ جیسے کسی چشمے سے پانی۔ دو سال تک میں اُنکی محبت، اُنکی الفت، اُنکے شیریں الفاظ، اور اُنکے پیار اور اخلاص کے خوبصورت جال میں پھنسی رہی۔ مجھے رات اور دن میں بھی تمیز نہ رہی تھی۔ نہ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔ اور نہ اس کا احساس ہی تھا کہ کس دنیا اور کس عالم میں ہوں۔ صبح کب ہوئی شام کس طرح ہوئی۔

پھر اس سلسلۂ عشق، اور پیہم التفات کے بعد تمہارا سوال ہوگا کہ ناچاقی کی وجہ ———؟ سو مجھے اور تو کچھ نہیں معلوم لیکن شاید۔ اس دن ——— جب میں اپنے آرزومند دل کو لیکر بہت ہی ناز اور محبت کے ساتھ سہیل کو یہ خوشخبری سنانے کیلئے پہونچی: ———

پیارے! " میرے سینہ میں، ایک ننھے سے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے ———، اور وہ ہماری تمہاری محبتوں کا نتیجہ ہوگا۔

وہ کچھ نہیں بولے، خاموش رہے۔ اُن پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔

خدا جانے کیوں ———؟ اُس دن سے میرے اور اونکے تعلقات میں کمی ہونے لگی۔ اسکے بعد سے اُنہیں کبھی شگفتہ نہ دیکھا۔ وہ برابر مغموم، اور کسی گہرے خیال میں غرق رہتے۔ میں نے ہر چند اُنکی پریشانی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہی۔ اُنکی اس خاموشی سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اُن کے لبوں پر اُسی طرح تبسم لہراتا ہوا دیکھوں۔ جس طرح ہمیشہ لہرایا کرتا تھا۔ دونوں

سے ہفتہ۔ ہفتوں سے مہینہ کا طویل وقفہ اُنکی ملاقاتوں میں حائل ہونے لگا۔ میں بے صبری کے ساتھ اُن کا انتظار کرتی رہتی۔ اور وہ کبھی مجھ سے ملنے نہ آتے۔ جب کبھی بھولے بھٹکے آجاتے۔ تو میں اُن سے پوچھتی۔ کیا تمہارا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔؟ محبت کی سرشاریوں کو کیوں بے کیف بنا رہے ہو۔ آہ ——— ! گمان بھی نہ تھا کہ تم مجھے ٹھکرا دوگے۔ اس قدر جلد۔ تم پہلے ایسے تو نہ تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میری نظروں سے علحدہ نہ رہو۔ تمہاری اس بے التفاتی سے میرے دل کو، میرے جگر کو، میری روح کو، صدمہ پہونچتا ہے۔ اور بے حد صدمہ۔ یہ سب باتیں تو پہلے تم میں نہ تھیں۔ میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ تم میں یہ انقلاب کیونکر پیدا ہوا۔ میں نے کچھ بگاڑا بھی نہیں۔ پھر یہ بے اعتنائی میرے کس جرم کی سزا ہے۔؟ اور تم مجھ سے کیوں کتراتے ہو۔ تمہاری جنسی التفاتی، تمہاری محبت، تمہارا پیار، میرے لئے خواب کیوں بنتا جا رہا ہے ———

وہ مجھے سختی سے جھٹک دیتے۔ اور بڑبڑاتے ہوئے چلے جاتے کہ پوچھنے والی تم کون ——— ؟ تمہارا کیا ؟ تمہیں اس سے مطلب ؟ مرد آزاد ہے۔ جہاں جی چاہے آزادی کے ساتھ آ جا سکتا ہے۔ پھر وہ اُس دن۔ اُس رات، نہ آتے۔ میں تمام رات انتظار ہی انتظار میں جاگ جاگ کر گذار دیتی۔ خیال گذرتا شاید وہ آتے ہی ہوں۔ ان کی یہ حالت دیکھکر پھر کبھی چھیڑنے کی ہمت نہ ہوتی۔ میں سب کچھ دیکھتی رہتی۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہتی۔ اوروں کو میری اس دردناک حالت پر رحم آتا۔ لیکن میرا۔ اُن کے سامنے زبان ہلانا ناممکن تھا۔

بہن ——— ! مرد آزاد ہیں، یہ میں بھی تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن ——— اُن کی یہ مستی، اُن کی معصیت، اُن کا فریب، اُن کا خوبصورت دھوکا عورتوں کے حق میں کتنا بڑا ظلم ہے۔ کیا یہ سوہانِ روح نہیں ہے۔ کیا یہ بے انصافی نہیں ہے۔ کیا دنیا میں انصاف وہمدردی رسمی الفاظ ہیں۔ جو زبان پر تو آتے ہیں۔ لیکن دل اُس کے اثر سے خالی رہتا ہے۔ پھر بھی میں صابر و شاکر رہی۔ کبھی اُنکی شکایت نہ کی۔ وہ جب بھی بھولے بھٹکے پہونچ جاتے میرے دل کی کلی کھل جاتی۔ میرا دل باغ باغ ہو جاتا۔ میں بے اختیار اپنی بانہیں اُنکے گلے میں ڈال دیتی۔ مزاج پرسی کرتی۔ اور ایک پیر پر کھڑی رہتی ——— کیونکہ ہمارے ملک کی لڑکیاں شوہر پرستی، اور اطاعت گذاری میں لونڈی سے بدتر ہیں۔ اس پر بھی وہ میری باتوں کا جواب محبت سے نہ دیتے۔ وہ مجھ سے ملتے ضرور تھے۔ لیکن بہت جلد کوئی نہ کوئی خوبصورت بہانہ تراش کر الگ ہو جانے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں اچھی طرح محسوس کرنے لگی کہ میں اُن پر بھاری ہو گئی ہوں۔ لیکن کر ہی کیا سکتی تھی۔؟ میں انکو کسی سے ملنے ملانے میں کیوں روکتی ؟ میری ہر بھلی بات بھی انکو بری معلوم ہوتی تھی۔ میں نے جب کبھی دبی زبان سے کچھ کہا، ان کے غصے کی بھٹی تیز ہو جاتی ——— اور پھر بہت زور کے ساتھ بھڑک اٹھتی۔ ایسی حالت میں میرا چپ ہی رہنا اچھا تھا۔ ان کا دل تھا، ان کی طبیعت تھی۔ جسے چاہیں پیار کریں۔ اور جسے چاہیں ٹھکرا دیں۔ خدا رکھے ان کی ——— شاما کو۔ ان کا دل وہاں زیادہ لگتا تھا۔ وہ نئی نویلی اور ایک آزاد عورت تھی۔ بھلا وہاں دل کیسے نہ لگتا۔ وہ رقص میں ممتاز تھی۔ گانے میں لحن داؤدی کو شرماتی تھی۔ اور حسن میں چندن تھی۔ اب مجھ میں کیا دھرا تھا۔ تین سال بہت کافی ہوتے ہیں۔ میرے گلے کا ہار کب تک بنے رہتے۔ ایک کے گلے کا ہار زیادہ دن تک بنکر رہنا اچھا نہیں۔ مرد، عورتوں کے حسن، اور شباب سے جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں۔ اُنکی محبت کو جس طرح چاہیں پامال کر سکتے ہیں۔ اور اُن کے جذبات کو جس طرح چاہیں ٹھکرا سکتے ہیں۔ کوئی گناہ نہیں۔ اور نہ اُس کی کوئی سزا۔ سوسائٹی بھی برا نہیں کہتی۔ مولوی اور پنڈت بھی اپنی پوتھی بند کر کے زبان کے گونگے، کان کے بہرے، اور آنکھ کے اندھے ہو جاتے ہیں۔ بہن - بہن ——— ! جانتی ہو کہ ایسا کیوں ہے ؟

مردوں کی جوہر جگہ حکومت ہوئی۔

بہن ——————!

جیسے کنول کا پھول باوجود پانی میں پیدا ہونے کے مرجھا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ میری حالت خراب ہونے لگی۔ گھر میں تمام پونجی کا صفایا ہو گیا۔ اور کچھ باقی نہیں رہا۔ آہستہ آہستہ میرے تمام زیورات جو والدین نے رخصتی کے وقت جہیز دئے تھے۔ ساہوکار کی نذر ہو گئے۔ کبھی فاقہ کرتی، کبھی چنے چبا کر دن گذار دیتی۔ وہ اگر آ جاتے تو میری زبان گنگ ہو جاتی۔ میں کچھ نہ کہتی۔ میں ان پر اپنی مصیبت ظاہر کر کے ان کے دل کو ناخوش اور کڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرے سرتاج تھے۔ میرے مالک اور شریک زندگی ——————!!!

میری زندگی مسلسل مصیبت، اور مستقل تکلیف کے ساتھ گذر رہی تھی۔ اس پر ایک بچی کلی نکلی۔ اس روز سے پھر سہیل کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ اور بھی کنارہ کش ہو گئے۔ اور اس قدر بے نیاز و بے خبر! گویا میں ان کے لئے مر گئی۔ یا مجھ سے اور ان سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اولاد دنیا جہان کو ہوتی ہے۔ لیکن ہماری بدنصیبی، افلاس ——————میں پیٹ کاٹ کر دکھ مصیبت سہہ کر بچی کی نگہداشت کرتی رہی۔ اور کیسے نہیں کرتی۔ وہ چھ مہینہ کی بھی ہو گئی۔ مگر بھولے سے بھی کسی روز بچے کی صورت دیکھنے نہ آئے۔ بچی گویا سانپ تھی۔ وہ سانپ سمجھ کر اس سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ میری بچی بیمار پڑ گئی۔ ایسی بیمار پڑی کہ اس کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔

میں ان کی ——————تلاش میں جہاں تہاں بھٹکتی اور ڈھونڈتی پھری۔ جیسے کوئی پیاسا ایک نامعلوم صحرا میں پانی ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس وقت بجز خدا کے کوئی ڈھارس، اور کوئی تسکین دینے والا بھی نہیں تھا۔ کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔

وہ نہ بھولنے والی رات ——————جب میری بچی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی۔ اور انکی معراج شاما کے گھر ہو رہی تھی۔ کرشن اور کنھیا کی جوڑی تھی۔ عیش و رنگ میں دونوں ڈوبے تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ جو میں ایک ایسی جگہ پہونچی۔ اگر ممتا مجبور نہ کرتی تو مرتے دم بھی نہ جاتی۔ میں نے اس سے بھیک مانگی، اپنی بپتا سنائی۔ میرے پاس اب ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ فاقے مر رہی ہوں۔ دوا کے لئے کوئی ایسی چیز نہیں کہ علاج کرا دوں۔ خدا کیلئے اب گھر چلو اور جس طرح ہو میری بچی کی جان بچا لو میری امید کا چراغ۔ میرے آرزوؤں کی دنیا ——————!

میری اس دکھ بھری درد سے ہوا بھی سرد پڑ گئی۔ رات بھی شبنم کے آنسو رونے لگی۔ مگر وہ اسقدر کٹھور دل تھے کہ رام نہ ہو سکے۔ شاما کا دل بھی نرم ہو گیا۔ آخر عورت ذات تھی نا ——————! وہ میرے ساتھ ہمدردی کرنے لگی اور دلجوئی۔ میں رونے لگی، اور روتے ہوئے بولی "بہن! تمہارا تو کوئی قصور نہیں۔ یہ میری قسمت کا لکھا ہے جو آج پورا ... ہو رہا ہے"۔ پھر بھی انکا دل نہ پسیجا اور وہ نہ آئے۔

میرے باغ ہستی کی کلی جس کی بہاریں چھ مہینہ میں نے دیکھی تھیں۔ اور جو ابھی کھلنے بھی نہ پائی تھی کہ موت نے ہمیشہ کے لئے اسے شاخ گل سے جدا کر دیا۔ معصوم بچی! روح نواز!! آہ —————— آہ ——————

جب میری بچی اس دنیا سے منہ موڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ کو رونے اور رنج و غم سہنے کے لئے چھوڑ گئی۔ تو آنسو پونچھنے اور دنیا کو دکھانے کے لئے وہ بھی آئے تھے۔ ہائے دنیا کتنی فریب سے بھری ہے۔ میں گویا انکو دیکھکر مبہوت ہو گئی۔ لیکن میری آواز میں اس وقت دنیا بھر کی تلخیاں موجود تھیں۔

میں جنون کی حالت میں بہت کچھ بول گئی۔ اسوقت میرا دل اور دماغ ٹھکانے نہ تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی ——————

کہ اُن کی صورت دیکھوں۔ ان کو جب میری عزت، مجبوری، اور بے کسی پر رحم نہیں آیا۔ تو پھر اب توقع کس بات کی رکھتی۔ انہوں نے پہلے جی مار ڈالا۔ ایک بچی تھی، جو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہوتی وہ بھی نہیں رہتی۔ میں نے صاف کہدیا۔ چلے جاؤ ——

—— اب تم میری قسمت میں نہیں ہو۔ میں تم سے بہت دور ہوں۔ میری محبت کو بھول جاؤ۔ میں انتہائی رنج و غم کے ساتھ اپنے عہد و پیمان واپس کرتی ہوں۔ اب تم ہمیشہ کے لئے آزاد رہو میری جدائی سے تمہیں کوئی صدمہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اور اگر ہو بھی تو یہ سمجھنا کہ جس طرح زمانہ کوئی خوشی باقی نہیں رکھتا۔ اسی طرح کوئی غم بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ عورت کی فطرت میں محبت اور انتقام دونوں ہیں۔ میں نے تم سے محبت کی۔ تم نے مجھے ٹھکرایا۔ اب میں تمہیں ٹھکراتی ہوں۔ شاما کے لئے تم۔ اور تمہارے لئے شاما۔ وہ میری طرح قید بھی نہیں۔ آزاد ہے۔ تمہیں وہاں زیادہ آرام ملے گا —— !

اب میری سونی دنیا میں بجز غم و اندوہ کے کچھ نہیں۔

بہن —— یہی میری کہانی ہے۔ اور یہی واقعہ ہے۔ بس اس وقت میں ہوں۔ اور میری تباہ شدہ زندگی کی حسرتیں۔ اب تم خود انصاف کرو۔ قصور کس کا ہے؟

زندگی

—— از محترمہ شکیلہ اختر (ارول گیا)

زندگی نام ہے گھُٹ گھُٹ کے جئے جانے کا
زندگی نام ہے پامال کئے؟ جانے کا
زندگی نام ہے ارماں پہ مٹے؟ جانے کا
روح کا قید میں بس آہ کئے جانے کا

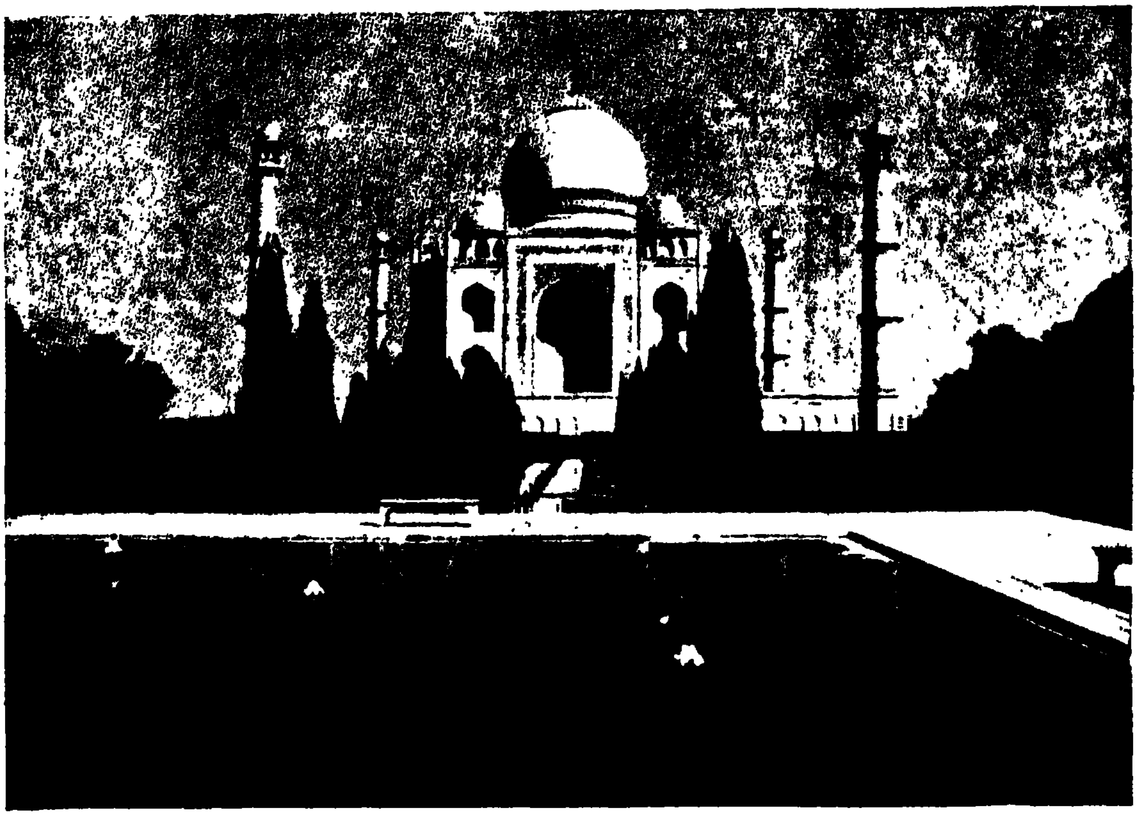
آہ و فریاد سے معمور ہے ساری ہستی
اشکِ پیہم میں رواں ہوتی ہے دل کی کشتی
پھول کھلتے ہیں جو گلشن میں تو مرجھانے کو
کونپلیں پھوٹتی ہیں شاخ سے جھڑ جانے کو

زندگی؟ آس کی بگڑی ہوئی صورت کہیئے
سانس چلتی ہوئی بے جان سی مورت کہیئے
خونِ مزدور سے نکلے ہیں چمن میں لالے
آہِ دہقاں سے دہکتے ہیں فلک پر تارے

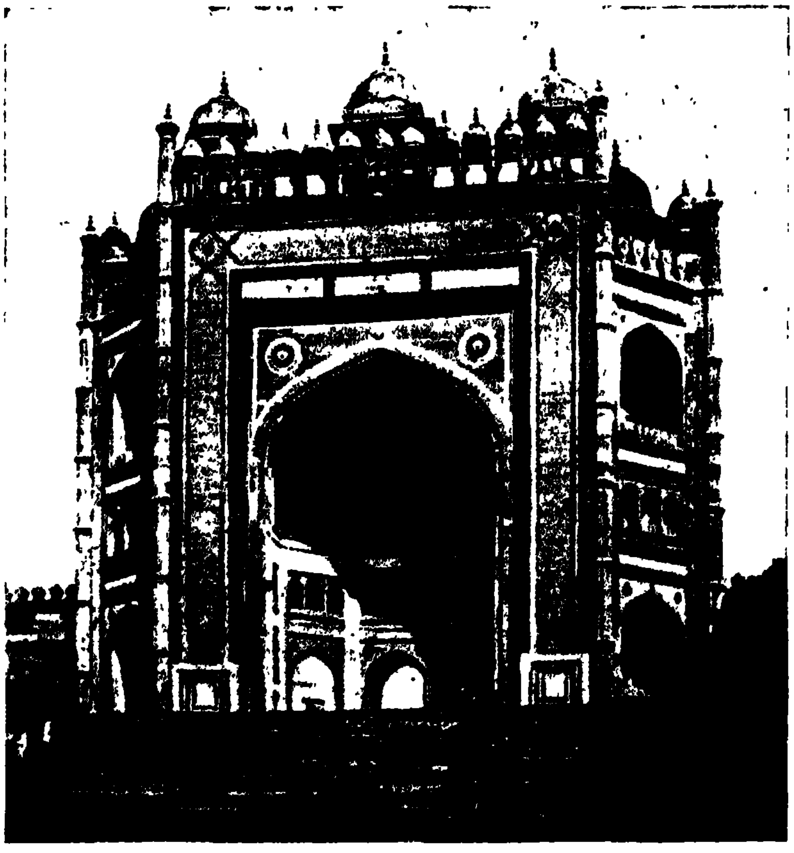
بختِ انساں پہ فرشتوں کو یہ حیرانی ہے
جس کی تخلیق تھی احسن وہ یہی فانی ہے



معشوق کی الجھن [illegible]



تاج محل آگرہ



بلند دروازہ فتح پور سکری

شانتی گولی استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے اس کے بعد شانتی گولی استعمال کیجئے۔

طاقت اور قوت کی بے نظیر گولی

شانتی گولی

ممسک اور مقوی باہ کی لاجواب گولی

جریان احتلام سرعت انزال ضعف باہ اور نامردی کا مستقل علاج

شانتی گولی جسم کے ان غدودوں میں بیداری اور زندگی پیدا کرتی ہے جن کی بیداری اور ہوشیاری پر صحت کا تمام دارومدار ہے بھوک پیدا کر کے غذا کو جزو بدن بناتی ہے۔ نیا خون پیدا کر کے جسم کا وزن بڑھاتی ہے شانتی گولی کے استعمال سے کمر اور پنڈلیوں درد جسمانی تھکن کمی حافظہ جوانی کی بے اعتدالیاں۔ شباب کی غلط کاریاں دور ہو جاتی ہیں۔ دل و دماغ، معدہ، جگر، مثانہ کو بہت طاقت دیتی ہے۔ آنکھوں میں جوانی کی چمک۔ چہرہ پر شباب کی دمک۔ اور باہ میں ایک نیا جوش پیدا کرتی ہے شانتی گولی اس قدر زود اثر ہے کہ اس کی پہلی ہی خوراک جسم کے ہر ایک رگ و ریشہ کو بیدار کر کے نئی زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ صدہا مایوس اور نامراد مریض اس سے فائدہ حاصل کر چکے ہیں۔ اور امساک کے لئے شانتی گولی بے مثل اور بے نظیر ثابت ہوئی ہے زیادہ تعریف کرنا فضول ہے۔ لہٰذا ایک بار آزمائش کرنے کے بعد آپ ہمیشہ کے لئے شانتی گولی کے گرویدہ نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمہ شانتی گولی عورت اور مرد دونوں کے لئے یکساں مفید ہے اور زندگی کو سنوار دیتی ہے۔ جوانی میں نوجوانی کی بہار اور بڑھاپے میں نوجوانی کا لطف نصیب ہوتا ہے (اس گولی میں کوئی مضر دوا نہیں ہے جس سے نقصان کا احتمال ہو) قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ) تین شیشی ایک ساتھ منگانے سے محصول معاف

شانتی دھارا (رجسٹرڈ) دردِ سر، نزلہ۔ زکام۔ کھانسی۔ نمونیہ۔ انفلوئنزا۔ بخار۔ ملیریا بخار۔ دست۔ قے۔ متلی۔ دردِ شکم۔ ریاحی درد۔ بھوک کا نہ لگنا سینہ پر لہر۔ جلدی جلدی پیشاب کا ہونا۔ ورم جگر اور طحال۔ درد دانت۔ درد کان۔ درد پسلی۔ درد گٹھیا۔ جوڑوں اور ہڈیوں کا درد۔ اندرونی اور بیرونی درد اور ہر قسم کے چوٹ اور ورم کے دردوں میں مفید ہونے کے علاوہ خونی بواسیر کے لئے اکسیر ہے۔ ہیضہ (کالرا) اور بچوں کے تمام امراض میں اکسیر کا کام کرتا ہے۔ بچے بوڑھے مرد عورت سب کے لئے یکساں مفید ہے۔ آج کل کے موسم میں کم از کم ایک شیشی اپنے گھر میں موجود رکھئے بوقت ضرورت پڑنے فوراً استعمال میں لائیے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ) تین شیشی ایک ساتھ منگانے سے محصول معاف۔

شانتی نمک معدہ کی تمام بیماریوں کے لئے اکسیر ہے۔ شانتی نمک ضعف معدہ۔ ضعف اشتہا کھٹی کھٹی ڈکاروں کا آنا چھاتی کی جلن بدہضمی۔ دردِ شکم۔ دل کی دھڑکن قبض اور دائمی قبض۔ پیچش اور بادی بواسیر کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ عورتوں کی بیماریوں میں خاصکر حاملہ عورتوں کے لئے جبکہ ان کی بھوک جاتی رہے۔ جی متلائے یا وہ قبض میں مبتلا ہوں بیحد اکسیر ہے۔ قیمت فی شیشی چھ آنہ (۶) چار شیشی ایک ساتھ منگانے سے محصول معاف۔ (ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے معقول کمیشن دیا جائے گا)

پتہ :— ڈاکٹر امجد حسین (مالک) دواخانہ شانتی دھارا (رجسٹرڈ) نمبر ۶ زکریا اسٹریٹ کلکتہ

فوراً پورے کردئے جائیں ورنہ کچھ دنوں کے بعد مطالبوں کا اتنا ہجوم ہو جائیگا جس سے نجات پانا مشکل ہے۔

دنیا کی ہر شے محو خود نمائی ہے۔ خاک عالم کا ہر ذرہ کبریائی ہے۔ ہر نفس سمجھتا ہے میں بلند ہوں، اونچا ہوں اور اکثر باتوں میں اکثر سے اچھا بھی ہوں۔ زندگی کی تگ و دو اس فریب سے قایم ہے اور بقول جمیل مظہری - ع

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

فرقے بھی فرشتوں پر مشتمل نہیں ہوتے بلکہ ان کی ترکیب اسی زمین پر چلنے والوں انسانوں سے ہوئی ہے۔ اس لئے ہر فرقہ اپنے کو دوسرے فرقوں سے افضل سمجھتا ہے۔ وہ ان میں ایسی برائیاں دیکھتا ہے جن سے ان کے خیال میں اس کا اپنا فرقہ پاک ہے۔ پھر اوپر کے بتائے ہوئے شکوک و شبہات تصادم کا سامان کر دیتے ہیں۔ اور جتنے تصادم ہوتے ہیں اتنے ہی درجے نفرت کے بڑھتے ہیں فرقہ پرست اور وہ لوگ جن کی اغراض فرقہ بندی ہی سے وابستہ ہیں ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن سے نفرت کے شعلے اور بھڑک پڑتے ہیں۔ ارباب اغراض کی سرگرمیوں کی سب سے اچھی مثال جنگ جمل کا واقعہ ہے جہاں محبت اور فدائیت کے بعد پہلی دفعہ مسلمان جمع ہو کر آپس میں جنگ آزما ہوئے مصالحت پسندوں کی کوششوں سے اختلاف تقریباً مٹ رہا تھا ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ بغیر کسی جنگ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تعاون اور امداد باہمی کا طریقہ اختیار کرلیں۔ لیکن یہ مصالحت قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہوتی۔ وہ جانتے تھے کہ سربرآوردہ مسلمانوں اور صحابہ کرام میں مصالحت ہو گئی تو ان کو ستارے نظر آنے لگیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی حرکتیں کیں اور خوابیدہ شکوک کو کچھ اس طرح بیدار کیا کہ مسلمانوں کی دو طاقتیں تلواروں کو بے نیام کر کے میدان میں آ ڈٹیں اور کشتوں کے پشتے لگ گئے

ہر فرقہ اپنے لئے ایک امتیازی شان تلاش کرتا ہے جیوں جیوں کسی فرقے کی حیات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے وہ اپنے لئے نئے نئے نشانات ایجاد کرتا ہے۔ گفتار اور رفتار میں، وضع اور قطع میں، علم اور اخلاق میں انوکھے اختراعات ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد اس فرقہ کا ایک مخصوص تمدن ہو جاتا ہے وہ تمدن لغویت سے پُر رہی۔ اس کا احساس بھی رہی کہ اس فرقہ کا قیام وقتی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ ہے جس کی اب کوئی ضرورت باقی نہیں لیکن جداگانہ وجود کے قیام پر اصرار باقی رہتا ہے اور فصل و مخاصمت سے جو تمدن تیار ہو گیا تھا اس سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ ترک کرنے کا گمان ایک لمحہ کیلئے نہیں کیا جاسکتا۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے وقتی اختلافات نے احتجاج اور بیزاری کے لئے جو شکلیں پیدا کیں وہ آج تک رسم بنی ہوئی ہیں اور ان کو چھوڑنے کیلئے تو ہمارے بھائی نعل در آتش ہو جاتے ہیں

بالکل ابتدا میں ضرورتوں کی اہمیت بتائی گئی ہے یہ ضرورت ہی ہے جو انسان کی فطرت پر سلطنت کرتی ہے۔ انسان کسی قدر غیرت اور خودداری کے خلاف کیوں نہ سمجھے لیکن اسے اُدھر جھکنا پڑے گا جہاں سے حاجتوں کی تکمیل ممکن ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

اس لئے وہی فرقہ زیادہ مقبول ہوتا ہے جس کے ارکان سے ضرورتیں پوری ہوں اور ان کی باتوں سے عوام کے جذبات کی تائید ہوتی ہو۔ مثلاً اگر اس وقت کوئی گروہ سامنے آئے اور اس گروہ میں زمیندار، وکیل اور بیرسٹروں کی اکثریت ہو تو قدرتی طور پر ملک میں اسے مقبولیت حاصل ہوگی کہ ملک والوں کی قدرتی ضرورتیں انہی سے

پوری ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی تعمیری پروگرام لیکے سامنے آئے اور وعدہ کرے کہ لوگوں کے لئے ایک نئی دنیا ئی مسرتوں سے معمور پیدا کردے گا تو یہ وعدہ خوش آیند تو ہے لیکن اس کی مقبولیت اس لئے دیرمیں ہو گی کہ ان وعدوں سے ملک والوں کی فوری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں اور مستقبل کی فکر بعد میں ہوا ہی کرتی ہے۔

ہاں اس قسم کا تمام اثر کسی تیسرے گروہ پر پڑ سکتا ہے دو فرقے ایک دوسرے پر مشکل سے اثر ڈال سکتے ہیں۔ ایک فرقہ کسی قدر ذی اثر کیوں نہ ہو دوسرے فرقے کو آسانی سے متاثر نہیں کرسکتا ہاں جب ایک ہی فرقہ تقسیم ہو جائے تو ان منقسم گروہوں میں مقبول وہ جو اوپر کی شرطیں پوری کرتا ہو۔

جو لوگ اپنے فرقہ کی اصلاح اور ان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں میرے خیال میں انہیں زیادہ توجہ اس پر صرف کرنی چاہئے کہ اختلاف خیال میں شدت پیدا نہ ہونے پائے ورنہ وہ اور ان کے ساتھی ایک فرقہ بنکر رہ جائیں گے اور مخالف فرقے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ انہیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان کی جماعت الگ فرقے کا رنگ اختیار نہ کرنے پائے بلکہ وہ پہلے ہی گروہ کے ایک جزو بنے رہیں۔ بہت سے مصلحین مقابلہ کے جوش میں فرقہ کی بہت سی ان باتوں کی مخالفت کر بیٹھتے ہیں جن کا ان شعبوں سے کوئی تعلق نہیں جہاں اصلاح حال کیلئے اقدامات کئے گئے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسائل الجھ جاتے ہیں اور مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اور گرچہ جن باتوں کی مخالفت کی جاتی ہے وہ واقعتاً ایسے نہیں جنکے رہنے پر اصرار کیا جائے بلکہ ان کی جگہ پر زیادہ اچھے نقشے تیار کئے جا سکتے ہیں تاہم اس گروہ میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تمام علامتوں کی مخالفت کرکے اس کے وجود ہی کو صفحہ سے مٹانے کی تدبیریں ہیں

بعض مصلحین جب تمام خرابیوں کی اصلاح کا بیک وقت بیڑا اٹھا لیتے ہیں تو اس وقت بھی یہی دشواری پیدا ہوتی ہے اصلاح ہمیشہ تدریجی ہونی چاہئے۔ اسی میں کامیابی کا راز ہے

اگر فرقہ بندی کو توڑنا ہے تو نفس فرقہ بندی کی مخالفت کرنے سے پہلے متصادم فرقوں کے ہر رکن کے دل میں یہ بات اتار دینی چاہئے کہ دونوں کی بنیاد مشترک ہے اور وقت کے سب سے اہم مسئلہ میں دونوں کا متعلق ہونا ضروری ہے اور یہ کہ ان کا وجود اشتراک و اتحاد ہی کے ذریعہ قائم رہ سکتا ہے۔ اور یہ سب اس وقت ممکن ہے جبکہ شکوک و شبہات کے قلعے مسمار ہو جائیں۔

تمہید فغاں

از
جناب سید محمد صاحب عابدی بھاگلپوری

مسرت مجھ کو اب آہن کشاں معلوم ہوتی ہے — مری ہر سانس تمہید فغاں معلوم ہوتی ہے
مجھے برباد ہونے دو خدارا رہ الفت میں — یہ بربادی حیات جاوداں معلوم ہوتی ہے
سر منزل وہ کوئی اور ہونگے بیٹھنے والے — مرے ہر گام میں منزل نہاں معلوم ہوتی ہے
مری ناکامیاں اٹھی ہیں پھر انگڑائیاں لیکر — مری ہر آرزو اب نوجواں معلوم ہوتی ہے
ہلا ڈالا ہے قصر جور کی بنیاد کو جس نے — کسی اجڑے ہوئے دل کی فغاں معلوم ہوتی ہے
جو ناوک رہ گیا تھا چبھ کے پہلو میں کبھی میرے — اب اس کی ہر خلش تسکین جاں معلوم ہوتی ہے
میں پڑھ لیتا ہوں مسجد ہو کلیسا ہو کہ مندر ہو — نماز عشق شائستہ جہاں معلوم ہوتی ہے
چمن کے حادثے کو عابدی مدت ہوئی لیکن — بہار اب بھی نگاہوں میں خزاں معلوم ہوتی ہے

ورنہ اس پرانے احساس کی جگہ نئے احساسات لے لیتے ہیں مزاج بھی ہر انسان کا ایک نہیں ہوتا کسی کی طبیعت میں شدت ہوتی ہے کسی میں اعتدال اور بعض اندھے مقلد ہوتے ہیں۔ ان شدت پسندوں کی وجہ سے جماعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور اختلاف خیالات سے نئے نئے فرقے نکل پڑتے ہیں معتدلین آخری وقت تک اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ان فرقوں کے اختلافات دور ہو جائیں لیکن اعتدال شدت پر بہت کم غالب آیا کرتا ہے اندھے مقلد جس سے عقیدت رکھتے ہیں اسی کے فرقے میں شریک ہو جاتے ہیں بشرطیکہ ان کی اپنی ضروریات حائل نہ ہوں یا جو باتیں باعث عقیدت بنی ہیں وہ کما حقہ قائم رہیں ان اندھے مقلدوں کی ہر جماعت میں اکثریت ہوتی ہے اور عموماً یہ اپنا دامن اسی کے دامن سے سی لیتے ہیں جو جماعت میں سب سے زیادہ نمایاں ہو۔

یوں تو کہا جاتا ہے کہ اختلاف کسی جماعت کی ترقی کی علامت ہے۔ لیکن اختلاف کی وہ منزل جہاں فرقہ بندی جنم لیتی ہے حد درجہ ہولناک ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فرقہ بندی کی بدولت جماعت کے بلند اور شاندار مقاصد ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہے جماعتی وقار و عظمت کے چاند میں گہن لگ گیا۔ اس چمن کی بہار کا خون ہو گیا جسے سماج کہتے ہیں۔ رسول اللہ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مسلمانوں میں کوئی تفریق نہ تھی۔ نہ کوئی آقا تھا نہ غلام، اوس تھا نہ خزرج، بنی امیہ تھا نہ بنی ہاشم۔ سارے پرانے جھگڑے اور پرانے امتیازات اور پرانے نسلی مسائل گم ہو گئے تھے، سبھوں پر دین الٰہی کی تبلیغ و مدافعت کا مسئلہ غالب آ گیا تھا۔ لوگ بھائی بھائی تھے۔ ایک دوسرے کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کر رہے تھے۔ جائدادیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ بیویوں کو طلاق دے کر دوسرے بھائی کے گھر کو آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد نبوت نے جب آنکھیں بند کیں اور خلافت کا مسئلہ اٹھا تو جیسا کہ کہا گیا ہے جزئی بات اختلاف کی تحریک کرتی ہے مسلمانوں میں نزاع شروع ہوا اور رفتہ رفتہ رنجشوں نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ مسلمان ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے پر تلواریں چلنے لگیں ایک دوسرے کی راہ روک لی گئی۔ تاک تاک کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تیروں کا نشانہ بنایا گیا۔

اگر دیدۂ عبرت ہو تو جنگ صلیب جس میں سارا یورپ فلسطین کے استحصال کے لئے ایک قوم بنکر ایک صلیبی جھنڈے کے نیچے ایک رچرڈ شیر دل کی کمان میں اسلحات میں ڈوب کر صلاح الدین ایوبی کے مقابلہ میں آ ڈٹا تھا اور سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اور پھر رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی جنگ باہمی جس میں یورپ ہی کی آبادی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑی۔ زندہ انسانوں کو نذر آتش کیا گیا اور عقیدہ کے اختلاف کے جرم میں درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا گیا یاد دلائی جا سکتی ہیں

خود ہندوستان کو کیوں چھوڑا جائے؟۔ زیادہ زمانہ نہیں ۱۹۲۰-۲۱ء کے واقعات ہی کافی ہیں۔ ہندو اور مسلمان کیسے متحد تھے کیسے دوست اور کیسے شیر و شکر تھے۔ کسی کی فتنہ سامانی، کسی کی عیاری اور کسی کی تخلیق نفاق کی قوت ان میں پھوٹ نہ ڈال سکی۔ لیکن پھر یہ اتحاد کیسے حوصلہ فرسا نفاق میں بدل گیا شک اور شبہ، بیزاری اور نفرت، غم اور غصہ سے ہندوستان کا آسمان کیسا مکدر ہو گیا یہ تو شاید کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ فرقوں میں ثبات اور استحکام کیونکر پیدا ہوتا

پیدا ہوتا ہے؟ ان کی زندگی میں خوالت کیسے ہو جاتی ہے؟

وہ راستے جہاں سے فرقہ بندی کو غذا ملتی ہیں عقیدت، شک اور نفرت ہیں۔ عقیدت اپنے فرقے کے افراد سے اور شک اور نفرت غیر فرقوں سے۔

جہاں دو یا زیادہ بھروسہ کے قابل ہوتا ہے اس کی بات زیادہ مانی جاتی ہے اور ہم روزمرہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ فرقوں کا بھی یہی حال ہے۔ ایک فرقہ کے افراد غیر فرقوں کے افراد کی نسبت باہم زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے حسن ظن رکھتے ہیں اور انہی کی زیادہ باتیں مانتے ہیں۔ یہ اعتماد ان لوگوں کے ساتھ بڑھ جاتا ہے جو فرقہ کے مفاد کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بڑھتا ہے رتبے پر زیادہ سے زیادہ دلائل لاتے ہیں اور مخالف دلیلوں کو توڑتے ہیں جس طرح ایک مجلس میں جہاں لوگوں کا یہ خیال ہو کہ فلاں چیز بری ہے اگر میں جا کر کہوں کہ نہیں غلط ہے۔ وہ چیز دراصل اچھی ہے تو کم ہیں جو میری بات مانیں گے۔ میرے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں کو جگہ دی جائے گی اور اکثر لوگ مجھ سے ناراضی کا اظہار کریں گے اور اگر ایک شخص جائے اور وہی بات کہے جو عام لوگوں کے خیالات ہیں اور ان کی سند میں دو چار ثبوت بھی پیش کر دے تو مجلس میں عام خوشی کا اظہار کیا جائے گا اور اس کی طرف سے لوگوں میں حسن ظن پیدا ہوگا جو بعد میں عقیدت کی جگہ لے سکتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ اپنے فرقوں کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتے وہ مشکل ہی سے فروغ پاتے ہیں۔ ہاں جو لوگ ان کے جذبات کی خواہ غلط ہی سہی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی مدافعت کرتے ہیں وہ سروں پر چڑھا لئے جاتے اور سابقہ حسن ظن عقیدت کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ یہ عقیدت خدمت کے ذریعہ اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ اگر اپنے فرقہ کے ارکان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور ان کی مصیبت میں کام آیا جائے تو عقیدت پتھر کی لکیر بن جاتی ہے جس کا مٹنا محالات میں سے ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں محبت کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ خدمت کے ذریعے ہی گروہ کا اعتماد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ اس گمان میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ کسی گروہ یا جتھے کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے اس کے جذبات اور احساسات کی تائید کے سوا چارہ نہیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ تھوڑی ہی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں ان کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں لیکن انہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی قدر اس وقت ہوگی جبکہ اس دنیا میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا

جب ایک جماعت مختلف فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو اعتماد باہمی بھی مٹ جاتا ہے۔ جو اخوت اور ہمدردی پہلے پوری جماعت کے لئے ہوا کرتی تھی وہ فرقوں میں محدود ہو جاتی ہے ہر فرقہ دوسرے فرقے کو اپنا مخالف اور دشمن سمجھتا ہے۔ اس خیال سے طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ کسی فرقے کا عمل کسی قدر غیر جارحانہ سہی لیکن وہ مخالف فرقوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتا ہے۔ ان فرقوں کے افراد طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں نئے نئے مطالب نکال لیتے ہیں۔ عجیب عجیب تاویلوں سے کام لیتے ہیں۔ پھر ان وہمی خطرات سے بچنے کیلئے مختلف تدبیریں کرتے ہیں جو مزاحمت کرنے والی ہوتی ہیں اور یہ یقین دلانے سے کہ اقدام جارحانہ نہیں، اس لئے مزاحمت غلط ہے ایسا لمحہ کیلئے بھی اعتماد پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ اعتماد حاصل کرنے کے لئے کچھ شرطیں پیش کی جاتی ہیں۔ اگر فوراً قبول کر لی گئیں تب تو بداعتمادی میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے اور اگر کچھ تاخیر کی گئی تو شکوک بڑھتے ہیں شرطیں اور مطالبے ناقابل برداشت حد تک پہونچ جاتے ہیں۔ جو لوگ دو فرقوں کے اتحاد کو ہر ممکن قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں ان کے لئے مناسب یہی ہے کہ مطالبے جس قدر بھی نامعقول ہوں

تاثرات

کیوں بھر آتا ہے دل بے اختیار
کیا وہ جانِ آرزو ہے بے قرار

اپنے دل پر اب مجھے کیا اختیار
ہو چکا ہوں میں محبّت کا شکار

ٹوٹتے ننھے شب کو تارے چرخ سے
یا کوئی تھا دور مجھ سے اشکبار

چاند کی ہیں یہ شعاعیں منتشر
یا کسی کے روئے تاباں کی بہار

رات بھر کل تک کوئی تارے گنے
اُف محبّت اور یہ ظالم انتظار

قیصرؔ محزوں کا مذہب ہے وہ عشق
حسن کو کہتا ہے جو پروردگار

"قیصر عثمانی"

فرقہ بندی کی نفسیات

از جناب محمد عثمانی سابق اڈیٹر استقلال کلکتہ

انسان بڑی قدرتوں کا مالک ہے لیکن حاجتیں اسے مجبور کرتی ہیں ۔ اگر حاجتیں نہ ہوتیں تو قدرتوں کا امتحان کیسے ہوتا روز اول سے لیکر روز آخر تک، سانس کی ابتدا سے لیکر انتہا تک انسان اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہے ۔ اس کی ساری جدوجہد، ساری تگ و دو اور کوشش، ساری محنت اور مشقت اپنی ضرورتوں کی تکمیل ہی کے لئے ہوتی ہیں ۔ ضرورتیں دو دلوں کو ملاتی ہیں ۔ محبت اور پریم سکھاتی ہیں ۔ اشتراک عمل اور امداد باہمی کا سبق دیتی ہیں اور یہی مربوط دلوں کو توڑ بھی دیتی ہیں، شمشیریں بے نیام بھی کرا دیتی ہیں، انسان کو انسان کے خون کا پیاسا بھی بنا دیتی ہیں ۔ سچ پوچھئے تو دنیا کے اس پردے پر جو کچھ ہو رہا ہے سبھوں کے پیچھے ضرورت ہی کارفرما ہے ۔

ضرورتوں کی تکمیل کیلئے جدوجہد کا سب سے پہلا قدم غور و فکر ہے ۔ انسان سوچتا ہے کہ اپنی مشکلات پر کس طرح غالب آئے اپنے درد کی کیا دوا کرے .... چونکہ کام کی صلاحیت جس میں سوچ اور بچار بھی داخل ہے ہر انسان میں برابر نہیں ہوتی اس لئے قدرتی طور پر ہر کی فکر بھی یکساں نہیں ہو سکتی سب ایک ہی نتیجے پر نہیں پہونچ سکتے ۔ خیالات میں اختلاف ہو جاتا ہے ۔ جس طرح دو انسان بالکل مشابہ نہیں ہوتے ۔ چہرے اور ساخت ہزار ملتے ہوئے ہوں لیکن امتیاز کی کوئی نہ کوئی بات ضرور ملے گی اسی طرح خیالات میں بھی خواہ کسی قدر اتفاق معلوم ہو اور دنیا یہ سمجھے کہ ان میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ خود بھی اسی فریب میں مبتلا ہوں لیکن کم از کم کوئی ایک نکتہ ان دونوں کے ذہن میں ایسا ضرور ہوگا جہاں پہونچکر ہر قسم کا تعاون اور ہر طرح کی مدد ناممکن ہو جائیگی

یہ اختلاف اور نمایاں ہو جاتا ہے جب ماحول مختلف ہوں ۔ اپنی ضرورتوں کی تسکین کیلئے انسان وسیع و عریض زمین پر پھیل جاتا ہے ۔ مختلف ماحول اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ وہ سوچتا اور محسوس کرتا ہے اپنے ہی ماحول کی مدد سے اس لئے قدرتی طور پر اختلاف بڑھتا ہے اور تفریق کے جو نقوش پہلے ابھرے ہوئے نہ تھے وہ نمایاں ہو جاتے ہیں

اوپر یہ کہا گیا ہے کہ ضرورتیں اشتراک عمل اور امداد باہمی کی بھی محرک ہیں ۔ درد مشترک ان نکات کو سب سے اہم مقام عطا کرتا ہے جو دو افراد کے ذہن میں مشترک ہیں ۔ اور اختلافی مسائل اس طرح ثانوی درجہ حاصل کر لیتے ہیں ۔ اتحاد عمل کی ابتدا ہوتی ہے ۔ نظام قائم ہوتا ہے اور ایک جماعت کی شکل نمودار ہوتی ہے

جس درد مشترک نے ایک جماعت کی شکل پیدا کی تھی اس کی اہمیت کچھ عرصہ بعد جماعت کے افراد کی نظروں سے گر جاتی ہے اور واقعات کی رفتار نئے نئے مسائل پیدا کر دیتی ہے ۔ چونکہ مندرجہ بالا تشریح کے مطابق اتفاق کی دنیا میں نابود ہے اسلئے ہر نیا مسئلہ اختلاف کا امکان رکھتا ہے ۔ اور دوران مباحثہ میں اس پر نئے نئے خیالات پیش کئے جاتے ہیں ۔ اگر وہ احساس جو جماعت کی تشکیل کا ذمہ دار ہے اب بھی ارکان جماعت کے دلوں میں اہم جگہ لئے ہوئے ہے تب تو اختلافات مغلوب ہو جاتے ہیں

مغرب و مشرق کا مکالمہ

(٠)

از جناب سید عبدالحفیظ برہم سہروردی (ایم۔ آے۔ ایم۔ ایل (لندن)) وکیل گیا

مغرب

ایک دن مغرب نے مشرق سے کہا "اے مہ جبیں !
اے تماشہ گاہ عالم اے بت زہرہ جبیں !
اے سراپا حسن فطرت چشم تو سحر آفریں
اے گلستان ارم اے ایشیا کی سرزمیں
ایک مدت سے تری زلفوں کا سودائی ہوں میں
بس ملن تو آجائے بس اسکا تمنائی ہوں میں

کیسے کیسے گنج مال و زر کے ہیں تجھ میں نہاں
تیرا ہر گوشہ ہے نیساں کی طرح گوہر فشاں
تیرے دامن میں ہے ایک سرمایۂ فخر جہاں
وہ درِ نایاب کہتے ہیں جسے ہندوستاں
خطہ خطہ ہے جہاں کا ہفت کشور کا جواب
ذرہ ذرہ جسکا مہر و ماہ و اختر کا جواب

آج انگلستان جس کا مالک و مختار ہے
اس کی تعلیم و تمدن کا علم بردار ہے
آج اس تعلیم سے یہ شوخی گفتار ہے
اسکے قدموں کی بدولت ہند کی رفتار ہے
پیکر برطانوی میں جلوہ گر میں ہی تو ہوں
روشنی پھیلی ہے جسکی وہ قمر میں ہی تو ہوں

تجھکو اپنے ماضی موہوم پر کیا ناز ہے
فرقہ بندی سے نہیں آگے تری پرواز ہے
محفل گیتی میں تو ٹوٹا ہوا اک ساز ہے
تیرا ہر نغمہ شکست و یاس کی آواز ہے
تجھ سے خودداری کے سب احساس رخصت ہوگئے
علم و تہذیب و تمدن تجھ میں جو تھے کھوگئے

مذہبی جوش و تعصب نشۂ نخوت میں چور
رسم کہنہ کی غلامی طرز موجودہ سے دور
ماہ و انجم کے فسانے قصۂ حور و قصور
بس یہی سب ہیں ترے سرمایۂ ناز و غرور !
میری تدبیروں سے سحر سامری بیکار ہے
میرے آگے سرنگوں ہر کافر و دیندار ہے

اول اول درس آزادی تجھے میں نے دیا
تو نے ملت اور سیاست کا سبق مجھ سے لیا
قومیت کا جام تو نے میرے ہاتھوں سے پیا
اب مجھی سے دوں کی لیتا ہے تو اے ایشیا !

مغربی مے پیکے رندِ مشرق بیہوش ہے ‖ ایک قطرہ میں تنگ ظرفوں کو اتنا جوش ہے!

غورسے مشرق کلامِ مغربی سنتا رہا
اُس کا جامِ صبر جب لبریز آخر ہو گیا
تیری باتوں سے تری فطرت نمایاں ہو گئی
دل یہ کہتا ہے کہ دوں تجھکو خموشی سے جواب
مصلحت کہتی ہے پر کردوں تجھے اب بے نقاب
خود ستائی، خود نمائی، کبر ہے شیوہ ترا
تیری دُنیا عالمِ اجسام تک محدود ہے
تیرا مذہب عیش، مال و زر ترا معبود ہے
مادّی قوت کے آگے سرنگوں رہتا ہے تو
تجھکو بھی اپنی روایاتِ گذشتہ پر ہے ناز
ہاں مگر اسمیں نہیں وہ مشرقی سوز و گداز
نشۂ امروز میں فردا سے تو غافل ہوا
خون روتا ہے حبش، اسپین جل کر خاک ہے
جاں بلب فنلینڈ ہے پولینڈ بھی غمناک ہے
حیلہ و مکر و فریب و ظلم تیرا کام ہے
ظلمتِ مغرب میں کسکے نور سے پھیلی ضیا؟
کسکے آگے قیصرِ روما کا آخر سر جھکا؟
پرورش دُنیا نے پائی ہے مری آغوش میں
سرفروشی کے عوض سیکھا ہے تونے سرکشی
علم کو تونے بنایا آلۂ غارتگری
گر یہی تہذیب ہے تیری، ترقی اسکا نام

اس کا ہر ہر لفظ اُسکے واسطے مہمیز تھا
تب مخاطب ہو کے مغرب سے یہ مشرق نے کہا
"لنتران" سے حقیقت اور عُریاں ہو گئی
عقل کہتی ہے کہ فتنوں کا ترے ہو سدِّ باب
تیرے افسوں نے رکھا دُنیا کو اب تک محوِ خواب
انکساری، پاسِ اُلفت، عجز ہے مسلک مرا
بابِ علمِ باطنی تیرے لئے مسدود ہے
جسکو ٹھکراتا ہوں میں تیرا وہی مسجود ہے
زیر دستوں کے بدن کا چوس لیتا ہے لہو
نغمۂ ماضی سے ہے معمور خود تیرا بھی ساز
تجھکو فطرت نے بتایا ہی نہیں اُلفت کا راز
حق پرستی چھوڑ دی اور پیروِ باطل ہوا
آسٹریا کی بھی آزادی کا دامن چاک ہے
کیا یہی تہذیب تیری، او بتِ سفاک ہے
بیکسوں کے خون سے لبریز تیرا جام ہے
قرطبہ میں کس نے قندیلیں جلائیں یہ بتا؟
کس نے تجھکو حکمرانی کا سبق پہلے دیا؟
چھوڑ دے نخوت کی یہ باتیں، تو آجا ہوش میں
مردم آزاری کو سمجھا ہے ترقی قوم کی
رہبری کا مدّعی۔ پیشہ ہے تیرا رہزنی
دُور ہی سے تیری اس تہذیب کو میرا سلام

صحت

(از جناب جنرل منیجر صاحب "صحت گھر" بانکی پور پٹنہ)

ہمارا کام

(۱) پبلک کو صحت قائم رکھنے کے لئے حسب ضرورت مفید ہدایات دینا۔

(۲) بیماروں کو صحیح طبی مشورہ اور علاج بتانا۔

(۳) غیر مقامی مریضوں کے حالات پر غور و فکر کرنے کے بعد صحیح مشورہ دینا۔

(۴) اصلی اور صحیح اجزا کے ساتھ دوائیں مہیا کرنا۔

(۵) مناسب جگہوں میں حسب ضرورت و استطاعت طبی امداد پہنچانا۔

(۶) تجربہ شدہ اور کامیاب دواؤں سے پبلک کو آگاہ کرنا۔

ہمارے یہاں طبیہ کالج مسیح الملک حکیم اجمل خاں رح دہلی کے مستند قابل تجربہ کار اور ماہر طبیب مقامی مریضوں کی دیکھ بھال اور غیر حاضر مریضوں کے حالات پر غور کرتے اور مشورہ دیتے ہیں۔

خاص امراض کے متعلق خط و کتابت بالکل پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

امراض کے متعلق مشورہ مفت حاصل کیجئے، جواب کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

آپ کا خادم

"منیجر"

جس نے آنکھیں کھوئیں اس نے سب کچھ کھویا

کحل بصر جواہر والا

بینائی کی حفاظت کرنا، آنکھوں کو صاف رکھنا، پانی روکنا اور سرخی کو زائل کرنا اس کا خاص فعل ہے، بچے، بوڑھے سب کے لئے مفید ہے بطور سرمہ دو دو سلائی سوتے وقت دونوں آنکھوں میں لگائیے، جواہرات ڈالے گئے ہیں۔ قیمت فی شیشی جو مہینوں کے لئے کافی ہے ۱۲ ار

کحل زرد جواہر والا

نظر کی کمزوری دور یا نزدیک کی چیزوں کا صاف نہ دکھائی دینا، دھند لاپن پانی گرنا اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے، عینک اتر جاتی ہے عینک والے حضرات اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لطف یہ ہے کہ اس سرمہ کا رنگ سیاہ نہیں ہے اسلئے لگانے کے بعد سرمہ دوسروں کو نظر نہیں آتا، جواہرات سے تیار کیا گیا ہے۔ قیمت فی شیشی عہ ر

کحل پیران

آنکھوں کی روشنی بڑھاتا ہے، دھند کو صاف کرتا ہے، پانی کو بند کرتا ہے خاص طور پر بوڑھوں کے لئے تیار کیا گیا ہے اسکے استعمال سے موتیا بند نہیں ہوتا بڑھاپے میں آنکھوں کی مجبوری سے بچاتا ہے، عجیب و غریب چیز ہے سوتے وقت اور صبح دو دو سلائی آنکھوں میں لگائیں۔ قیمت میں خاص رعایت فی شیشی ۸ ر

کحل جالا

ہسپتال کی دقتیں نہ اٹھائیے آپریشن کی ضرورت ہی نہیں یہ سرمہ جالا پھولا، ناخونہ، ماڑہ کو چند دن میں کاٹتا ہے بہتیرے لوگ اس کو بینا ہوئے قیمت فی شیشی عہ ر

نوٹ

کوئی تین شیشی سرمہ اکٹھا منگانے پر محصول ڈاک "صحت گھر" ادا کریگا۔

خط و کتابت کا پتہ:۔ جنرل منیجر "صحت گھر" بانکی پور پٹنہ

شیر کا شکار

ایک سچا واقعہ افسانوی رنگ میں

از جناب نصرت آروی

زخمی شیروں کے ... ایسے شکاریوں کی جانیں بہت زیادہ تلف ہوتی ہیں۔ شاید ہی کوئی شکاری ایسا بچا ہو جو اُس وقت کی صحیح کیفیت کا نقشہ الفاظ میں کھینچ سکا ہو جس وقت وہ اس خونخوار درندے کی آغوش فنا میں زندگی کے خواب دیکھ رہا ہو۔ ذیل کا واقعہ ایک انگریز شکاری اے۔ ڈبلو۔ اسٹریچن صاحب کی سرگزشت ہے جنھیں اس موذی جانور کی بدولت اپنا داہنا ہاتھ اور بایاں پیر ہندوستانی شفاخانے میں چھوڑ کر اور اپنی ملازمت کو الوداع کہہ کر وطن مالوف کی طرف مراجعت کرنی پڑی جہاں اب آپ اپنا بایاں ہاتھ مصوری کے شغل میں استعمال کر رہے ہیں اور ایک کتاب بھی شیر کے شکار پر تصنیف فرمانے کا ارادہ رکھتے ہیں (بیان تو ان کا ہی ہے مگر زبان میری ہے جسکی معافی کا موصوف سے امیدوار ہوں)

(ا)

بہتیرے ایسے شکاری جو کسی زخمی شیر کی جستجو میں گھنے جنگلوں میں پاپیادہ پھرے ہوں گے ان کو ایسے ایسے مواقع سے دوچار ہونا پڑا ہوگا جس وقت وہ اپنی دلیری پر کف افسوس ملتے اور اپنی جرأت پر نفریں کرتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ چند ہی خوش قسمت ایسے ہوں گے جو اپنے زخمی شکار سے ملاقات کرکے پھر انسانوں سے ملاقات کر سکے ہوں۔ چہ جائیکہ اپنا افسانہ دوسروں سے بیان کر سکتے۔ چنانچہ میرے سیدھے سادے بیان میں ممکن ہے اتنی دلچسپی اور ہدایت کا سامان مہیا ہو سکے جو بہرحال کسی شکاری کے لئے اس سے زیادہ سبق آموز ہو۔ جتنا کہ وہ خونخوار اور تیز دانتوں اور پنجوں سے خود حاصل کر سکتا ہے۔

یہ واقعہ سلہٹ کے ایک ضلع کا ہے جہاں مجھے ہندوستان کے "بہترین بڑے شکار" سے آخری بار دوچار ہونا پڑا ——— اگرچہ اس واقعہ کو ایک عرصہ گذر چکا ہے مگر مجھے "تیرہ" کا منحوس عدد برابر یاد رہتا ہے اور غالباً ہمیشہ رہے گا۔ میں بذات خود کسی شگون کا ہرگز قائل نہیں مگر شاید وہ لوگ جو اس کے ماننے والے ہوں گے وہ "تیرہ اگست" کے واقعہ کو میری خود لائی ہوئی مصیبت سے تعبیر کریں گے۔ بہرکیف میرے لئے تو وہ دن واقعی موت کی گھڑی سے کم کٹھن نہ تھا۔

چنانچہ اُسی ماہ کی بارہ تاریخ کو مجھے اپنے ایک پڑوسی چار بگان کے ایک دوست کا رقعہ ملا کہ اُس کی ایک گائے کو شیر نے گذشتہ شب میں مار ڈالا ہے۔ اس لئے اُس نے مجھے مدعو کیا تھا کہ میں بھی اُس کے ساتھ اُس شام کو مردہ گائے کے قریب چھپ کر شیر کی واپسی کا انتظار کروں۔ میں فوراً اسے پیشتر راضی ہو گیا۔ کیونکہ گذشتہ چند دنوں کے اندر میرے خود دو قلی اُس موذی کی نذر ہو چکے تھے۔ غالباً ان خونوں کی مجرم ایک شیرنی تھی جو دو بچوں کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ کیونکہ یہ قلی بیچارے مار کر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ کھائے نہیں گئے تھے)

(۲)

خونی کی واپسی

میں اپنے دوست کے بنگلے پر چار بجے شام کو پہنچ گیا اور فوراً ہی ہم دونوں موقعۂ واردات کی جانب چل کھڑے ہوئے۔ یہاں پر جنگل اور چائے کی جھاڑیوں کے درمیان ایک تھوڑی سی کھلی جگہ پر ایک پوری گائے جس کی گردن اینٹھی ہوئی اور زبان باہر نکلی ہوئی تھی مردہ پڑی تھی۔ مردہ گائے کے کوئی بیس قدم کے بعد ایک درخت پر نہایت ہوشیاری سے مچان باندھا گیا تھا۔ اس جگہ سے یقینی طور پر ہم لوگ اپنے ملزم (شیر) کی حرکات و سکنات کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ اگر وہ واپس آجاتا ——— مُردہ گائے کے عین مقابل قریب ہی جنگل نہایت گھنا تھا اور ہم لوگوں کی بائیں جانب تین چار فٹ اونچی اونچی گھاس کی جھاڑیاں تھیں۔ ....

گِدھوں کی خاصی جماعت قریب کے درختوں پر موجود تھی۔ اگرچہ اس وقت تک کسی نے اپنا کام شروع نہیں کیا تھا مگر ان میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی اور یہی چیخ و پکار فضا کے ہیبتناک سکوت کو مرتعش کر رہی تھی۔ جس وقت آفتاب غروب ہونے کے قریب آپہنچا تو دور سے چند کتوں کے بھونکنے کی آوازوں کے ساتھ قلیوں کی بستی کی جانب سے ڈھول کی "ڈھب ڈھب" کی صدا بلند ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا گِدھوں کے لئے یہ اشارہ تھا کہ وہ اپنا عمل شروع کریں۔ چشم زدن میں ہر چہار جانب سے ایک سیاہ آندھی آئی اور مُردہ گائے پر ایک متحرک پردہ پڑ گیا۔ مگر ——— یہ جماعت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

اچانک گھنے جنگل کے کنارے حرکت ہوئی اور ایک سیاہی مائل ہیبتناک شے جست کرکے اس سیاہ و ہنگامہ خیز حلقہ کے وسط میں داخل ہوئی...... ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو گیا...... بڑے بڑے بازوں کی پھڑپھڑاہٹ اور پرندوں کی سراسیمگی......

چشم زدن میں یہ بلائے بے درماں چند پھڑپھڑاتے اور تڑپتے ہوئے گِدھوں کے درمیان (جو اس آفتِ ناگہانی کے خونی پنجہ کی زد میں آگئے تھے) کھڑی تھی۔ دن کی آخری لالی میں اس کی رنگت قریب قریب سیاہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرنی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ خاموشی کے ساتھ ہم لوگوں سے بمشکل تیس ۳۰ گز کے فاصلہ پر کھڑی ہوئی۔ دُم کو آہستہ آہستہ پھراتی نظر آئی۔ اس کا سر اوپر کی طرف بلند تھا گویا اپنی قوت سماعت سے مدد لے رہی تھی۔

ہم دونوں کی رائفلیں بیک وقت کاندھوں تک پہنچیں کیونکہ جس انداز سے وہ کھڑی تھی "بند کی گولی" مارنے کا بہترین موقعہ تھا۔ مگر شام کا دھندلکا بہترین شست باندھنے کے منافی تھا۔ تاہم میں نے اپنی انتہائی قوت بصارت سے مدد لیکر شست باندھی اور گھوڑا دبا دیا...... میرے دوست نے غالباً پہلے پہل جنگلی شیر اتنا قریب دیکھا تھا اس لئے گھبراہٹ میں رائفل کا سیفٹی بٹن ہٹانا بھول گئے اور ان کی رائفل نے فائر کرنے سے انکار کر دیا.......... اس سے تو ہرگز انکار ہی نہیں کیا جا سکتا کہ میری گولی نے اپنا کام نہیں کیا۔ کیونکہ فوراً ہی ہم لوگوں نے قیامت خیز ہنگامہ بلند ہوتے دیکھا۔

قبل اس کے کہ میں اپنی "بارہ بور" والی بندوق اٹھاؤں (جو بہت ہی قریب موجود تھی)۔ زخم خوردہ شکار گرجتا۔ چیختا۔ لڑھکتا اور پلٹے کھاتا ہوا۔ عین میرے مچان کے نیچے سے گذر کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس شب کو آخری جھلک جو میں نے اس زخمی شکار کی دیکھی۔ وہ جنگل کے اندر سر نیچے اور پیر اوپر ایک جھاڑی میں داخل ہوتے نظر آئی۔ جس کے بعد اس کی گرج چیخ بھی بند ہو گئی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ مگر رات کے وقت اس یقین کو پختہ کرنا اور اسکی تصدیق ناممکن تھی۔

جب ہم لوگ واپس بنگلے کی جانب لوٹ رہے تھے تو یہ بات طے پائی کہ مسٹر "ایل" کو بھی رائیفل کے ساتھ بلا لیا جائے کیونکہ لوگوں کو معلوم تھا کہ ضلع بھر میں اُن سے اچھا نشانہ باز کوئی نہ تھا........ تاکہ وہ بھی کل سویرے ہملوگوں کے ہمراہ شیرنی کو تلاش کرنے چلیں کیونکہ ایک اچھے نشانہ باز کے علاوہ ایک تیسری رائفل بھی ہم لوگوں کی مدد کو شامل ہو جائیگی کیونکہ خدا نخواستہ اگر شیرنی زندہ ہوئی تو..........

(۳)

خون کے نشانوں کی رہنمائی

تیرہ ۱۳ تاریخ صبح کو نو بجے ہم تینوں دوست اُس خونی معرکہ کے لئے جنگل کی جانب روانہ ہوئے جو ہمارے دماغوں پر ہمیشہ کے لئے مُرتسم ہو جانیوالا تھا اور خصوصاً میرے لئے تو ہندوستان کی زندگی کا آخری باب تھا۔

ہر شخص کے ہمراہ اس کا اپنا منتخب شکاری موجود تھا۔ جو اپنے اپنے آقاؤں کے ساتھ کی بندوقیں سنبھالے ہمرکاب تھا علاوہ ازیں میرے دوست کے ہمراہ تو دس نفر قلی تھے جو "جھلاوہ" کرنے کے لئے لائے گئے تھے۔ تاکہ اگر اس کی ضرورت پڑ جائے تو کام لیا جا سکے۔

جب ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں شیرنی زخمی ہوئی تھی تو وہاں سے اس کے خون کے نشانات کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ بآسانی اس جھاڑی تک پہنچ گئے جہاں میں نے اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ مگر چونکہ یہ مقام اور ہم لوگوں کا ارادہ دونوں ہی خطرناک تھے۔ لہذا ہم لوگوں نے قلیوں کو حکم دیا کہ وہ اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے اس جھاڑی میں پھینکیں جہاں ہملوگوں کو شیرنی کی لاش کی موجودگی کا گمان تھا۔ مگر جب اس طرف سے کوئی آہٹ نہ ملی تو ہم لوگوں کی بندوقوں کی آڑ لیکر قلیوں نے خون کے دھبّوں کی رہنمائی جنگل کی گھاس کاٹ کر راستہ بنانا شروع کیا۔

اس طرح ہم لوگ آگے بڑھے۔ چند ہی قدم کے فاصلہ پر گھاس زمین پر دبی ہوئی ملی اور اس پر خون کے دھبّے بھی ملے جس سے معلوم ہوا کہ ہمارا شکار ضرور یہاں گرا تھا مگر اس کی لاش آخر کیا ہوئی........ پتہ یہ چلا کہ شیرنی یہاں پر گری تو ضرور اور کافی دیر تک یہاں پڑی بھی رہی کیونکہ خون کی خاصی مقدار یہاں پر موجود تھی۔ تاہم وہ ہوش میں آئی اور یہاں سے اٹھکر سامنے والے بانس کے جنگل میں داخل ہو گئی...

اب ہم لوگوں کو اپنے عزم کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا۔ کہ خصوصاً اس خطۂ ہند کے جنگل ایسے ایسے کارناموں کے لئے کس قدر خطرناک ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی زندہ ہو اور ہمارے مقابلے کی کافی طاقت بھی رکھتی ہو......... اس وقت........ بہرکیف کوئی دوسری صورت پیش نظر نہ تھی۔ صرف لفظ "شکار" کے سوا سب کچھ بھول گیا تھا۔ خیال یہ تھا۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے جلد اس کی تکلیفوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر یہاں "جھلاوہ" کرانا بالکل ناممکن تھا۔

خطرناک غلطی

چلتے چلتے ہم لوگ نہایت خاموشی کے ساتھ ہر خاص قسم کی آواز پر کان لگاتے اور ٹھہر جاتے کہ شاید کسی جانب سے کچھ آہٹ معلوم ہو۔ خون کے دھبّے ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔ اور اسی طرح احتیاط کے ساتھ ہملوگ قدم بقدم بڑھتے رہے۔ مگر کہیں ہمارے مقصود نگاہ کا پتہ نہ تھا۔ آخرش ہم لوگ بانس کے جنگل کے پاس پہنچ گئے اب کچھ اطمینان ہوا کہ کم از کم ہمیں تھوڑی دور آگے کی چیز تو نظر آسکے گی۔ چہ جائیکہ گھاس میں تو دو قدم آگے کی چیز بھی دیکھنی ناممکن تھی۔

اب آگے بڑھنا بھی پہلے سے آسان تھا۔ مگر خون کے دھبوں کو تلاش کرنا اس جگہ نہایت مشکل ہو گیا۔ بمشکل ہم لوگ خون کے مشکوک نشانوں کے سہارے ایک چشمے کے کنارے پہنچے۔ جہاں ریتیلی زمین پر اس کے پیروں کے نشان صاف دکھائی دینے لگے۔ اور اس چشمے کے دوسرے کنارے کے نشانات خاص طور پر یہ بتاتے تھے کہ شیرنی ضرور تاً اُس پار بھی جاتی آتی تھی۔ کیونکہ اُدھر کے نشانات خشک تھے۔

ابھی تک اس کا کہیں پتہ نہ ملا۔ اب ہم لوگوں کی ہمتیں کچھ پست ہونے لگیں کیونکہ اتنی دور چل کر بھی جب وہ اس چشمے کے پاس ٹھہری تو یقینی اس میں ابھی کافی طاقت مدافعت کی یا بھاگنے کی موجود ہے۔

تقریباً سو گز تک تو وہ اس چشمے کے کنارے کنارے گئی تھی اس کے بعد ایک گھنی جھاڑی میں داخل ہو گئی تھی۔ ایک خیال یہاں پر یہ ہوا کہ اب ہم لوگ چشمے کی دوسرے جانب جا کر تلاش کریں کیونکہ شک ہوتا تھا کہ وہ ضرور اُس پار گئی ہو گی۔ مگر اب چونکہ دن بہت چڑھ آیا تھا اور اس پار جانے اور آگے بڑھنے میں دیر ہو جانے کا امکان غالب تھا اس لئے آج صرف خون ہی کے داغوں کی رہنمائی پر اکتفا کرنا قرار پایا۔ .... کسے معلوم تھا کہ یہی احتیاط ہم لوگوں کے لئے اسقدر خطرناک ثابت ہو گی۔

قُلیوں نے گھاس کاٹ کاٹ کر راستہ بنانا شروع کیا اور ہم لوگ آگے بڑھے۔ میں سب سے آگے تھا کیونکہ شکار میرا تھا۔ میرے ہاتھ میں "بارہ بور" والی بندوق تھی جس میں ایک نال میں گولی اور دوسرے میں گراپیں بھری تھیں۔ یہ میرا اپنا تجربہ تھا کہ ایسے موقعوں کے لئے یہی اچھا ہوتا ہے۔ میرا شکاری میرے عقب میں بھری ہوئی رائفل کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے بعد مسٹر "ایل" اور پھر ان کا شکاری ان کے پیچھے میرا دوست اور ان کا شکاری تھا........ اُنہوں نے پیچھے رہنا اسلئے پسند کیا تھا کہ وہ تجربہ کار شکاری نہ تھے۔

شیرنی کے پنجہ میں

ابھی میں ایک کھُلے اور صاف حصّہ میں داخل ہی ہوا تھا جو تقریباً دس پندرہ فیٹ چوڑا تھا کہ....... یکایک میرے داہنی جانب کی گھنی جھاڑی کی طرف سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کی ہوئی کھانسی کی سی آواز آئی (جو کسی بڑے کتّے کی بھونک سے مشابہ ہو سکتی تھی) یہ یقینی شیر کی وہ خونی آواز ہوتی ہے وہ انتہائی غصّہ کی حالت میں انتقام کا پہلو اختیار کر لیتا ہے (جسے میں تا عمر نہ بھولونگا) میں فوراً اس طرف مخاطب ہوا۔ مگر جھاڑیاں اسقدر گھنی تھیں کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب آپ اسے میری حماقت کہیئے یا بدقسمتی کہ میں وہیں پر ٹھہر گیا تاکہ اگر وہ اس طرف آئے تو میں فوراً اُس پر فائر کر دوں۔

یہ غرغراہٹ کی صدا رفتہ رفتہ قریب ہونے لگی۔ ابھی تک باوجود انتہائی کوشش کے ہلتی ہوئی جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ حرکت قریب سے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ غالبًا وہ بڑی تیزی سے میری جانب آ رہی تھی اب مجھ پر اس کے حملہ کرنے کا ارادہ واضح ہو گیا........ یہ بھی سوچنے کا موقع نہ ملا کہ ایسے موقع پر مجھے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیئے........ میری آنکھوں نے اس خونخوار کو پہلی بار اس وقت دیکھا جبکہ وہ جھاڑیوں کے اندر سے جست کر کے ہوا میں معلق ہو چکی تھی۔ میری بندوق پہلے ہی میرے کاندھے سے لگی تھی۔ میں نے دونوں نالیں اس کی جانب اس حالت میں جبکہ وہ میرے اوپر پہنچ چکی تھی خالی کر دیں۔ دوسرے لمحہ میں مجھے ایک خوفناک عفریت پیکر چہرہ بندوق کے دھوئیں میں سے نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ اور معًا ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ میں زمین پر گر پڑا میری بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ غالبًا میرا گر جانا ہی میری جان بچنے کا سبب ہوا میرا اگلا حصّہ جسم اس کی زد سے بچ گیا کیونکہ میری بندوق نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ اور وہ میرے قدموں پر گر گئی۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس کے دونوں اگلے پنجے اور سر میں جان باقی تھی اور انہی کی مدد سے اُسنے مجھے اپنی جانب کھینچا پھر میرے بائیں پیر کو منھ میں دبا لیا۔

میں نے سُنا تھا کہ مرتے وقت انسان کے بُرے اعمال اس کے سامنے نظر آنے لگتے ہیں۔ لیکن اگرچہ میں کافی ہوش میں تھا تاہم کوئی ایسا واقعہ میرے سامنے نہ آیا۔ غالباً میرے دماغ کو اس کا علم تھا کہ مجھے مرنا نہیں ہے۔ اس لئے اس نے وہ منظر پیش نہ کیا۔

جس وقت شیرنی میرے پیر کے ساتھ مشغول عمل تھی اُس وقت مجھے زیادہ تکلیف یا کسی قسم کا درد محسوس نہیں ہوا۔ جس طرح کوئی رحم دل انسان ایک بلی کو چوہے کے ساتھ کھیلتا دیکھکر یہ سمجھ لے اور مطمئن ہو جائے کہ بلی تو صرف کھیل ہی رہی ہے۔ چوہے کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اسی طرح میں اپنے پیر کی طرف دیکھ کر تعجب کر رہا تھا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ سخت تعجب تو یہ ہے کہ شیرنی کے دانتوں سے تو مجھے کوئی تکلیف نہ معلوم ہوئی مگر جب ایک دھڑاکے کی صدا کے ساتھ رائیفل کی گولی جسے مسٹر "ایل" نے قطعی اور یقینی بہترین نشانہ کے ساتھ چلائی تھی شیرنی کے دماغ سے گذر کر میرے پیر کی ہڈی سے گذر گئی۔ حالانکہ اس سے قبل ہی شیرنی کے دانتوں سے میرے پیر کی ہڈیاں سُرمہ بن چکی تھیں اور اب اس معمولی ضرب کی تکلیف کے باعث میرے دماغ نے حقیقتاً چکر کھانا شروع کیا......

...... میرے ساتھیوں نے مُردہ شیرنی کے منھ کو زبردستی کھول کر میرا پیر باہر نکالا اور اس کے نیچے میرے داہنے پیر سے ہٹایا چنانچہ اس عمل کے بعد میں دوسروں کی مدد سے اُٹھا۔ اسوقت مجھے اپنے ماحول اور اپنی موجودہ حالت پر تبصرہ کرنے کا موقعہ ملا۔ سب سے پہلے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرا مستقبل تاریک ہو گیا۔

ایک گہرا زخم میری داہنی کہنی سے لیکر کلائی تک پھیلا ہوا تھا اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے بھس دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کب اس ظالم کے پنجہ میں آیا۔ میرے سینے پر تمام لمبی لمبی خراشیں آگئی تھیں اور میری ٹوپی چور چور ہو گئی تھی اس بیچاری نے میرے سر کی حفاظت میں اپنا حق ادا کر دیا ورنہ سر کی بھی خیر نہ تھی۔ .... اور جس وقت اُس نے مجھے اپنی جانب کھینچا تھا اس وقت میری دونوں جانگھوں سے گھٹنوں تک بہتیری خراشیں آگئی تھیں بایاں پیر تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ موجود ہی نہیں تھا۔

میرے مہربان دوستوں نے میری بہت مدد کی ورنہ میری موت یقینی تھی وہ مجھے موت کے منھ سے بچا کر اور سہارا دیکر جنگل کے باہر لائے۔

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اپنے رفیق حصۂ جسم کو شیرنی کے شکار کے نام پر قربان کر دوں کیونکہ اب وہ میرا ساتھ دینے کے بالکل اہل نہ تھے۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے میرا داہنا ہاتھ اور بایاں پیر کہنی اور گھٹنے تک علٰحدہ کر دیا۔ میری علالت کے دوران میں اس ضلع کے سارے انگریزوں نے کافی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ میں اپنی صحت کی طرف بہت جلد رجوع ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں تندرست ہو گیا۔

مجھے اپنے شکار یعنی اس شیرنی سے ایک ہی شکایت رہ گئی کہ اس نے مجھے اپنے ملک سے بھی نکالدیا۔ اور مجھے ہندوستان جنت نشان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا اور غالباً اس طرح اس کی قوم کے دیگر افراد کو مجھ سے بچ جانیکا موقعہ ملا.......

رباعی

[illegible] ملی آئی

[illegible] ملی آئی

[illegible] محمدی قوال [illegible]

[illegible] ملی آئی

([illegible] مرحوم [illegible])

خیالاتِ پریشاں

(از جناب شعلہ وارثی لکھنوی)

مختصر کہتا ہوں میں طور کے افسانے کو
آزمایا تھا فقط شمع نے پروانے کو

پھر کہیں چھیڑ نہ دے ہجر کے افسانے کو
حشر کا دن ہے نہ بلوائیے دیوانے کو

تم مری بات کا بیکار برا مان گئے
اک ذرا چھیڑ کے دیکھو کسی دیوانے کو

دل میں سو داغ ہیں ہر داغ میں ہے اک ناسور
کسی گلشن سے ملا لو مرے ویرانے کو

میکشوں سے یہ ضد اچھی نہیں ساقی تیری
توڑ ڈالیں نہ کہیں شیشہ و پیمانے کو

کیا خبر تھی کہ دلِ زار ڈبو دے گا ہمیں
ہم بھی آفت میں پھنسے چھیڑ کے دیوانے کو

دل کی پژمردہ کلی کھل نہ سکی آہ مگر
یوں تو آ ہی گئی گلشن میں بہار آنے کو

جام تھراتے ہوئے ہاتھ میں ساقی نے دیا
دل کو روکے کہ سنبھالے کوئی پیمانے کو

ابر کعبے سے دھواں دھار جو اٹھا شعلہ
توڑ کر توبہ میں چلتا ہوا میخانے کو

نظم متعلقہ تصویر

بچہ اور چاند

بہ نسبت ملاحظہ تصویر

از بلبلِ بہار حضرت شہیرؔ مینائی کاکوری گیاوی

سنور کے نکلی ہے اک حسینہ جھکائی ہوئی نظر ہے
لئے ہے گودی میں چھوٹا بچہ نگاہ تو نگاہ پر ہے

امید و ارمان و آرزو سے لدی ہے یادوں بھری جوانی
قدم قدم پر لٹائے جاتی ہے ایک دنیائے شادمانی

ہنسی دبائے ہوئے لبوں میں خوشی سے لبریز ہے مگن ہے
ہے ایک بہتا ہوا سمندر جو گوشۂ دل میں موجزن ہے

جگر کے ٹکڑے کو لیکے آغوش میں چلی ہے جگر کے بدلے
یہ چاہتی ہے کہ اسکو آنکھوں میں ہی رکھ لوں نظر کے بدلے

یہ ننھا منا سا خوش شکل و الا ہنستا ہوا کھلونا
خوشی کی تصویر دل کا ٹکڑا نظر کی ٹھنڈک جگر کا پارا

طرب کا نازک مزاج غنچہ نشاط کی اک حسین کونپل
ثمر گلستانِ آرزو کا نہالِ عشرت کا خوشنما پھل

نظر ہے بچے کی پیاری صورت پہ اور دل صرف التجا ہے
ادھر تو ہے احترام سجدہ ادھر محبت ہے مامتا ہے

بڑی محبت سے اپنے نورِ نظر کی صورت کو تک رہی ہے
یہ محویت ہے خبر نہیں کچھ کہ سر سے چادر سرک رہی ہے

لبوں سے اظہار ہوتا جاتا ہے یوں تمنائے دلنشیں کا
جوان ہو کر مرا مہِ نو بھی چاند ہو جائے چودھویں کا



بچہ اور چاند

ہم

از :- مولوی محمد فضل الرحمن صاحب پھلواروی

"ہم" ! ہاں "ہم" .... ایک چھوٹا سا لفظ ..... صرف دو حرفوں کا مجموعہ، مگر .... اپنی پہنائیوں کے لحاظ سے .... کیا کہنا .... سبحان اللہ ...... اور .... کچھ نہ پوچھئے .... بس ..... معاذاللہ

مضمون کا عنوان تو بلاشبہ ہم ہے، لیکن ہمیں اس گھڑی ہم کی تمام تر وسعتوں سے بہرہ گیر ہونا منظور نہیں۔ ناظرین میں .... جس کسی کا جی چاہے، چھان بین کرے، لغت کے اوراق الٹے، محاورات دیکھے، بندشوں کے بند کھولے اور روزمرہ ٹٹولے، ہمیں تو ہم سے بس اتنا مطلب ہے کہ جب "ہم" .... "ہم" کے نقاب کو اٹھاتے ہیں تو آتش نمرود اسی میں دیکھتے ہیں۔ اور گلزار خلیل بھی اسی میں۔ موسیٰ کی بے بسی بھی یہیں نظر آتی ہے۔ اور فرعون کی غرقابی بھی اسی میں .... برادران یوسف کے کید و مکر .... اسی پردہ پر .... یوسف چاہ ظلمت میں .... اسی کے طفیل .... طوق غلامی ..... آپ کی گردن میں .... اسی کے سبب .... پاک دامانی اور پاک دامنی مہر دو اسی ایک "ہم" کا کرشمہ .... آہ ! قید و زندان اسی کی بدولت اور پھر تخت و سلطنت اسی کی بخشش و مرحمت۔

ساتھ ہی

جب ہم لفظ "ہم" پر ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں جنت سے نکالا ہوا ایک ایسا خاکی پتلا نظر آتا ہے جسے کبر و نخوت کا مجسمہ کہئے تو کچھ بیجا نہیں، بندہ خدا ہو کر .... نعوذ باللہ .... خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔ نمرود کون تھا؟ .... ہم ہی بنی نوع انسان میں کا ایک فرد .... فرعون کون تھا؟ .... ہم ہی کل کا ایک جزو

لیکن

جب ہم "ہم" کی حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ فیضان قدرت کے قربان جائیے۔ آدم جیسی خشک و بنجر زمین پر ابر کرم کچھ ایسا منڈلا منڈلا کر جھوم جھوم کر برستا ہے کہ یہی وادی غیر ذی زرع "ہم" کے روپ میں ایک ایسا گلشن بن جاتا ہے جو کبھی مسجود ملائک ہوتا اور کبھی اشرف المخلوقات کے لقب سے ملقب ہو کر خلیفۃ اللہ فی الارض کہلاتا ہے۔ تصرف میں اس کے کون و مکان ہوتے ہیں اور قبضہ میں اس کے ہر ایں و جہان۔

ماننا پڑیگا

کہ جب "ہم" .... ہاں ہم نے اپنے اصل کی طرف مراجعت کی، اپنے توازن کو برقرار رکھا، اپنے منشا تخلیق کو سمجھا یا یوں کہئے اپنے آپ کو پہچانا تو نصف صدی میں نصف دنیا پر قبضہ کیا۔ کہتے ہیں قبیلہ حمیر کا بادشاہ، جو خدا کہلاتا تھا، خدائی کا لبادہ اتار .... جب اس نے "ہم" کا حقیقی روپ دھارا تو ایک ہی دن میں اٹھارہ ہزار غلاموں کی بیڑیاں کاٹ دیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ آدم کی اولاد نے اتحاد و اخوت

کی دنیا میں وہ مرتبہ حاصل کیا کہ جہاں خدا کی توحید اور انسان کی وحدت کے سوا، کوئی چیز موجود نہ تھی۔ نسل و خون کی تفریق کفر تھی، ملک و قوم کے اختلافات نہ تھے، امیری و غریبی کے امتیازات نہ تھے، فاتح و مفتوح کے درمیان حدِ فاصل نہ تھی۔ اور زبانوں .... ہاں! زبانوں اور رنگتوں کے سبب بے گانگی نہ تھی .... سمجھا آپ نے کیوں؟ .... پکار نے والے نے پکارا تھا:

تم سب انسانوں کی امت ...... ایک امت ہے، خدا سب کا پروردگار ہے۔
اس لئے تمام انسان .... صرف خدا سے ڈریں[۵۱]۔

اور یہ سن کر ہم نے، ہاں! ہم نے بے ساختہ کہا تھا:۔

ہم صرف خدا کی پناہ چاہتے ہیں جو .... سارے انسانوں کا بادشاہ اور سارے انسانوں کا معبود ہے[۵۲]۔

کاش تاریخ اپنے آپ کو دوہرائے اور خدا وہ دن ہمیں جلد دکھائے۔ آمین

---

۵۱ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ (قرآن کریم)
۵۲ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ لا مَلِكِ النَّاسِ لا اِلٰهِ النَّاسِ لا ″

جذباتِ مخمور ——— از جناب مخمور لکھنوی

سنا کے عشق کی روداد دلنشیں میں نے
بلا لئے مہ و انجم سرِ زمیں میں نے

چھپا کے دل میں غمِ دردآفریں میں نے
بنائی ایک محبت کی سرزمیں میں نے

عجیب چیز ہے یہ سجدۂ محبت بھی
بنا یا کعبہ جھکا دی جہاں جبیں میں نے

بہار دیکھو یہ رنگینئ تصور کی
بنا لیا ہے زمانے کو بھی حسیں میں نے

ہے فصلِ گل سے مجھے کس قدر پشیمانی
کہ پاس کھا نہ دامن نہ آستیں میں نے

ہزار آئے زمانے میں انقلاب مگر
تمہارے در سے اٹھائی نہیں جبیں میں نے

مٹا کے اپنے کو مخمور راہِ الفت میں
فلک بنا دی محبت کی سرزمیں میں نے

پی کہاں

(از ابو احمد سید عبدالوہاب صاحب شفق پریہنوی ایڈ ولیٹ گیا)

پھیلا ہے "پی کہاں" کا ایسا اثر پپیہا! — "پی پی" پکارتے ہیں، دیوار و در پپیہا!
میں بھی ہوں اک براگی او نوحہ گر پپیہا! — آ میرے پاس آجا، مجھ سے نہ ڈر پپیہا!
ہم دونوں مل کے ڈھونڈھیں پی ہے کدھر پپیہا!

اللہ رے بُردباری، کیا حوصلہ ترا تھا — یہ سوز تجکو بیشک روز ازل ملا تھا
جب عالمِ حوادث تکوین ہو رہا تھا — نورِ قدم کو تو نے دیکھا کہیں ذرا سا
اُس دن سے آج تک ہے شوریدہ سر پپیہا!

اُس دن سے چین تجکو اک دم کہیں نہیں ہے — اور بیخودی میں فکرِ دُنیا و دیں نہیں ہے
شوقِ مکاں نہیں ہے، پاس مکیں نہیں ہے — ہوشِ زماں نہیں ہے، یادِ زمیں نہیں ہے
دن رات ہے فضا میں، تجکو سفر پپیہا!

راتوں کی خامشی میں چکر ترا لگانا — پی کہہ کے تیرا آنا، پی کہہ کے تیرا جانا
"پی پی" کی بولیوں میں یوں سوزِ دل چھپانا — گو راز کا ترے ہو مشتاق اک زمانا
فرزانگی ہے پیشِ اہلِ نظر پپیہا!

نورِ طلب ہے ایسا تاباں تری نظر میں — اُٹھتا نہیں ہے کوئی ساماں تری نظر میں
معمورۂ جہاں ہے ویراں تری نظر میں — گلزار و دشت دونوں یکساں تری نظر میں
اعلےٰ ترین ہے تیرا مدِّ نظر پپیہا!

گلگشت چاندنی میں مقصد نہیں ہے تیرا — رستے میں تیرے حائل ہوتا نہیں اندھیرا
تو نے تو عیش و راحت دونوں سے منھ کو پھیرا — آرام گاہ تیری، کیسی کہاں بسیرا
ملتا نہیں ہے جبتک یتیم کا گھر پپیہا!

مرغوبِ اہلِ دل ہے یہ ناغمی ترانہ　　سن سن کے تیرے نغمے بیتاب ہے زمانہ
سینے میں تیرے مضمر گو ہے ترا فسانہ　　اسرار سے بھرا ہے انداز والہانہ

پر اپنے رازداں سے پردہ نہ کر پپیہا!

گو چشمِ ظاہری میں سرگشتہ ایک تو ہے　　کھوئے ہوئے پی کی لیکن لاکھوں کو جستجو ہے
فرقت میں کوئی نالاں ہے اور کوئی شکوہ گو ہے　　ملنے کی پی سے لیکن ہر اک کو آرزو ہے

درد آشنا ترے ہیں لاکھوں بشر پپیہا!

بہتر یہ ہے کہ تو بھی انساں کے پاس آئے　　دردِ جدائیِ فرقت دل کھول کر سنائے
ممکن ہے کوئی سیدھا رستہ تجھے بتائے　　یا تیرے ساتھ ہو کر پی پی کی رٹ لگائے

وہ ہو رہے ترا ہی اک ہم سفر پپیہا!

گم کردہ کو پھر اپنے سارے جہاں میں ڈھونڈے　　عرشِ بریں پہ ڈھونڈے کون و مکاں میں ڈھونڈے
دیر و حرم میں ڈھونڈے اور لامکاں میں ڈھونڈے　　اور سر جھکائے اپنی روحِ رواں میں ڈھونڈے

چھوڑے نہ کوئی گوشہ المختصر پپیہا!

جب ہر طرف سے تھک کر لوٹے بیاسِ حرماں　　اور وصلِ دوستاں کا آئے نظر نہ ساماں
منھ تک نکال لائے سینے سے دردِ پنہاں　　اک سانس جس سے ٹوٹے بے ساختہ رگِ جاں

مٹ جائے پھر خودی کا سارا اثر پپیہا!

پھر کامیاب عاشق جیسے نہ رنجِ فرقت　　وصلِ دوام دیکھے شوریدۂ محبت
مٹ جائے ساری کلفت مل جائے دل کو راحت　　اور سختیوں کی دل سے سب دور ہو کدورت

خورشید بن کے چمکے داغِ جگر پپیہا!

سرما کی ہو نہ سردی ہو دھوپ کی نہ حدت　　سایہ فگن ہو سر پر اک سائبانِ رحمت
ہو جس کی دل کو رغبت حاصل ہو وہ مسرت　　لگ جائے منھ سے آ کر خود میوۂ محبت

نظارۂ تجلی ہو شام و سحر پپیہا!

خمخانۂ عابدؔ

از جناب سید زین العابدین عابد نقوی (مصنف ... گیا)

ٹپکے جو اشک آنکھوں سے چُلّو لگا دیا — دل کا لہو ہتھیلی پہ رکھ کر دکھا دیا
تسکین دی کبھی نہ کوئی آسرا دیا — جب آئے تو چھیڑ کے مجھ کو رُلا دیا
اظہارِ صبر سامنے اُن کے ضرور تھا — آنکھوں سے آنکھ نم تھی مگر مسکرا دیا
وہ سُننا چاہتے تھے مرا حال مختصر — سب نے کلیجہ تھام کے آنسو بہا دیا
سب کی نظر ہے اب مرے حالِ تباہ پر — پردہ ہی خود جب اُٹھا تو تماشا بنا دیا
پابندِ وقت و رسم نہیں میری بندگی — جب نام لب پہ آگیا سر بھی جھکا دیا
صرف اعتبار ہی نہیں [illegible] کو آپ کے — تم نے تو زندگی کا سہارا بنا دیا
منہ پھیر کر تو جاتے ہو [illegible] ہے — [illegible] زندگی نے [illegible] میں جلا دیا
آنکھوں کو جستجو تھی [illegible] پر تھی — دل [illegible] لیا تھا لیکن یوں مٹا دیا
آنسو بہائے آپ نے جب انتہا ہوئی — دنیا کو بے بسی کا تماشا دکھا دیا
اللہ کتنی سخت تھی دو دن کی زندگی — ہچکی جو آئی موت کی میں مسکرا دیا

ذوقِ سخن دیا ہے تجھے عابدؔ خدا گواہ
اہلِ گیا نے مجھکو سخنور بنا دیا

تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا

از حضرت فریدہ عنا پام ولا - اردل

"تم نے آنے میں بہت دیر لگائی"

"ہاں"

"مجھے تو یقین ہو چلا تھا کہ اب تم نہیں آؤ گے"

"ایسا بھی ہو سکتا تھا"

"سچ کہتے ہو"؟

"بالکل سچ"

"تو پھر تم چلے جاؤ آج تنہا ہی ٹہلنے جاؤنگی ——

—— جا سکتے ہو"؟

"نہیں جا سکتا!"

"کیوں"؟

"کیا معلوم ...؟"

"تو چلو جلد ہی ٹہل کر واپس آجائیں ——

کیا سوچ رہے ہو تم"؟

یہی کہ اسوقت کہیں جانیکی بجائے بیٹھکر باتیں کی جائیں ——!

"باتیں"؟

"ہاں"!

لیکن اس کے لئے تو اور بہت سے وقت ملسکتے ہیں۔:-

"تاہم میں نہیں جانے پر مجبور ہوں!"

"تمہاری خواہش!

"تمہارا شکریہ"

"نہیں بیٹھو گے یا کمرے میں چلکر؟"

"تم کیا چاہتی ہو ——؟

"آج بہت سردی ہے"

"لیکن یہ مناظر کہاں کمرے میں نظر آئینگے۔ اچھا چلو کمرے ہی میں!

"گھبرائے سے کیوں معلوم ہو رہے ہو"؟

"نہیں جانتا!"

"بہت خوب، اس حد تک خود فراموشی"؟

"جی ہاں!

"اس دریچے پر بیٹھ جاؤں"؟

"بیٹھ جاؤ" ——

اور تم ——؟

میں اپنی کرسی اس جگہ کر لیتی ہوں"

"یہاں سے بھی فطرت کی رنگینیوں کا کافی مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ آج کی شام بڑی رومان پرور ہے ——

"لیکن تم اداس ہو رہے ہو!"

"ہونگا! چپ کیوں ہو گئیں؟"

"نہیں تو"

"کچھ سن رہی ہو؟"

"ہوں"۔

"کیا؟

ملاح کے گیت ۔ آج بڑے ہی دھیمے سروں میں گا رہا ہے۔

"اور مجھے یہی چیز بہت عزیز ہے"

"نہیں ——— کیوں؟"

"میں کیوں بتاؤں؟"

"مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں"!

"آداب عرض ہے"!

"دیوانے ہو تم"۔

"اور کچھ ——— ؟

"چپ رہو۔ سنو تو وہ کیا گا رہا ہے"؟

"کوئی رومان"

ہاں ——— کوئی رومان! "تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا

——— "!

"کیا کہہ رہا ہے؟"

"تم بتاؤ ———"!

"بتا دوں؟"

"نہیں" ———

(تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا)

"کس سے کہہ رہا ہے؟"

"کیا جانوں ———"

"مجھ سے پوچھو تو بتا دوں ———"!

"شکریہ میں نہیں جاننا چاہتی ———"

(مست بنایا روپ دکھایا ———")

"غریب ملاح ———"

"تمہیں اس سے بڑی ہمدردی ہے"!

"ہاں قابل افسوس ہے بچارا" ———

"پردیسی ملاح ———"!

(مست بنایا روپ دکھایا ———)

"آواز غم انگیز ہے"۔

"ہاں کسی مایوس محبت کی طرح ———"!

چاندنی میں اس کی کشش کنول کا پھول معلوم ہو رہی ہے:

"اور اس کا نغمہ"؟

"رنگ و بو ———"!

(ایک نئی دنیا ہی بسایا ——— ")

"تم بھی کوئی رومان سناؤ"!

"کوئی ——— رومان اسی ملاح کی طرح ———؟

"ہاں ———"

"اچھا تو اپنی کرسی اور قریب کرو سرگوشی میں کہنا چاہتا ہوں"

"کیسی سرگوشی"؟

(تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا ———")

"اسی ملاح کی سی سرگوشی ———"!

(تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا ———)

"اس رومان کا عنوان بھی یہی ہے"!

"عجیب آدمی ہو تم" ———

تمہارا خیال درست ہو سکتا ہے ۔ ہاں بالکل عجیب ———!

"——— گرمی کی چھٹیاں اس نے ———"!

"کس نے"؟

"یہ نہیں بتاتا"۔

——— اپنے ایک دوست کے یہاں گذارنے کا قطعی فیصلہ

گیا تھا۔ بار بار ایک جگہ جانے سے اسکی طبیعت اکتا سی گئی تھی۔

"تمہارا طرز بیان بالکل عجیب ہے۔ مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔"

"معاف کرو گی۔ اسی کی مشق ہے اگر خواہش نہیں تو چپ ہو رہتا ہوں۔"

"نہیں تم کہتے جاؤ۔"

(ایک نئی دنیا میں بسایا ہے)

"غریب ملاح کی آواز دم بدم ڈوبی جا رہی ہے۔"

"ہاں!"

ہوائیں بھی کچھ گنگنا رہی ہیں ——— شائد کوئی رنگین پیغام ——— !

— لیکن اس نے تھوڑے ہی عرصے میں یہ محسوس کیا کہ رفتہ رفتہ وہ دلچسپی باقی نہیں رہی اور اس کا دل پھر انہیں بے کیفیوں کا آماجگاہ بن گیا۔

دن تو کسی نہ کسی مشغلے میں گذر جاتے ——— اور راتیں ایک مستقل عذاب تھیں۔ وہ سخت حیران تھا کہ باقی دن کیوں کر اور کس طرح گذریں گے؟

اُس کا عزیز دوست اُس سے ہنوز بے خبر تھا۔

اس پہ کیلئے اُس کی آمد ———

"نام کیوں چھپاتے ہو؟"

"میں مجبور ہوں۔"

— ایک پیام شادمانی تھی۔ ایک نئی زندگی کا افتتاح!

بچپن کے دن، گرمی کی دوپہر دن میں آم کے سایوں میں کھیلنا۔ ——— ندی کے اُس پار ——— شکار کو جانا۔ اور پھر کنواں پر بیٹھ کر بھولی اور کمسن لڑکیوں کو ستانا ———

——— یہ تھے وہ احساسات جس کی مظہر اس کی متبسم آنکھیں تھیں۔ وہ پھر روز اس کے لئے ایک نہ ایک دلچسپیوں سے سامان فراہم کرتا۔

تاش اور کیرم تو جلد ہی بے لطف ہو کر رہ گئے۔ شکار سے بھی قلیل ہی مدت میں اس کی طبیعت اچاٹ ہو کر رہ گئی۔

کچھ دنوں تک دونوں کو کشتی رانی کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن وہ بھی زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔

ایک دن اُس نے سوچا کہ کیوں نہیں اپنے دیرینہ مشغلے سے دل بہلانے کی کوشش کیجائے۔ شاید اس طرح کامیابی ہو۔ سکا اس کی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر چمک اُٹھیں۔

——— اور خشک لبوں پر مسرتوں کی دھندلی سی جھلک نمودار ہو گئی ———

وہ کوئی عشقیہ راگ الاپتا ہوا اُٹھا ——— اور کمرے کی تمام کھڑکیاں اس نے کھول دیں ——— آفتاب پہاڑ کے دامن میں آہستہ آہستہ چھپ رہا تھا ——— اور اس کی زرد کرنیں کائنات سے گلے مل کے رخصت ہو رہی تھیں۔

دور کچھ ادھر نیچے ٹیلوں پر ——— چند دہقانی لڑکیاں ——— آپس میں کوئی کھیل ——— کھیل رہی تھیں معصوم اور سادہ دلوں کا کھیل ———!

اس نے دیکھا اور دیکھتے رہنے کی خواہش محسوس کی ——— لیکن اسے خیال ہوا کہ کوئی کام کرنا ہے ——— یکلخت وہ چونکا۔ شام کی تاریکیاں بڑھتی جا رہی تھیں ——— اور اس کا کمرہ ہنوز اندھیرا تھا۔ وہ کچھ مضمحل سا ہو گیا۔ کیونکہ تکمیل کے لئے اب وہ وقت کہاں تھا!

تاہم اس اضمحلال میں ایک قسم کی طمانیت تھی۔ ایک قلبی سکون ——— وہ تمام رات ایک "خواب جمیل" دیکھتا رہا ———!

صبح ہوئی اور وہ مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں پہونچا چند لمحہ تک وہ سیٹی بجاتا ہوا اسی دریچے پر کھڑا رہا۔ اور پھر ایک ہوبل

انگڑائی کے بعد اس نے "تصویر کشی" کے تمام سامان نکالے۔ اس نے محسوس کیا کہ آج سے پہلے وہ اس فن سے یکسر نابلد تھا ——— !

بہرکیف اس نے انتہائی سرگرمی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ پہاڑ، ریت، آفتاب، شفق، دریا، درختوں کے جھنڈ، اور شام کا رنگین دھندلکا ———

یہ تھی اس کی کل کائنات! اسی اثنا میں اس نے غور کیا کہ آج گھر میں غیر معمولی شور سا ہے۔ چند نئی صورتوں نے آدمی ادھر آ جا رہے ہیں۔

اسے ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ باوجود انتہائی کوشش کے بھی وہ اس معاملہ کو سمجھ نہ سکا۔ آخرکار برش ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑا۔ اور وہ بے اختیارانہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ موٹر، آدمی، اسباب؟؟ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا۔

یکایک اس نے دیکھا کہ اس کا دوست ہنستا ہوا ایک کمرے سے نکلا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے کچھ پوچھا لیکن وہ بدستور ہنس رہا تھا۔

"تمہارا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے"؟

(سوئے ہوئے ہردے کو جگایا ——")

ملاح ابھی تک اپنا رومان سنا رہا ہے ———

تمہیں کون پسند آیا یہ یا وہ؟"

"تمہارا رومان عجیب ہے ——!

"شاید ———"

دوسرے دن اس نے دیکھا کہ گھر میں کافی رونق آگئی ہے اور وہ ویرانی بالکل مفقود ——— دوست نے بتا دیا تھا کہ اس کی خالہ زاد بہن آئی ہیں ——— یہ خبر اس کے لئے بے معنی سی چیز تھی۔ لڑکیوں سے اُسے کیا غرض؟؟

وہ بے پروایانہ تصویر بنانے میں مشغول تھا۔ دن دن بھر وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ ایک طرف اس کی میز پر چند خطوط اور متعدد رسالے بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ یقیناً اس کی طرف دیکھنا اُس کے لئے زحمت نظر تھا۔ وہ ان دنوں خود کو کسی دوسری دنیا میں پا رہا تھا۔ جس کا زیادہ حصہ پراسرار تھا۔ اور حیرت انگیز ——— !

(تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا ——")

تصویر بنانے میں وہ بڑی حد تک منہمک تھا ———

——— ایک دن وہ صبح سے

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں ———"

ہواؤں کی چھیڑ سے اس کے بال الجھ کر پیشانی پر آ رہے تھے۔ وہ پریشان تھا تھکا تھکا سا!

"تم کیا بنا رہے ہو؟"

ایک نئی آواز اسے چونکا دینے کیلئے کافی تھی۔

"تصویر ———!" اس کے لب تھرائے۔

"تم کیا بنا رہے ہو؟"

وہ پلٹا دروازے پر ایک لڑکی اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی۔ چند منٹوں تک دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے۔

"تم کیا بنا رہے ہو؟"

"ایک تصویر!"

"دیکھوں ——— مجھے دکھا سکتے ہو؟"

لڑکی کی آواز قریب تر ہوتی گئی۔ اور وہ اس وقت مذاق ہی سے دل ہی دل میں جل رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کل کی طرح آج بھی پہاڑ نامکمل نہ رہ جائے۔ اور یہ اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ بات تھی!

شاید تمہیں نیند آرہی ہے؟ نہیں تو ــــ!
تو پھر تمہیں گھبرائی سی کیوں معلوم ہو رہی ہو ــــ؟
(سوئے ہوئے ہردے کو جگایا ــــ")
"اف تمہارا ہاتھ کس قدر سرد ہو رہا ہے؟"
"لاؤ میں انہیں گرم کردوں!"
"کس طرح ــــ؟
اپنے شال میں چھپا کر ــــ"
(تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا ــــ")
"دیکھتی ہو۔ کشتی درختے کے نیچے آگئی ہے۔ شاید ملاح بھی یہ رومان سننا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی کشتی کی رفتار دھیمی کردی ہے"۔

لڑکی دیر تک اس کے پیچھے کھڑی رہی۔ اور وہ اپنی تصویر پر نظر جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا ــــ
ــــ شاید رات کا خواب اور اس کی صحیح تعبیر ــــ
اس دن کے بعد وہ لڑکی ہر روز اس کے کمرے میں آنے لگی۔ شرمائی شرمائی سی۔ اس کی مخصوص جگہ وہ میز تھی جس پر وہ تصویر بناتا۔ جب تک تصویر بنتی رہتی۔ وہ اسے دیکھتی رہتی۔ اُسے تصویر سے ایک دلی وابستگی پیدا ہوگئی تھی۔
اب اسے بناؤ ــــ اس میں یہ رنگ دو تو بہت خوبصورت ہو۔ آفتاب اور زرد ہونا چاہیئے۔ شفق کو اور گہرا کر دیتے تو بہت اچھا تھا ــــ!
یہی اُس کی روز کی باتیں تھیں ــــ
وہ بغور سنتا رہتا۔ اور اس کی حسین آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی نازک اور مرمریں انگلیوں سے کھیلتے ہوئے ــــ اور پھر اس حکم کی تعمیل اس کی خوش قسمتی کا باعث تھی ــــ!
(تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا ــــ")

لڑکی مسکراتی ہوئی اپنی نگاہیں شرم سے جھکا لیتی اور وہ ایک غیر معلوم تاثرات میں ڈوب جاتا ــــ!
(تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا ــــ)
چھٹیوں کے دن جلد جلد گذرتے چلے جا رہے تھے۔ اور تصویر ہنوز نامکمل تھی۔ اچانک اس کی ذہن میں ایک بات آئی۔ ہمّن نکلیف دہ اور شدید طور پر حوصلہ شکن!!! اُسے یقین تھا کہ وہ اس طرح کامیاب ہو سکے گا ــــ قطعی ــــ
ــــ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ میں پھر اپنا ایک ایک لمحہ تصویر کشی میں صرف کردونگا۔ میرے ہاتھ اب ہرگز نہیں کانپ سکتے ہیں ــــ اور نہ مجھ پر وہ کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ عجیب اور نا فہم کیفیت ــــ!
کمرے میں پہونچکر اس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے دروازے بند کر دئے اس کا سر چکرایا۔ اور وہ دھم سے کرسی پر گر پڑا۔ "آہ ــــ کسقدر ناقابل برداشت ہے یہ کام ــــ نہیں میں ایک سنگین گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ اپنا گلا خود سے گھونٹ رہا ہوں۔ اس صورت میں مجھ سے نہیں رہا جاتا ــــ وہ ــــ وہ آتی ہوگی۔
ــــ ہاں ــــ خراماں خراماں معطر معطر"!
اس نے محسوس کیا کہ کوئی کواڑوں میں ہلکا ہلکا دستک دے رہا ہے!
وہ آگئی ــــ وہ میری حسین تیتری ــــ!
میں اندر آسکتی ہوں ــــ؟ حسین تیتری! وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا
"(تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا ــــ")
"کیا میں اندر آسکتی ہوں ــــ؟"
یقیناً ــــ وہ اٹھا۔ لیکن دو چار قدم چل کر پھر لڑ

مڑتا ہوا وہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ "میں ——— آہ میں ——— مجبور ہوں۔
——— آہ معاف کرنا۔ گرچہ ناقابلِ تلافی جرم میرا ——— چھٹیوں
کے ——— چھٹیوں کے دن۔ صرف چند صرف چند۔ بچے ہیں۔
——— او ——— اور یہ مجھے تصویر ——— تصویر مکمل کرنا
ہے۔ مکمل کرنا ہے!" ان الفاظ سے کمرہ گونج رہا تھا ——— !

چند دنوں کے بعد اس کی تصویر تصویر نہیں تھی ——— بلکہ اس کی ساری آرزوؤں کا مرکز۔ اس کی تمناؤں کی انتہا۔ اور ایک خواب مسلسل کی حسن تعبیر ———

اس نے بارہا اسے کن کن جذبوں کے ماتحت دیکھا ——— وہ جانتے ہوئے بھی یکسر ناواقف تھا۔

"تصویر لئے ہوئے وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھ کر پھر واپس اندر چلا آیا ——— اسے کسی کی جستجو تھی۔ کس کا ——— انتظار"

گھنٹوں گذر گئے۔ لیکن اس کی زندگی کا آفتاب کہیں پر طلوع نہ ہوا۔

وہ کانپ گیا۔ "یقیناً وہ مجھ سے برہم ہوگئی ——— اور ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ میرا قصور کوئی معمولی قصور نہ تھا۔"

یکایک خوشبوؤں کا ایک لطیف جھونکا اس کے قریب سے گذرا۔ وہ گھبرا سا گیا۔ وہ لڑکی اس کے پاس کھڑی تھی۔ خلافِ امید اس کے لبوں پر وہی رنگین تبسم کھیل رہا تھا۔

اس نے دیکھا اور اس کی خوفزدہ نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آج اس کا حسن ——— حسن نہیں بلکہ ایک قیامت تھی ——— !

(مست بنایا روپ دکھایا ———)

"اس میز پر بیٹھ جاؤ!"

آخرکار اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا ——— "آؤ بیٹھ جاؤ" ——— رہ رہ کر اس کی کانپتی ہوئی آواز کمرے میں تیر جاتی ——— ! بیٹھنے کے بجائے اس نے چاہا کہ وہ چپ چاپ واپس چلی جائے ——— لیکن ناکام رہی۔ کیونکہ وہ سدِ راہ تھا ——— !

سہمی سہمی سی وہ اس کونے پر بیٹھ گئی ——— اس دن دونوں کے درمیان ایک طویل خاموشی حائل تھی ——— لطیف اور با معنیٰ!

(ایک نئی دنیا میں بسایا ———)

"تمہاری تصویر مکمل ہو چکی؟"

اس نے رک رک کر پوچھا!

"بالکل!" یہ کہتے ہوئے اس نے دراز سے تصویر نکالی اور اس لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔

"تمہیں پسند آئی؟"

"یہ تو نہیں مدت ہوئی کہ معلوم ہو گیا ہے"!

"تو پھر ———"

"ہاں کہو!"

"نذر کرنا چاہتا ہوں ——— اپنی ——— اپنی محبت کی دلہن ——— یادگار ——— یہ الفاظ لیکن اس کے لبوں تک آکر رک گئے!

چند لمحوں کے بعد اس نے یقین کر لیا کہ اس کی "نذر محبت" قبول ہو چکی ہے۔

چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اور وہ اسی شام کو وہاں سے چلا آیا ——— ! "اندھیرے میں تم دیوار کی طرف کیا دیکھ رہی ہو ——— ؟ میں نے تمہیں چھپ کر آتے دیکھتے دیکھ لیا!"

"ایک بار پھر اس کی طرف دیکھو ——— اور پھر بتاؤ۔ کہ تم نے کیا محسوس کیا؟ اچھا ——— اب میری طرف ——— دیکھو! تمہاری نگاہیں شرمگین کیوں ہو رہی ہیں؟؟

ڈھوڑھا مکسچر

جاڑا بخار اور ملیریائی بخار یا ہر قسم کے بخار، طحال ورم جگر وغیرہ سے بچنے کے لئے ڈھوڑھا مکسچر پیجئے۔ ڈھوڑھا مکسچر ان تمام بیماریوں کی اکسیر دوا ہے جو چوبیس (۲۴) گھنٹہ میں اثر کرتی ہے اور ان تمام بیماریوں کو جڑ سے کھو دیتی ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ: ہر ایک دوکاندار یا ڈاکٹر ضمیر احسن۔

گیا سنٹرل میڈیکل ہال گیا

عورت سے خطاب

(از جناب مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

اے کہ تو پیدا ہوئی مہر و محبت کے لئے
باعثِ رحمت ہے تیری ذات خلقت کیلئے

صنعتِ صنّاع کا اک رازِ سربستہ ہے تو
مختلف اوصاف کا رنگین گلدستہ ہے تو

حبِّ فطری نے اُٹھا دی تیرے چہرے کی نقاب
عصمت و عفت رہی لیکن حجاب اندر حجاب

مضطرب رہتی ہے کیا کیا؟ فکرِ اصلاحات کی
رنگِ ہمدردی میں سرتاسر ہے تو ڈوبی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں ہوتے ہیں سب محوِ خواب
کروٹیں لیتا ہے تیرے دل میں قومی اضطراب

آرزو شہرت کی ہے تجکو نہ حسرت نام کی
فکر رہتی ہے مگر دن رات قومی کام کی

جب ہوا بیچین سینے میں ترا جوشِ عمل
سعیٔ پیہم بن گئی خلّاقِ اسباب و عمل

مزرعے حسنِ عمل کے پھولنے پھلنے لگے
سرپرستی میں ادارے مختلف چلنے لگے

تیری خدمت کا ہوا یوں اعترافِ برتری
پیش کی سرکار نے میونسپل کی ممبری

مخلصانہ خدمتوں سے اپنی پایندہ بنی
کونسل میں جا کے تو قومی نمایندہ بنی

زندگی کی آن پیدا ہے ترے کردار سے
منزلیں طے ہو رہی ہیں سُرعتِ رفتار سے

جا رہی ہے سیل کے مانند منزل کی طرف
موجزن سینے میں ہے تقلیدِ بزرگانِ سلف

دیکھ کر یہ جوش یہ طرزِ عمل یہ ولولا
دیکھنے والوں کے دل سے صاف آتی ہے صدا

کامگاری، کشتِ زارِ سعی کا حاصل بنے
رفعت و عظمت الٰہی آخری منزل بنے

بزمِ قومی میں بہارِ عیش بے اندازہ ہو
تیری کوشش موجبِ دورِ حیاتِ تازہ ہو

انگریزی سے ترجمہ

اردو کی ابتدائی شاعری

از جناب ڈاکٹر نسیم گورگانوی

مسٹر پرمیلو۔ اثار حق انگریزی زبان اور بنگلہ زبان کے مشہور ادیب ہیں، آپ کا ایک مضمون "اردو کی ابتدائی شاعری" کے عنوان سے روزنامہ "ہندوستان اسٹینڈرڈ" کلکتہ کے "پوجا نمبر" سنہ ۱۹۳۹ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوا ہے، جس کا لفظی ترجمہ ہم قارئین "سہیل" کی دلچسپی کے لئے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ اس مضمون کے مطالعہ سے زبان اردو کی ہمہ گیری اور مضمون نگار کی وسیع معلومات دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (گورگانوی)

بلاشک وشبہ اردو زبان ہندوستان کی ملکی زبان ہے۔ اس کی پیدائش نشو ونما اور ترقی ہندوستان ہی میں ہوئی ہے۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے اردو رسم الخط میں اپنی تحریریں قلمبند کیں، گرچہ سو فیصدی فارسی الفاظ اُس وقت کی اردو میں رائج تھے۔ لیکن پھر بھی یہی زبان تھی۔ جو غیر ملکیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بات چیت کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اپنی اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے امیر خسرو نے اس زبان کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔ ان کا مقابلہ اگر زمانۂ حال کے شاعروں سے کیا جائے تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ امیر خسرو کی اردو موجودہ اردو کے مقابلے میں ذرا کریہہ اور بھونڈی تھی۔ لیکن اس کے باوجود امیر خسرو کو اردو زبان کا جدِ امجد ماننا پڑے گا۔

امیر خسرو کے بعد جتنے شعرا گذرے انہوں نے کسی نقطۂ نظر سے بھی اس زبان کی نمایاں خدمت سرانجام دی۔ چنانچہ جہاں تک کہ اردو لٹریچر کا تعلق ہے ایک عرصہ تک یہ زبان اپنی حالت میں پڑی رہی لیکن اس کے بعد یہ غیر ملکیوں اور ہندوستانیوں کے آپس میں تبادلۂ خیالات کی وجہ سے خود بخود ترقی کر کے ایک وسیع زبان بن گئی۔

یہ ایک تعجب کی بات ہے کہ اردو کی داغ بیل تو شمالی ہندوستان میں ڈالی گئی۔ لیکن اس کے بامِ ترقی کا سب سے پہلا زینہ دکن تھا۔ مغل شہنشاہ بھی اس زبان کی جادو اثری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور انہوں نے اُس کی سرپرستی قبول کر کے دکن کو اس کی ترقی کا مرکز قرار دیا۔

دکن میں اس زبان کی نمایاں ترقی کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی اسلامی سلطنتوں نے ہندی زبان کو بھی اپنے شاہی درباروں میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُس زمانے کے چمن اردو کی آبیاری میں ہندی نے بھی کافی مدد دی۔ اور اردو اُسی وقت سے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد قرار دی گئی۔ ہندی ادب کی خدمتوں کے سلسلے میں مثال کے طور پر سلطان ابراہیم عادل شاہ

کی وہ خاص ہدایت پیش کی جاسکتی ہے۔ جس کی بنا پر اس کے دفاتر میں بہت سی دستاویز اور کاغذات ہندی رسم الخط میں لکھے جاتے تھے۔ اکبر اعظم کے دورِ سلطنت میں سلطان محمد قلی قطب شاہ آف گولکنڈا نے ایک قانونی صحیفہ اردو نظم میں مرتب کیا تھا۔ جسے اردو کا سب سے پہلا دیوان کہا جاسکتا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف یہ کہ اردو کے مربی تھے۔ بلکہ ایک شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری گرچہ معیارِ ادب پر پوری نہیں اترتی ہے، تاہم اُس وقت کے حکمرانوں اور شاعروں میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت ایک شاعر کی حیثیت سے بہت اہم تھی۔ اُن کی سرپرستی نے اردو کی ترقی میں بہت مدد پہنچائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رؤسا اور امراء کے گھروں میں یہ زبان رائج ہوگئی ہے۔ جس طرح کہ اردو آج کل عوام میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اُنکے جانشینوں کے لیے شعر شاعری کا ذوق اُن کی سلطنت کے حق میں تنزل کا باعث ثابت ہوا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کا آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ گرچہ اپنی شاعری کے اعتبار سے ایک بلند پایہ شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ گولکنڈا کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بھی بج گئی!

دکن کے مشہور شاعروں میں ولی دکنی بلاشک وشبہ سب سے بہتر شاعر تھا۔ لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ ولی اردو ادب اور اردو شاعری دونوں اصنافِ سخن کا موجد ہے۔ بہرحال! جہاں تک کہ زبان کا تعلق ہے میری ذاتی رائے ہے کہ ولی کی خدمتیں بہت قابلِ قدر ہیں۔ اس نے بہت سی مہمل اصطلاحات کو خارج کرکے جدید محاورات ایجاد کئے۔ جو اپنی فصاحت وبلاغت کے اعتبار کر اپنی نظیر آپ ہیں۔ ولی نے بھاشا اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں داخل کئے۔ جن کی شرکت سے ولی کی زبان میں چاشنی اور دلکشی پیدا ہوگئی۔ اگر عصرِ حاضر کے ادیب اپنی اور ولی کے اردو کا موازنہ کریں تو انہیں دونوں زبانوں میں کوئی زیادہ فرق نہ معلوم ہوگا۔ ولی اپنی آخری عمر میں دلی آئے، اُن کی آمد سے دلی کے عوام میں اردو ادب وشاعری کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ولی کے شاگردوں میں حضرت مبارک سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ ولی کے شاگردوں نے اردو ادب کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔ ان کے شاگرد صرف شاعر ہی نہ تھے۔ بلکہ شاعر گر بھی تھے۔

قارئین ذیل کے ان دو مصرعوں سے اُس وقت کی شاعری کے طرز کا اندازہ کر سکتے ہیں ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخمِ عشق کو ٹانکے — اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجائے

الفاظ کی بندشوں کا یہ طرز ایک زمانۂ دراز تک جاری رہا۔ اس کے بعد ذوق کا دور آیا۔ ذوق نے اس طرز سے قطع نظر کرکے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکی۔ جس کی تقلید مرزا مظہر جانِ جاناں نے کی۔ اور اس نے اپنے وقت میں اردو میں نئی جدت پیدا کی۔ گرچہ مرزا مظہر جانِ جاناں بلند پایہ شاعروں میں نہ تھا۔ تاہم اس نے بلند پایہ شاعروں کے لئے نئی راہیں تلاش کرلی تھیں۔ جن پر چل کر ایک ذہین شخص ایک کامیاب شاعر بن سکتا تھا۔ مصحفی اپنے سوانح حیات میں رقمطراز ہیں کہ اصل اردو شاعری مرزا مظہر جانِ جاناں کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ مصحفی کا یہ کہنا میرے نزدیک ایک بڑی حد تک حق بجانب ہے۔

اس کے بعد پرانے طرز کی تقلید کرنے والے شاعروں نے نئی طرز کی مخالفت کرنی شروع کی۔ لیکن نئی طرز کے لئے جو فضا مرزا مظہر جانِ جاناں کے وقت میں پیدا ہوچکی تھی وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ اس نئی طرز کے حامیوں میں

سوداؔ، میرؔ، تقیؔ، قائمؔ، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض دراصل بہت بڑے شاعر تھے۔ اور اس میں بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان ہی شعراء کی پیدا کردہ طرز کی تقلید کرکے بعض شاعروں نے کافی عزت و شہرت حاصل کرلی۔

مندرجہ بالا شاعروں کی صف میں ولی محمد نظیر اکبر آبادی کی ہستی بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ نادر شاہ کے حملہ کے وقت دلی میں پیدا ہوئے۔ اور میرو سودا کے ہمعصر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا طرز میر و سودا کے طرز سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ نظیر گرچہ دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے آگرہ کے ایک پرمنظر دیہات میں اپنی بود و باش اختیار کرلی تھی۔ اس لئے انہیں قدرتی مناظر سے بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ حقیقت نگار تھے۔ اور انکی شاعری تصنع اور بناوٹ سے بالکل پاک ہوتی تھی۔ چند مستند تنقید نگاروں کی رائے ہے کہ نظیر اکبرآبادی صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعر تھے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت نظیر کی نظمیں اُن کے ہم عصر حضرت ناسخؔ۔ بےشک امیرؔ اور ذوقؔ کی نظموں سے زیادہ پاکیزہ اور حقیقت پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔

مرزا غالبؔ اور آتشؔ جیسے قادرالکلام شاعروں کا ذکر کئے بغیر اُس وقت کی شاعری پر میرا یہ تبصرہ نامکمل رہجائیگا۔ مرزا غالبؔ نے گرچہ اپنی نظمیں ابتداً فارسی زبان میں کہیں لیکن پھر بھی مرزا کی خدمتیں اردو زبان کے سلسلے میں ان سے قبل کے اردو شعراء کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ ان کی غزلیں ہیرو کی مانند آج بھی جگمگا رہی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب شہرت کے لحاظ اس وقت بھی زندہ ہے۔ غالب کے اقوال و اشعار اور ان کی زندگی کے حالات ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ درحقیقت غالب ایک پیغمبر صفت شاعر تھا۔

بعض حضرات غالب کا موازنہ ڈاکٹر سر اقبال سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبال کی ذہانت غالبؔ سے بہتر تھی۔ لیکن اس قسم کی بیجا باتوں سے میرے اس مضمون کو کوئی سروکار نہیں۔ اور نہ میرے نزدیک یہ بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی کے شعرائے کرام کی قابلیت و ذہانت پر اعتراضات کرکے ان کی توہین کیجائے۔ اس وقت تو صرف مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ شعراء کی دو ہی قسمیں ہیں۔ پہلی تو وہ جو شاعر ہوتے ہیں۔ اور دوسری وہ جو متشاعر ہیں۔ شاعر دراصل سب ہی بڑے ہیں۔ لیکن پھر بھی بڑوں کی تعداد بہت مختصر ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔

غالب کی غزلیں ان کی زندگی ہی میں شہرت حاصل کرچکی ہیں۔ صرف میرؔ کے سوا زبان کی سادگی میں غالبؔ کا کوئی دوسرا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے۔ اکثر شعراء نے میرؔ کی غزلوں کو خراج تحسین بخشا ہے۔ ذیل کے تین شعر اس دعوے کی دلیل میں مناسب معلوم ہوتے ہیں،

سوداؔ کہتے ہیں ؎

سوداؔ تو اس زمین میں غزل در غزل ہی لکھ ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کا شرف

ذوقؔ کا شعر ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد اور بہادر شاہ آخری کی اسیری سے قبل اردو شاعری معراجِ کمال پر پہونچ چکی تھی۔ دلی کے بادشاہوں اور لکھنؤ کے نوابوں میں شاعری کا ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ ۱۸ویں صدی کے نصف سے ۱۹ویں صدی کے اخیر تک کا عرصہ اردو شاعری کے لئے ایک سنہری دور تھا۔ دراصل شعرا دلی لکھنؤ اور آگرہ کے بسنے والوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ رؤسا اور عوام کے علاوہ بادشاہوں اور شہنشاہوں نے اردو کی ترقیات میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ بادشاہوں میں سے اکثر نے اپنے دل و جان سے اردو کی خدمت کی۔ یہاں تک کہ درباری شعراء کی بہت سی بے ادبیاں محض شاعر ہونے کی وجہ سے معاف کردی جاتی تھیں۔

سلطنتِ مغلیہ کا آخری چراغ بہادر شاہ ظفر بادشاہوں میں سب سے فطین شاعر تھا۔ گرچہ وہ اس امر سے بھی بخوبی واقف تھا کہ بادشاہوں کے حق میں شاعری کا ذوق خطرے سے خالی نہیں تاہم وہ میدانِ شاعری سے اپنے کو علٰحدہ نہ کرسکا۔ بہادر شاہ نے اپنے طرز سے یہ ثابت کردیا کہ شاعری اور سیاست دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس کی سلطنت آخر اسی وجہ سے پاش پاش ہوگئی۔ اور وہ قید کرلیا گیا۔ لیکن پھر بھی اس کی اسیری اُسے شاعری کے ذوق سے باز نہ رکھ سکی۔ وہ قیدخانہ کی چہار دیواریوں میں بھی ایک بلبل کی مانند چہکا کرتا تھا۔

اردو اپنے پیچھے ایک بے مثال تاریخ رکھتی ہے۔ یہ سیاسی ضروریات کی بناپر وجود میں آئی۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے عوام اور شاعروں کی زبان بن گئی۔ اس مختصر سی مدت میں اردو نے بہت سے مستند ادیب اور باکمال شاعر پیدا کئے۔ اسے بلوہ فساد اور جنگ کے درمیان سے بھی گذرنا پڑا۔ یہ ہندوستان کی ملکی زبان کی حیثیت سے پیدا ہوئی تھی، ہے اور رہیگی۔ گرچہ اب اس کا نام آہستہ آہستہ تبدیل کیا جارہا ہے لیکن نام کے تبدیل کرنے سے اس کی خوبیاں ضائع نہیں ہوسکتی ہیں!!

آئینۂ جذبات

از جناب یوم ایوبی فیروزی

وہ ملنے آرہے ہیں آج اپنے مبتلا سے
کس کو یقین ہوگا، مانے گا کون اس کو
اے چارہ گر اسی کو کہتے ہیں دردِ الفت
ہوجائے گا مکمل افسانۂ محبت
یاد آرہی ہیں ہردم وہ بھولی بھری باتیں
بل کھا گئیں جو زلفیں رخسار نازنیں پر

اب دل بگھل نہ جائے اُس گرمیٔ وفا سے
میں چھوڑدوں وفا کو باز آئے وہ جفا سے
جس درد کا تعلق ہوتا نہیں دوا سے
پھر مجھکو دیکھ لو تم دیکھا تھا جس ادا سے
وہ میری اضطرابی اور اُن کے وہ دلاسے
اُلجھے وہ چلتے چلتے چلتی ہوئی ہوا سے

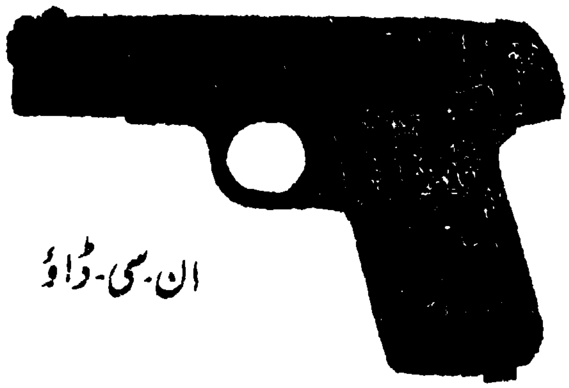
بیکار ہیں دعائیں، بے سود التجائیں
تاثیر جب خفا ہے جوہر تری دعا سے

شربت جات (رجسٹرڈ)

عام جسمانی کمزوریوں کیلئے بیحد مفید ہے مقوی باہ مقوی معدہ ہے خون صالح پیدا کرکے جسم کو فربہ کرتا ہے
مرد عورت بچہ بوڑھا سب کیلئے یکساں مفید ہے اور ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے قیمت فی بوتل ۲ر
سفوف اعظم (رجسٹرڈ) سفوف جریان سرعت انزال وغیرہ کی شکایت کو دور کرکے طاقت و قوت بڑھاتا اور
نیا خون پیدا کرتا ہے مخصوص عورتوں کے سیلان الرحم وغیرہ کیلئے بیحد مفید ہے قیمت ۱۰ خوراک ۱۲ر
[illegible] بخار درد سر جاڑا بخار ہر حال [illegible] لرزہ بخار [illegible]
ہر قسم کے بخار کیلئے بیحد مفید ہے حرارت ضعف تلی کھانسی قبض وغیرہ کو دور کرتا ہے
قیمت فی پاکٹ ۸ آنہ فی شیشی ۲ر (ترکیب استعمال ہمراہ دوا)۔
سرمہ حسن نظر (رجسٹرڈ) آنکھوں کی جملہ بیماریوں کیلئے مثلاً جالا۔ پھولا۔ ناخونہ
دھندلا پن۔ رتوندھی آنکھوں سے پانی کا گرنا وغیرہ کیلئے اکسیر ہے۔ قیمت ۸ ر
لیکوریا ملیریا اور رحم اور ماہواری کی تمام شکایتوں کے لئے اکسیر ہے۔
ان کے علاوہ ہمارے یہاں ہر قسم کے مفردات و مرکبات کافی مقدار میں
موجود رہتا ہے۔

نیشنل دواخانہ ۱۰۹ لور چیت پور روڈ۔ کلکتہ

تمام قسم کے بندوق۔ رائفل اور کارتوس وغیرہ کے لئے



کی دوکان میں ایک مرتبہ تشریف لاکر آزمایش کیجئے۔
ہیڈ آفس:۔ ان۔ سی۔ ڈاؤ اینڈ کو۔ ۹ ڈلہوزی اسکوائر
پورب جانب کلکتہ
برانچ:۔ رانی گنج۔ ای۔ آئی۔ آر۔ رانچی۔ بہار

بنگال اسٹشنرس سنڈیکیٹ

۱ مشن رو کلکتہ



مینوفیکچرس۔ اینوڈرس ریپریس
ہمارے یہاں خوردہ اور بیوپاری
اسٹشنری کا سامان فروخت ہوتا ہے
اور چھپائی کا کام بھی نہایت ہی اچھا
کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انجینیرنگ
اور میتھامیٹیکل انسٹرومنٹ اور
ڈرائنگ و پینٹنگ کے سب سامان
بکفایت ملتے ہیں۔



سروتہ برینڈ زردہ فیکٹری

شمیمی زردہ۔ دلاری قوام۔ کیسر ملاس استعمال کیجئے

شمیمی زردہ ان تمام خصوصیات کا حامل ہے جو اسے عام بازاری زردوں سے ممتاز کرتی ہے اسکے اجزائے ترکیبی میں کوئی جز مضر صحت نہیں ہے اسکی تیاری میں صفائی و ستھرائی کو خاص طور پر ملحوظ رکھتا ہے دلاری قوام خوشبو اور لذت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہے۔ شائقین حضرات استعمال کرکے ہمارے دعوے کی تصدیق کرسکتے ہیں کیسر ملاس پان کی جان ہے۔ خوشبودار خوشرنگ اور خوش ذائقہ ہے اس کے استعمال سے دل و دماغ میں فرحت پیدا ہوتی ہے۔ ان اصحاب کے کام کی بھی چیز ہے جو زردہ یا قوام استعمال نہیں کرتے۔

اسکے علاوہ ہر طرح کے عطریات اور عرقیات کیلئے بھی یہ کارخانہ بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ آزمایش شرط ہے۔

ایم۔ ایس ورکس نمبر ۲۲ ترونٹی بازار اسٹریٹ کلکتہ



مجنوں

مزدور کی فریاد

از جناب ابراہیم ہوش (کلکتہ)

ہمارے ساتھ جو بھی پیش آتا ہے وہ سختی سے

جہاں میں ہم کسی کو بھی نہیں آزار پہنچاتے — تشدّد دلی ذرا بھی اپنے میں جرأت نہیں پاتے
نیاز و عاجزی و خاکساری اپنا شیوہ ہے — زباں پر فخر و ناز و شان کی باتیں نہیں لاتے
لباس ایسا پہنتے ہیں کہ جس کو چیتھڑا کہیئے — غذائے خوش تو کیا، ہم پیٹ بھر کر بھی نہیں کھاتے
سنیما کی جگہ دیدیتے ہیں ہم اپنے خوابوں کو — بجائے ریڈیو، خود گا کے ہم دل کو ہیں بہلاتے
کسی کی بات کا لیتے نہیں ہرگز اثر کوئی — جبیں پہ ہم امیروں کی طرح سے بل نہیں لاتے

مگر اس پر بھی ہم سے بولتے ہیں سب درشتی سے
ہمارے ساتھ جو بھی پیش آتا ہے وہ سختی سے

نہیں کرتے تعرض ہم کسی کی شان و شوکت سے — نہیں رکھتے غرض اہلِ دول کے مال و دولت سے
کوئی غصہ دکھاتا ہے تو ہم نرمی دکھاتے ہیں — حقارت کی جگہ ہم کام لیتے ہیں محبت سے
کسی سے ہمسری کا ہم کو دعویٰ ہی نہیں ہوتا — کہ ہم ہر ہر قدم پر ہوتے ہیں مجبور غربت سے
نہ سمجھے کوئی چہروں پر اسے جذبات کی سرخی — کہ وہ سرخی طپانچے کھا کے ہے دستِ فلاکت سے
غرض ہم ایک ٹھکرائے ہوئے انساں ہیں دنیا میں — جسے کچھ کام راحت سے نہ مطلب جسکو عشرت سے

مگر اس پر بھی ہم سے بولتے ہیں سب درشتی سے
ہمارے ساتھ جو بھی پیش آتا ہے وہ سختی سے

تماشاگاہ عالم میں یہ ایوانیں جو قائم ہیں — یہ دولتمند جنکے قلب لطفِ مے سے محرم ہیں

مزین ہیں جو یہ خوش پوش زر آمیز جالوں سے — یہ اہل زر، کہ جو حاجت روائے اہل عالم ہیں
یہ اظہار تفاخر، یہ نمود شان استغنا — شکن پیشانیوں کی جنکو جب دیکھو تو برہم ہیں
یہ تمکیں اور یہ خود بینی، یہ طاقت اور یہ خود رائی — جہاں میں جن سے استبداد کی بنیاد محکم ہیں
غرض جاہ و جلال و زور ارباب امارت کا — نگاہ غور سے دیکھو تو ان سب کے سبب ہم ہیں

مگر اس پر بھی ہم سے بولتے ہیں سب درشتی سے
ہمارے ساتھ جو بھی پیش آتا ہے وہ سختی سے

ہمارا خون شامل ہے ان ایوانوں کی اینٹوں میں — ہماری رگ کا ہے ہر تار ان ریشم کے جالوں میں
یہ سرخی اہل دولت کے رخوں پر جو جھلکتی ہے — ہے گرمی اس کی پوشیدہ جو ہم محنت کی آہوں میں
منور ہو رہا ہے بزم عشرت کا جو ہر چپہ — ہمارا خون جلتا ہے جہاں کی عیش گاہوں میں
ہمارے رنج نے دکھلائی ان کو راہ عشرت کی — بسائے پھرتے ہیں فردوس جو اپنے خیالوں میں
بہر صورت ہمارے دم قدم سے ان کی عشرت ہے — بہر حالت ترقی ہم سے ہوتی ہے زمانوں میں

مگر اس پر بھی ہم سے بولتے ہیں سب درشتی سے
ہمارے ساتھ جو بھی پیش آتا ہے وہ سختی سے

کلیجہ پک گیا ہے سہتے سہتے سختیاں پیہم — نظام صبر و استقلال اب ہونے کو ہے برہم
یہ اصحاب غرض جنکو فقط عشرت سے مطلب ہے — جو خواہاں ہیں کہ ہم سہتے رہیں ظلم و الم دائم
یہ ظالم اور یہ غاصب، یہ ہوس کے بندے، اہل زر — یہ ڈاکو اور یہ رہزن، ننگ خلقت، یہ بنی آدم
سمجھتے ہیں جو میراث اب و جد دولت و زر کو — وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں خدائے جاہ کا ہر دم
زمانہ آگیا ہے ان کی دولت چھین لی جائے — طلوع آفتاب نو سے ہو اب خشک یہ شبنم

جہاں میں انقلاب آئے حکومت ہو کسانوں کی
کیے جا ترجمانی ہوش، تو ان بے زبانوں کی

ہندوستان میں دستوری حکومت کا ارتقاء

از جناب منصور کاکوی۔

سنہ ۱۶۰۰ء میں لندن کے تاجروں کی ایک جماعت نے مشرقی ممالک میں تجارت کرنے کی اجازت ملکہ وکٹوریہ سے مانگی۔ اس جماعت نے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے کاروبار شروع کردیا۔ ابتدا میں سورت۔ بمبئی۔ مدراس۔ اور پھر کلکتہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کی گئی۔

اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں اور ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دار دورہ شروع ہوگیا۔ مرکزی حکومت کا ہاتھ ڈھیلا ہوگیا۔ دور دور کے صوبے خود مختار ہوتے ہوگئے۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ کمپنی بھی اس لوٹ مار میں حصہ لینے لگی۔ کبھی اس فریق کا ساتھ دیا کبھی اس کا۔ چنانچہ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی طاقت میں دن دن اضافہ ہوتا گیا۔

بنگال و بہار کی دیوانی نے کمپنی کے وقار کو اور بھی بڑھا دیا۔ اس کے بعد سے تو بہار۔ بنگال کی اصلی مالک کمپنی ہی ہوگئی۔

اور ایسٹ انڈیا کمپنی رفتہ رفتہ سیاسی اقتدار حاصل کرتی گئی۔ اس لئے ضرورت محسوس کی گئی کہ کمپنی کے نظم و نسق میں دخل دیا جائے۔ انگلستان میں اس کی بدنظمی کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس لئے لارڈ نارتھ نے سنہ ۱۷۷۳ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کرایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں دخل دینے کا یہ سب سے پہلا قدم تھا۔ اور یہیں سے ہندوستان میں پارلیمنٹری اقتدار کا آغاز ہوا۔ اس قانون کے چند دفعات یہ تھے۔

COURT OF PROPRIETORS میں حق رائے دہندگی ان کو دیا گیا۔ جن کا حصہ ایک ہزار پونڈ کا ہوگا۔ ڈائرکٹروں کی مدت رکنیت چار سال رکھی گئی۔ ایک چوتھائی ممبر ہر سال مستعفی ہوں گے۔ بمبئی اور مدراس کے گورنر بنگال کے گورنر کے ماتحت کردئے گئے۔ اور بنگال کے گورنر کو گورنر جنرل کا لقب دیا گیا۔ گورنر جنرل کی امداد اور مشورے کے لئے چار ممبروں کی ایک کانسل بنائی گئی۔ اور گورنر جنرل کو اس کانسل کی اکثریت کی رائے کا پابند کردیا گیا۔ کلکتہ میں سپریم کورٹ قائم کیا گیا۔

اس قانون سے گورنر جنرل کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ سپریم کورٹ کے اختیارات بھی کچھ مبہم ہی سے رہ گئے۔ بعض دوسری خامیاں بھی رہ گئیں۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے سنہ ۱۷۸۱ء میں پارلیمنٹ میں ایک ترمیمی قانون پیش کیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے گورنر جنرل اور اسکی کانسل سپریم کورٹ کے حاشیہ سے باہر قرار دئے گئے۔

پارلیمنٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعہ جو انتظام کرنا چاہا وہ اچھی طرح نہ چل سکا۔ اس درمیان میں کمپنی کی مالی حالت بھی کمزور ہوگئی۔ کمپنی نے پارلیمنٹ سے امداد کی درخواست کی۔ لارڈ ناکس وزیر اعظم تھے۔ انہوں نے کمپنی کے اختیارات میں مزید کمی کرنی چاہی۔ اور اس مضمون کا ایک بل بھی پیش کیا۔ سنہ ۱۷۸۴ء جب پٹ کی وزارت برسر اقتدار آئی تو پھر ایک بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ اور پاس بھی ہوگیا۔ اس قانون کو پٹس انڈیا ایکٹ کہتے ہیں۔ اس ایکٹ نے کمپنی کی نگرانی اور

اس کے انتظام کو چلانے کے لئے چھ آدمیوں کا ایک بورڈ آف کنٹرول (Board of Control) قائم کر دیا۔ یہ ممبر سکریٹری آف اسٹیٹ (صدر) چانسلر آف اکسچیکر (وزیر مالیات) اور پریوی کاؤنسلر تھے۔ اس بورڈ کو کمپنی نے فوجی اور سیاسی معاملات میں دخل دینے کا اختیار دیا گیا۔ بمبئی اور مدراس میں بھی کاؤنسلیں قائم کی گئیں۔ کورٹ آف ڈائرکٹر (   ) کو بورڈ آف کنٹرول کے ماتحت کر دیا گیا۔ گرچہ گورنر جنرل کو مقرر کرنے کا حق ڈائرکٹروں ہی کو رہا۔ لیکن بادشاہ وقت کی منظوری لازمی قرار دیگئی۔

گورنر جنرل کی کاؤنسل کے ممبروں کی تعداد تین کر دی گئی۔ اور ممبر کمپنی کے ملازم ہی ہونگے۔ پٹس انڈیا ایکٹ (Pitts' India Act) نے ایک طرح کی دو عملی حکومت قائم کر دی۔ اور کسی نہ کسی شکل میں یہ حکومت غدر تک جاری رہی۔

سنہ ۱۸۳۳ء میں پارلیمنٹ نے چارٹر ایکٹ (Charter Act) پاس کیا۔ سنہ ۱۷۸۴ء اور سنہ ۱۸۳۳ء کے درمیان میں کمپنی کے اقتدار اور اختیار میں زمین اور آسمان کا فرق ہو گیا۔ اب کمپنی محض تاجروں کی ایک جماعت نہ رہی۔ بلکہ صحیح معنوں میں ملک کی اصل مالک تھی۔ چارٹر ایکٹ کی رو سے ——

(۱) کمپنی کے چین کی تجارتی اجارہ داری ختم ہوگئی۔

(۲) ہندوستانی مقبوضات کے نظم ونسق کیلئے بیس سال کی مزید توسیع کی گئی۔

(۳) کمپنی کی تجارتی حیثیت ختم ہوگئی۔ اس کے حصہ داروں کو ½۱۰ فیصدی سالانہ منافع دیا جانا قرار پایا۔

(۴) ایک چوتھا صوبہ (آگرہ کا) بنایا گیا۔

(۵) گورنر جنرل کے تمام اختیارات تفصیل سے بیان کر دیئے گئے۔

(۶) گورنر جنرل کی کاؤنسل میں ایک چوتھے ممبر یعنی لا ممبر کا اضافہ کیا گیا۔

لا ممبر صرف قانونی مشورے کیلئے کاؤنسل میں بیٹھتا تھا۔ اس کو حق رائے دہندگی نہیں دیا گیا تھا۔ جو کچھ ہو لیکن لا ممبر مستقبل کی مجالس قانون ساز کا سنگ بنیاد تھا۔ انگریزوں کو اجازت دیگئی کہ وہ ہندوستان میں زمین خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد بہت سے انگریزوں نے ترہت میں نیل کی کاشت شروع کی۔ اس قانون نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ صلاحیت کی بنا پر ہر ہندوستانی سرکاری ملازم ہو سکتا ہے۔ مذہب ذات اور رنگ ونسل اس راہ میں رکاوٹ نہ ہوگی۔

۱۸۳۳ء کے بعد سنہ ۱۸۵۳ء میں پارلیمنٹ میں پھر ایک قانون پاس کیا (Charter Act) کمپنی کے پاس ہندوستان کا نظم ونسق اس وقت کے لئے رہنے دیا گیا کہ جب تک کہ پارلیمنٹ کوئی دوسرا انتظام نہ کرے۔ بورڈ آف ڈائرکٹر (   ) کے ممبروں کی تعداد ۲۴ سے گھٹا کر ۱۸ کر دی گئی۔ بنگال کو ایک الگ لفٹنٹ گورنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ لا ممبر کو حق رائے دہندگی دیا گیا۔ قانونی ضروریات کیلئے مزید چھ ممبروں کا اضافہ کیا گیا۔ ان چھ ممبروں کی تقسیم اس طرح رکھی گئی۔ ایک چیف جسٹس اور ایک جج۔ باقی چار ممبر رہ گئے۔ جن کو بمبئی مدراس۔ بنگال اور آگرہ کی صوبائی حکومتیں نامزد کر کے بھیجیں گی۔

غدر کے بعد سنہ ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ نے جو قانون پیش کیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اب سے ہندوستان کا انتظام براہ راست ملک معظم کرینگے۔ بورڈ آف ڈائرکٹر اور بورڈ آف کنٹرول کے ممبروں کے تمام اختیارات سکریٹری آف اسٹیٹ کو دیدیئے گئے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کی امداد اور مشورے کے لئے ۱۵ آدمیوں کی ایک کاؤنسل بنائی گئی۔ گورنر جنرل کا لقب وائسرائے یعنی نائب السلطنت ہوا۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۱ء میں پارلیمنٹ نے انڈین کاؤنسل

ٹ (INDIAN COUNCIL ACT) پاس کیا۔ اس ایکٹ
نے وائسرائے کی کانسل میں ایک کامرس ممبر کا اضافہ کیا۔ اور
ہ کانسل کے ممبروں کی تعداد پانچ ہوگئی۔ لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی
وجہ سے کمپنی کی مقبوضات بہت بڑھ گئی۔ اور کانسل کے ممبروں کی
سرداریوں میں بھی اضافہ ہوگیا۔ اب تک ممبروں کے ذمہ کوئی
اص محکمہ اور کام نہ تھا۔ اس لیے انتظام میں بہت سی دقتیں
پیش آنے لگیں۔ چنانچہ اس کو دور کرنے کے لئے لارڈ کیننگ
نے (PORT FOLIO) کا طریقہ جاری
یا۔ یہ طریقہ کار کانسل کے ممبروں کے باہمی مشورے سے
طے پایا تھا۔ چنانچہ اگزیکٹو کانسل کے ہر ممبر کے سپرد ایک
محکمہ کر دیا گیا۔ محکمہ خارجہ کو وائسرائے نے خود اپنے ہاتھ میں
رکھا۔ روزمرہ کے معمولی کام ممبر خود کر لیتے۔ اور اہم معاملات
میں وائسرائے یا اس کی کانسل کی رائے سے کرتے اس
نئے انتظام سے کام میں بڑی سہولیت پیدا ہوگئی۔ اس قانون
نے اڈیشنل ممبروں کی تعداد ۱ سے بڑھا کر ۱۲ کر دی۔
اس سے قبل ان ممبروں کی تعداد ۶ تھی۔ گورنر جنرل کو
ہندوستانیوں کے نامزد کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔
چنانچہ لارڈ کیننگ نے اس حق کو کام میں لاتے ہوئے مہاراج
پٹیالہ، مہاراجہ بنارس، اور سر دنکر راؤ کو لیجسلیٹو کانسل کا ممبر
نامزد کیا۔ وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کو کونسل
کے پاس کئے ہوئے قوانین کو رد کرنے کا حق باقی رہا۔ بمبئی
اور مدراس کی کانسلوں کو بھی آئینی اختیارات ملے۔ ان کانسلوں
کی تشکیل اس طرح کی گئی۔ گورنر کی اگزیکٹو کے ممبر، ایک
ایڈوکیٹ جنرل اور آٹھ نامزد ممبر جن میں نصف غیر سرکاری
کا ہونا ضروری قرار دیا گیا۔ کسی قانون پر بحث کرنے یا قانون
بنانے سے پہلے گورنر جنرل کی اجازت ضروری ہوگی۔
سنہ ۱۸۶۲ء

میں بنگال میں سنہ ۱۸۸۶ء میں یوپی میں۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں پنجاب
اور برما اور سنہ ۱۹۳۱ء میں سی۔ پی میں مجلس قانون ساز
قائم کی گئی۔

غدر کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ایک نئے
باب کا اضافہ ہوا۔ مغلوں کی آخری امید ختم ہوگئی۔ پورا ہندوستان
زیر سایہ تاج برطانیہ آگیا۔ جدید تعلیم اور نت نئی ایجادوں نے
ہندوستانیوں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور
ہندوستان کی قوموں میں متحدہ قومیت کا تخیل غیر محسوس
طریقے پر دھیرے دھیرے پیدا ہونے لگا۔ اور مختلف قومیں ایک
دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں شعور پیدا ہونے
لگا ____ راجہ رام موہن رائے جنہیں جدید ہندوستان
کا باپ کہا جاتا ہے۔ اور سر سید احمد خان اسی دور کی پیداوار ہیں
____ ضرورت اس کی محسوس کی گئی کہ ایک ایسی جماعت بنائی
جائے جو ہندوستان کی تمام قوموں کا متحدہ پلیٹ فارم ہو چنانچہ
سب سے پہلے یہ جماعت سنہ ۱۸۸۵ء میں بنی۔ ان ۷۲ آدمیوں
جنہوں نے پہلے پہل اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ مختلف قوموں
اور فرقوں کے لوگ تھے۔
ابتدا میں کانگریس کے پاس کوئی سیاسی پروگرام نہ تھا۔
اس کی پالیسی بالکل نرم اور دوستانہ تھی۔ سال میں کسی جگہ
بیٹھ کر ایک دو تجویزیں پاس کر دی جاتی تھیں اور بس۔
سنہ ۱۸۶۱ء میں قانون کے بعد سنہ ۱۸۷۴ء میں پارلیمنٹ نے
ایک دوسرا ( ) انڈین کانسل
ایکٹ پاس کیا۔ اس کی رو سے وائسرائے کی کانسل چھٹے ممبر
کا اضافہ ہوا۔ پھر سنہ ۱۸۹۲ء میں انڈین کانسل ایکٹ آف سنہ ۱۸۹۲ء
( ) پاس ہوا۔ اس نے
قانون کے مرکزی مجلس قانون ساز کو مزید اختیارات دیئے

غیر سرکاری ایڈیشنل ممبروں کی تعداد ۱۲ سے بڑھا کر ۱۶ کر دیا — ۱۰ غیر سرکاری۔ ان دس غیر سرکاری ممبروں میں ۵ گورنر جنرل کے نامزد کردہ اور پانچ وہ ہوں گے جن کی سفارش بنگال، بمبئی، مدراس، آگرہ کی مجالس قانون ساز اور کلکتہ چیمبر آف کامرس کرے گا۔ لہذا سب سے پہلے ہندوستان میں بلا واسطہ (Indirect Election) انتخاب کا طریقہ یہیں سے رائج ہوا۔ مرکزی قانون ساز کو بجٹ پر بحث کرنے کا حق بھی دیا گیا۔ اسی طرح صوبائی کانسلوں کی مزید توسیع کی گئی۔ ان کانسلوں کی ممبری کا حق ڈسٹرکٹ بورڈ، لوکل بورڈ اور میونسپلٹی کے منتخب کردہ لوگوں کو بھی ملا۔ صوبائی کمانڈر انچیف کے عہدے کو توڑ دیا گیا۔ اور کمانڈر انچیف آف انڈیا کے اختیارات اور بڑھا دئے گئے ———

۱۸۹۲ء کے بعد سے ہندوستان کی سیاست میں کچھ گرمی پیدا ہو گئی۔ ملک میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس کے رجحانات انتہاپسندی کی طرف ہو گئے۔ اور کانگریس کی قدروں میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جاپان کے ہاتھ روس کی اور حبشہ کے ہاتھ اٹلی کی شکست نے ہندوستانیوں کے دل میں ایک نئی امید پیدا کر دی۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ گوری قوموں کی بدسلوکی نے بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبے کو ابھارا۔ اور لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال والی اسکیم نے اس بجھی ہوئی آگ کو ہوا دیدی ——— اس اسکیم کے خلاف پورے بنگال میں بے اطمینانی اور بے چینی کی لہر پھیل گئی۔ اور اس کارروائی کو بنگالی قوم کی زبان، ان کے کلچر اور ان کے اتحاد پر ایک حملہ خیال کیا گیا۔ اور بنگال میں اس اسکیم کے خلاف ایک عملی جد و جہد شروع ہو گئی۔ بدیسی مالوں کا بائیکاٹ۔ اور دیسی چیزوں کا زور دار پرچار کیا گیا۔ کانگریس نے بھی بائیکاٹ اور سودیسی تحریک کی حمایت کی۔ کچھ عرصہ کے لئے بنگال میں دہشت انگیزی بھی پھیل گئی۔

بال گنگا دھر تلک اس انتہاپسندی کے بانی اور لیڈر خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ ایک پر جوش مقرر، انشاپرداز اور جرنلسٹ تھے۔ ان کے سحر بار قلم اور شعلہ فشاں تحریر نے ملک بھر میں ایک آگ سی لگا دی۔ ان پر باغیانہ تحریر و تقریر کا الزام بھی لگایا گیا۔ پونا سے یہ تحریک بنگال اور پنجاب میں پھیلی۔ اس وقت کانگریس کے اندر اس انتہاپسند پارٹی کے لیڈر بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال تھے۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں کانگریس کا جو اجلاس ہوا اس کا مقصد سوراج رکھا گیا۔

مسلم لیگ ——— گرچہ ابتدا ہی سے مسلمان کانگریس کے حامی تھے۔ لیکن مسلمان من حیث قوم کبھی کانگریس میں نہ آئے۔ اس کی وجہ کچھ تو خوف اور کچھ نیز ان کی خود غرضی۔ خوف اس لئے کہ حکومت کی بھی نظریں انہیں کی طرف تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا ذمہ دار مسلمان ہی خیال کئے گئے تھے۔ اور [illegible] کی سزا بھی انہیں کو ملی تھی۔ پھر اگر مسلمان کچھ حکومت کی [illegible] تو [illegible] تھا۔ غدر کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے مصلح سر سید احمد خان ہوئے ہیں۔ سر سید کانگریس کے پروگرام کے مخالف تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں ایک لیگ [illegible] ان [illegible] سے مسلم عوام بھی متاثر ہوئے۔ [illegible] ایک [illegible] کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اسی احساس نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی شکل اختیار کی۔ ابتدا میں اس کا مقصد مسلمانوں میں حکومت کی وفاداری پیدا کرنا۔ اور ہندی مسلمانوں کے لئے حکومت سے سیاسی حقوق طلب کرنا قرار دیا گیا۔ لیکن پھر ۱۹۱۳ء میں حکومت خود مختاری قرار دیا گیا۔

منٹو مارلے ریفارم ۱۹۰۹ء

ملک کی بے چینی اور کشمکش کو دور کرنے کے لئے منٹو مارلے ریفارم ہندوستان میں نافذ کیا گیا۔ اس ریفارم کے لئے مرکزی اور صوبائی ایگزیکیٹو کونسل کا دروازہ قابل ہندوستانیوں کے لئے کھولدیا۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے ایڈیشنل ممبروں کی تعداد ۱۶ سے ۶۰ کردی گئی۔ ان میں ۲۸ سرکاری ۵ نامزد غیر سرکاری اور ۲۷ منتخب غیر سرکاری رکھے گئے۔ یہ سب سے پہلا موقع تھا کہ مجلس قانون ساز میں غیر سرکاری ممبروں کی اکثریت ہوئی۔ فرقہ وارانہ اور مخصوص انتخاب بھی رائج کیا گیا۔ ۲۷ منتخب ممبروں میں ۱۳ عام حلقۂ انتخاب سے آنا قرار پائے۔ صوبائی مجلس قانون ساز ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ کو حق رائے دہندگی دیا گیا۔ باقی ۱۴ جگہوں میں ۶ مسلمانوں ۶ زمینداروں اور ۲ چیمبر آف کامرس کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ مرکزی اسمبلی کے ممبروں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اسمبلی میں تجویز پیش کرسکتے ہیں۔ اور ضمنی سوال بھی پوچھ سکتے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ جانے سے ہندوستان کے اندر کچھ سرگرمی کے آثار کچھ نمایاں ہوگئے۔ پنجاب اور بنگال میں انگریزوں کا تختہ الٹنے کے لئے سازشیں کی گئیں۔ لیکن عوام میں یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی۔ خود مہاتما گاندھی نے فوجی بھرتی میں مدد دی۔ اس جنگ میں ہندوستان نے لاکھوں سپاہی اور کروڑوں روپئے سے برطانیہ کی امداد کی صرف اس امید پر کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستانیوں کو حکومت میں بیش سے بیش حصہ دیا جائے گا۔ اتحادیوں کے مدبروں نے اعلان بھی کردیا تھا کہ اس جنگ سے اتحادیوں کا مقصد جمہوریت کا تحفظ اور کمزوروں کی حمایت ہے۔ ۱۹۱۶ء میں ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں میں سمجھوتہ ہوگیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کا یہ سمجھوتہ لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ہندو اور مسلم رہنماؤں نے ملکر ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ آئینی اسکیم تیار کی۔ اس مشترکہ آئینی منشور کی چند اہم دفعات یہ ہیں:-

صوبائی مجالس قانون ساز

ان مجالس قانون ساز کے ⅘ ممبر منتخب ہوں گے۔ اور ⅕ نامزد

بڑی بڑی کاونسلوں میں ممبروں کی تعداد ۱۲۵ اور چھوٹے صوبوں میں ۵۰ سے ۷۵ ہوگی۔

کانسل کے ممبروں کو منتخب کرنے کا حق عوام کو ہوگا۔

اقلیتوں کی نمائندگی کا کافی سامان ہوگا۔ اور مسلمانوں کی نیابت حسب ذیل طریقے پر ہوگی۔

پنجاب میں .... منتخب ممبروں کے نصف
یوپی میں .... ۳۰ فیصدی
بہار میں .... ۲۵ "
سی پی .... ۱۵ "
مدراس میں .... ۱۵ "
بمبئی میں .... ایک تہائی

صوبائی حکومت کا ہڈ کانسل کا صدر نہیں ہوگا۔ بلکہ کانسل کے ممبر خود صدر کا انتخاب کرینگے۔ کسٹم۔ پوسٹ۔ ٹکسال۔ نمک۔ افیون۔ ریلوے۔ فوج۔ بیڑہ اور دیسی ریاستوں کے خراج کے علاوہ باقی تمام ذرائع آمدنی صوبائی خیال کئے جائینگے۔ صوبائی کانسل کو اندرونی معاملات میں پوری آزادی ہوگی۔ قرض لے سکتی ہے۔ نیا ٹیکس لگا سکے گی۔ اور بجٹ پر رائے دیگی۔

صوبائی حکومتیں

صوبائی حکومتوں کا افسرِ اعلیٰ گورنر ہوگا۔

ہر صوبے میں ایک ایگزیکیٹو کانسل ہوگی۔

ایگزیکیٹو کانسل کے ممبروں میں کم از کم نصف ممبر ہندوستانی ہونگے۔ جنکو مجلس قانونساز کے ممبر منتخب کرینگے۔

ممبروں کی مدت رکنیت پانچ سال ہوگی۔

امپیریل لیجسلیٹو کانسل

اس کانسل کے ممبروں کی تعداد ۱۵۰ ہوگی۔ جس میں ⅘ منتخب ہوں گے۔ اس کے لئے حق رائے دہندگی زیادہ دیے جائیں۔ اور صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبروں کو بھی رائے دینے کا حق دیا جائے۔

منتخب ممبروں کی ایک تہائی مسلمان ہوں گے۔ کانسل کے ممبر اپنے ہی سے صدر منتخب کرینگے۔ ممبروں کی زندگی پانچ سال ہوگی۔

گورنمنٹ آف انڈیا

والسرائے گورنمنٹ آف انڈیا کا افسر اعلیٰ ہوگا۔

اس کی ایک ایگزیکیٹو کانسل ہوگی۔ جس کے نصف ممبر ہندوستانی ہونگے

وزیر ہند

وزیر ہند کی کانسل توڑ دی جائے۔

وزیر ہند کی تنخواہ انگلستان کے خزانے سے دی جائے

وزیر ہند کی امداد کے لئے دو مستقل انڈر سیکریٹری

ہوں۔ جس میں ایک ہندوستانی ہو۔

اگست ۱۹۱۷ء میں مسٹر مانٹگو وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ہندوستان کو ایک نیا دستور عطا کیا جائے گا۔

خود مسٹر مانٹگو ہندوستان آئے اور لارڈ چمسفورڈ والسرائے ہند سے مشورہ کرنے کے بعد اصلاحات کی ایک رپورٹ مرتب کی۔ یہ مانٹگو چمسفورڈ کے نام سے مشہور ہے۔

ہندوستان کے انتہا پسند طبقہ نے اس کو نامنظور کیا۔ نرم دل نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور انڈین نیشنل فیڈریشن لبرل کے نام سے اپنی ایک جماعت قائم کی۔ مسلم لیگ نے اس رپورٹ کو پسند کیا اگرچہ لکھنؤ پیکٹ کے بعد جو مشترکہ دستوری خاکہ تیار کیا گیا تھا اس کے سامنے موجودہ رپورٹ بالکل ہیچ تھا۔ رپورٹ نے مندرجہ ذیل سفارشیں کی تھیں۔

گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو میں ہندوستانی ممبر کی تعداد بڑھا دی جائے۔

گورنر جنرل کی موجودہ لیجسلیٹو کانسل کو توڑ کر اس کی جگہ پر کانسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی قائم کی جائے۔

کانسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کی تعداد ۵۰ ہونی چاہیئے اور اس کا صدر گورنر جنرل ہو۔ اس کی زندگی پانچ سال ہوگی۔

لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبروں کی تعداد ۱۰۰ ہونی چاہیئے۔ دو تہائی منتخب اور ایک تہائی نامزد۔ اسمبلی کے صدر کو گورنر جنرل نامزد کرے۔

گورنر جنرل کو اسمبلی یا کانسل آف اسٹیٹ کو توڑنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔

تجویزوں کا مقصد سفارش ہونا چاہیئے۔ منظور یا نامنظور کرنے کا اختیار گورنر جنرل اور ملک معظم کی حکومت کو ہوگا۔

سرکاری نامزد ممبر کو تقریر کی آزادی ہونی چاہیئے۔

اور اسمبلی اور کانسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کو ضمنی سوال پوچھنے کا اختیار ہونا چاہیئے۔ گورنر جنرل کو آرڈی ننس نافذ کرنے کا اختیار رہے گا۔

صوبے

صوبائی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینا چاہیئے۔ اور صوبوں میں ذمہ داری حکومت قائم کرنے کے لیئے ضرورت ہے کہ چند محکمے ہندوستانیوں کے چارج میں دیدئے جائیں۔

صوبائی اگزیکٹو

صوبے کی ایگزیکٹو گورنمنٹ گورنر۔ اس کی کانسل ایک وزیر یا ایک سے زیادہ وزراء اور ایک اڈیشنل ممبر پر مشتمل ہوگی۔

ایگزیکٹو کانسل میں دو ممبر ہونا چاہیئے جس میں ایک ہندوستانی ہو

مخصوص امور RESURVED SUBJECTS گورنر اور ایگزیکٹو کانسل کے ممبروں کے ماتحت رہینگے۔ اور (TRANSFERRED) وزراء کے ماتحت ہونا چاہیئے

اڈیشنل ممبر کا کام صلاح اور مشورہ ہونا چاہیئے

صوبائی مجالس قانون ساز

ہر صوبہ میں ایک مجلس قانون ساز ہونا چاہیئے جس میں منتخب ممبروں کی اکثریت ہو۔ گورنر صوبائی کانسل کا پریسیڈنٹ ہو اور نائب صدر مقرر کرنے کا اس کو اختیار ہو۔

کانسل کو توڑنے کا اختیار گورنر کو ہونا چاہیئے۔

نامزد سرکاری ممبروں کو تقریر کی آزادی ہونی چاہیئے۔

فنانس

صوبائی بجٹ کو مرکزی بجٹ سے بالکل الگ کر دینا چاہیئے۔

صوبائی حکومتوں کو چند چیزوں پر ٹیکس لگانے کا اختیار ملنا چاہیئے۔

بجٹ کو مجلس قانون ساز کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ اگر ممبر نامنظور کردیں تو گورنر کو حق ہو کہ وہ اپنے اختیار سے بجٹ منظور کرے

لوکل سلف گورنمنٹ

جہاں تک ممکن ہو لوکل باڈیز میں زیادہ سے زیادہ اختیارات دینا چاہیئے

اس رپورٹ اور سفارشات کی بنیاد پر ۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ اور اس کا نفاذ ۱۹۲۱ء میں ہوا۔

بعض اہم دفعات

وزیر ہند ــــ وزیر ہند کے کانسل کے ممبروں کی تعداد ۹ سے بارہ کردی گئی۔ ان میں نصف ممبر وہ ہونگے جو دس سال تک ہندوستان میں رہ چکے یا ملازمت کرچکے ہیں۔ اور تین ممبر ہندوستانی ہونگے۔ ان کی مدت رکنیت سات سال سے پانچ سال کردی گئی۔

ہائی کمشنر آف انڈیا کا ایک نیا عہدہ قائم کیا گیا۔ یہ کمشنر لندن میں رہیگا۔ اور اس کے ذمہ آئی۔ سی۔ ایس والوں کی ٹریننگ اور انگلستان میں ہندوستان کی دیکھو بھال ہوگی۔

وائسرائے اس کی ایگزیکٹو کانسل اور لیجسلیٹو اسمبلی

(Legislative Assembly) اور کانسل آف اسٹیٹ کا نام گورنمنٹ آف انڈیا ہوا۔ والسرائے کانسل میں تین ہندستانیوں کو جگہ دی گئی۔

مختلف محکمون کی تقسیم اس طرح کی گئی:—

(۱) والسرائے کے ماتحت پولیٹکل اور فارن ڈیپارٹمنٹ رہا۔ یہ محکمے حکومت ہند کے سب سے اہم ہیں۔ بیرونی طاقتون سے صلح و جنگ سب ان ہی کے ذریعہ ہوتی ہیں۔ ایشیا کے دوسرے ملکون سے کیا رویہ رکھنا چاہئے۔ یہ سب مشورے والسرائے برٹش گورنمنٹ کو دیتا ہے۔

(۲) کمانڈر انچیف —— ہندوستانی افواج کا افسر اعلیٰ۔

(۳) فنانس ممبر —— اس کے ذمہ حکومت کی مالیات ہوئی

(۴) ہوم ممبر —— اس کے ذمہ سول سروس والے اور صوبجاتی معاملات دیے گئے۔

(۵) لا ممبر —— قانونی مشورہ اس کے سپرد ہو۔

(۶) کامرس —— ہندوستان کی تجارت اور ریلوے کا انچارج کامرس ممبر ہوا۔

(۷) ایجوکیشن۔ ہلتھ۔ تعلیم اور صحت عامہ کا محکمہ اس کے چارج میں دیا گیا۔

(۸) لیبر اور انڈسٹری —— ملک کی صنعت۔ مل اور کارخانے کا انچارج لیبر ممبر ہوا۔

مجلس قانون ساز —— مرکزی مجلس قانون ساز کے دو حصے کر دیے گئے۔ ایک اسمبلی اور دوسرا کانسل آف اسٹیٹ۔ اسمبلی کے ممبرون کی مدت تین سال اور کانسل آف اسٹیٹ کی پانچ سال رکھی گئی۔ لیکن والسرائے ضرورت کے وقت اس مدت میں کمی اور بیشی کر سکتا ہے۔

کانسل آف اسٹیٹ کے ممبرون کی تعداد ۶۰ رکھی گئی۔ —— ۳۴ منتخب۔ ۲۰ سرکاری اور چھ غیر سرکاری نامزد۔ مسلمانون، سکھون، زمینداروں، اور تاجرون کی نشستون کو محفوظ کر دیا گیا۔

حق رائے دہندگی مرکزی اور صوبائی اسمبلیون کے ممبرون اور میونسپل چیرمینون یونیورسٹی کے ممبرون اور بڑے بڑے لوگون کو دیا گیا۔

اسمبلی کے ممبرون کی تعداد ۱۴۵ رکھی گئی —— ۱۰۵ منتخب۔ ۲۶ سرکاری۔ اور ۱۴ غیر سرکاری نامزد۔ اس میں جگہیں مخصوص کر دی گئیں۔ مرکزی اسمبلی کے اختیارات میں توسیع کر دی گئی۔ ممبرون کو تقریر کی آزادی دی گئی۔ لیکن وہ ایسی تقریر نہیں کر سکتے ہیں کہ جس کا اثر اسمبلی پر پڑے یا کسی ممبر یا اسمبلی کے خلاف ہو۔ یا ملک معظم اور والسرائے پر حرف آئے۔ بجٹ کے بعض حصے محفوظ کر دیے گئے۔ باقی حصون پر بحث کی جا سکتی ہے۔ اور ممبر اس کو منظور یا نامنظور بھی کر سکتے ہیں۔ والسرائے کی اجازت کے بغیر کوئی ایسا بل یا تجویز نہیں پیش کی جا سکتی ہے جس کا اثر مالیات یا دیسی اور بیرونی ریاستون کے تعلقات۔ مذہبی اور فوجی معاملات پر پڑے۔ والسرائے کو اختیار دیا گیا کہ وہ اسمبلی کے پاس کئے ہوئے قانون کو رد کر سکتا ہے۔

صوبجاتی حکومتیں —— ہندوستان کے تمام صوبے گورنرون کے ماتحت کر دیے گئے۔ اور ہر جگہ ایک کانسل قائم کی گئی۔ صوبجاتی کانسلون میں ۷۰ فیصدی جگہیں انتخاب کے ذریعہ رکھی گئیں۔ گورنر کے ایگزیکٹو کی تعداد ۲ سے چار تک رکھی گئی۔ اور نصف جگہیں ہندوستانیوں کو دی گئیں۔ منتخب ممبرون میں سے دو یا تین شخص کو گورنر وزیر نامزد کر سکتا ہے۔ یہ وزرا مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ قرار دیے گئے۔ لیکن والسرائے یا گورنر کی ایگزیکٹو کانسل ہر نہ مجالس قانون ساز کو اور نہ وزرا کو کوئی اختیار دیا گیا۔

صوبائی محکمے دو حصے میں تقسیم کئے گئے۔ مخصوص ( ) اور غیر مخصوص ( ) مخصوص

محکمے مثلاً آبپاشی۔ جیل۔ پولیس۔ لا۔ ریونیو۔ عدالت وغیرہ ایگزیکیٹو کے ماتحت اور لوکل سلف۔ آبکاری۔ تعلیم صحت عامہ وزراء کے چارج میں دے گئے۔

مجلس قانون ساز کو بجٹ کے منظور یا نامنظور یا ترمیم کرنے کا حق دیا گیا۔ جوا۔ سینما اور اشتہارات وغیرہ پر ٹیکس بھی لگا سکتی ہے۔

اس قانون نے مرکزی بجٹ سے صوبائی بجٹ کو الگ کر دیا۔ اب تک ہوتا یہ تھا کہ تمام صوبے کی آمدنی مرکز میں جمع ہوتی تھی۔ پھر وہیں سے صوبہ وار تقسیم کی جاتی تھی۔ اس میں دقت یہ تھی کہ بعض اوقات صوبے کی ضروریات نظرانداز ہو جاتی تھی۔ لیکن نئے انتظام سے یہ دقت دور ہو گئی۔ اور اب صوبجاتی حکومتوں کو اپنے صوبے کی فلاح اور بہبود کے لئے نئی اسکیم بنانے اور چلانے کا موقع ملگیا۔ چنگی اور انکم ٹیکس کی آمدنی مرکز کیلئے مخصوص کر دی گئی۔ فوج ڈاکخانے اور ریلوے وغیرہ مرکز کے ذمہ کر دئے گئے۔

اس کے علاوہ حق انتخاب میں بھی سہولتیں دی گئیں۔

ہندوستانی سیاست کا دورِ جدید

۱۹۲۱ء کے بعد کا تاریخ سیاسی جد وجہد کی تاریخ ہے [illegible] ہزاروں نے جیل کی سختیاں برداشت کیں۔ بدیشی مال [illegible] کالج کا بائیکاٹ کیا گیا۔ خود کانگریس کے اندر دو طبقے ہو گئے۔ سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو کا نسلوں میں جانے کے حامی تھے۔ چنانچہ سوراج پارٹی قائم کی گئی۔

۱۹۲۷ء میں برٹش گورنمنٹ نے سائمن کمیشن مقرر کیا۔ اس لئے کہ ہندوستان کے آئینی اختیارات کے متعلق اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس میں کمیشن میں کسی ہندوستانی کو مقرر نہیں کیا گیا۔ برٹش گورنمنٹ کی اس کاروائی نے پورے ملک میں ایک آگ سی لگا دی۔ اور یہ ہندوستان کے لئے توہین سمجھی گئی۔ چنانچہ کمیشن کے خلاف ایک طوفان اٹھ گیا۔ اور ہر جگہ اس کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے ہندوستان کا دستوری خاکہ تیار کرنے کیلئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ سر علی امام مرحوم اور سر تیج بہادر سپرو اس کے دو اہم ممبر تھے۔ نہرو کمیٹی نے ایک ایسا دستوری تیار کیا جس کی بنیاد درجہ نوآبادیات پر رکھی۔

۳۱ اگست ۱۹۲۹ء کو لارڈ ارون نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی تمام آئینی جد وجہد اور ترقی کا مقصد درجہ نوآبادیات ہے چنانچہ ہندوستان کے لئے جو نیا دستور مرتب ہونے والا ہے اس پر بحث کرنے کے لئے ہندوستانی نمائندوں کو بلایا جاتا ہے۔ لارڈ ارون کے اس اعلان کے خلاف انگلستان میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اور ہندوستانی نقطہ نظر سے برطانی حکومت کی نیت مشتبہ نظر آنے لگی۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کا مقصد مکمل آزادی رکھا گیا۔ اور اپریل ۱۹۳۰ء میں پہلی سول نافرمانی شروع کی گئی۔ لبرل۔ مسلمان اور ریاستوں کے نمائندے پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ لیکن مارچ ۱۹۳۱ء میں سر سپرو اور مسٹر جیکر اور سری نواس شاستری کی کوششوں سے گاندھی ارون پیکٹ ہو گیا۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے۔ اور دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے کانگریس سے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ لیکن نتیجہ صفر ایسا پڑا کہ نمائندوں میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اور گاندھی جی خالی ہاتھ واپس آئے۔ اور آکر پھر سول نافرمانی شروع کر دی۔ تیسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کا کوئی نمائندہ شریک نہ

جب فرقہ وارانہ مسئلہ طے نہ ہو سکا ریمزے میکڈانلڈ کو ثالث بنایا گیا۔ جنہوں نے اپنا مشہور فیصلہ کمیونل اوارڈ کی شکل میں دیا کانگرس کی سول نافرمانی انفرادی طور پر سنہ ۱۹۳۲ء تک جاری رہی غرض کہ چیمسفورڈ ریفارم دستور جدید ہی کا درمیانی وقفہ ہندوستان کیلئے ہیجان خیز تھا۔ جس کے جلو میں سختیاں اور مصیبتیں تھیں۔ اور تاریخ کے ان اوراق پر خون کے چھینٹے بکھرے ہوئے ملینگے۔

انڈیا ایکٹ سنہ ۱۹۳۵ء (دستور جدید)

لندن میں جو گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ انکی بحث کی روشنی میں اور حکومت کے فیصلے کے مطابق ایک قرطاس ابیض (WHITE PAPER) شائع کیا گیا، اور اسپر غور کرنے کیلئے پارلیمنٹ نے ایک جائنٹ سیلکٹ کمیٹی ( ) مقرر کی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بنیاد ہے۔ اس دستور کے دو حصے ہیں۔

(۱) صوبجاتی خود مختاری

اور (۲) فیڈریشن (وفاق)

مسٹر مانٹگو نے سنہ ۱۹۱۹ء میں اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی تدریجی ترقی کی آخری منزل درجہ نوآبادیات ہے۔ چنانچہ چیمسفورڈ ریفارم اس کی پہلی قسط اور دستور جدید دوسری قسط ہے۔ دیکھئے تیسری قسط کب آتی ہے

دستور جدید نے تین نئے صوبے۔ سرحد۔ سندھ۔ اڑیسہ بنائے۔ اس طرح ہندوستان میں کل گیارہ صوبے ہوئے۔ ہر صوبہ میں ایک اسمبلی قائم کی گئی۔ لیکن بعض صوبوں میں اسمبلی اور کاؤنسل دونوں ہیں۔ کاؤنسل ایک مستقل باڈی رکھی گئی۔ صرف اس کے ایک تہائی ممبر ہر تیسرے سال ریٹائرڈ کرینگے اس کا فیصلہ قرعہ سے ہوگا یا گورنر کی مرضی پر منحصر ہے۔ اسمبلی کی زندگی پانچ سال ہوگی۔ گورنر کی امداد اور مشورے کے لئے وزراء کی ایک کاؤنسل ہوگی۔ اسمبلی میں جس پارٹی کی اکثریت ہوگی وہی وزارت بنائیگی۔ وزراء اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہونگے۔ ان کی تنخواہ اسمبلی کے ممبر مقرر کرینگے۔

وزراء اور اسمبلی کے قانونی مشورے کیلئے گورنر ایک ایڈوکیٹ جنرل مقرر کرے گا۔ گورنروں کو اختیار خصوصی دیا گیا۔

اگر صوبے کا امن و امان خطرے میں ہو یا اقلیت کی حق تلفی ہوتی ہو یا سول سروس والوں کا سوال ہو تو گورنر اپنے اختیار خصوصی کو کام میں لاکر وزارت کے کام میں مداخلت کر سکتا ہے۔ وزراء اور ایڈوکیٹ جنرل کو مقرر کرنے یا موقوف کرنے کے اختیارات گورنر کو ہیں۔ وزراء اور ایڈوکیٹ جنرل اسمبلی یا کاؤنسل کی نشست اور بحث میں حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن ان کو ووٹ دینے کا حق نہ ہوگا۔ اسمبلی میں ایک اسپیکر اور ایک ڈپٹی اسپیکر اور کاؤنسل میں ایک صدر اور ایک نائب صدر ہوگا۔ دستور جدید نے صوبجاتی معاملات میں وزراء کو بہت زیادہ اختیارات دئے ہیں۔

یعنی ایسے امور جو صوبجاتی حکومتوں کے اختیار میں ہیں۔ ۵۴ ہیں۔ اس فہرست میں تعلیم۔ اکسائز۔ آبکاری۔ صحت عامہ اور لوکل سلف گورنمنٹ کے علاوہ پولیس۔ جیل۔ پراونشیل سول سروس اور زراعت وغیرہ بھی ہیں۔ یہ حکومتیں بہت سے نئے ٹیکس بھی لگا سکتی ہیں۔

ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کی تعداد

مدراس ۲۱۵۔ بمبئی ۱۷۵۔ بنگال ۲۵۰۔ صوبہ متحدہ ۲۲۵ پنجاب ۱۷۵۔ بہار ۱۵۲۔ سی پی ۱۱۲۔ آسام ۱۰۸۔ سرحد ۵۰۔ اڑیسہ ۶۰۔ سندھ ۶۰۔

کانسل کے ممبروں کی تعداد

مدراس کم از کم ۴۸ اور زیادہ سے زیادہ ۵۶ - بمبئی کم سے کم ۱۹ اور زیادہ سے زیادہ ۳۰ - بنگال کم سے ۴۲ اور زیادہ سے زیادہ ۵۶ - یوپی ۶۰ - ۸ - ۵ - اور بہار ۳۰ - ۲۹ -

اگر کسی وقت صوبے میں جمود پیدا ہو جائے تو گورنر کو اختیار ہے کہ آئین کو ملتوی کر دے - اور کل اختیارات اپنے قبضہ میں لے لے -

فیڈریشن

دستور جدید کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے - اس وقت سیاسی لحاظ سے دو ہندوستان ہیں (۱) برطانی ہند اور (۲) دیسی ہند - دیسی ہند میں تقریباً آٹھ کروڑ لوگ بستے ہیں - جب فیڈریشن کا نفاذ ہو جائے گا تو صرف ایک ہی ہندوستان رہ جائے گا جس وقت نصف والیان ریاست وثیقہ شرکت فیڈریشن (پر دستخط کر دینگے تو ملک معظم) فیڈریشن کے نفاذ کا اعلان کرینگے - مرکزی اسمبلی کا نام فیڈرل اسمبلی یا ہاوس آف اسمبلی ہوگا - کانسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کی تعداد ۲۶۰ ہوگی - جس میں ۱۵۰ برطانی ہند کے نمائندے اور ۱۰۴ والیان ریاست کے نامزد کردہ اور چھ گورنر جنرل کے نامزد کردہ - کانسل آف اسٹیٹ کی زندگی بھی صوبائی کانسلوں کی طرح مستقل ہونگے - صرف ایک تہائی ممبر ہر تیسرے سال ریٹائرڈ کرینگے - انتخاب کا طریقہ براہ راست رکھا گیا ہے -

فیڈرل اسمبلی کے ممبروں کی تعداد ۳۷۵ ہوگی جسمیں ۲۵۰ برطانی ہند کے نمائندے اور ۱۲۵ دیسی ریاستوں کے نامزد ممبر ہونگے - انتخاب بلاواسطہ ہوگا یعنی صوبائی اسمبلیوں کے ممبر منتخب کرینگے - اسمبلی کی زندگی پانچ سال ہوگی -

کانسل آف اسٹیٹ کے ممبروں کی صوبجاتی تعداد

مدراس ۲۰ - بمبئی ۱۶ - بنگال ۲۰ - یوپی ۲۰ - پنجاب ۱۶ بہار ۱۶ - سی پی ۸ - آسام ۵ - سرحد ۵ - اڑیسہ ۵ - سندھ ۵ - بلوچستان ۱ - دہلی ۱ - اجمیر مارواڑ ۱ - کورگ ۱ - یوروپین ۷ - ہندوستانی عیسائی ۲ -

فیڈرل اسمبلی کے ممبر

مدراس ۳۷ - بمبئی ۳۰ - بنگال ۳۰ - یوپی ۳۷ - پنجاب ۳۰ - بہار ۳۰ - سی پی ۱۵ - آسام ۱۰ - سرحد ۵ - اڑیسہ ۵ - سندھ ۵ - بلوچستان ۱ - دہلی ۲ - اجمیر میواڑ ۱ - کورگ ۱ -

غیر صوبائی سیٹ ۴ -

اپنی امداد اور مشورے کے لئے گورنر جنرل فیڈریشن اسمبلی کے ممبروں میں سے وزرا کا انتخاب کرے گا - جو اس سے زیادہ نہ ہونگے - قانونی مشورے کیلئے ایک ایڈوکیٹ جنرل مقرر کرے گا -

۵ فیڈرل سبجکٹ ہیں - یعنی ڈیفنس - امور خارجہ - ڈاکخانہ کرنسی اور ریلوے (Reserved) سبجکٹ ہیں - ڈیفنس اور امور خارجہ کے متعلق مشورہ کیلئے گورنر جنرل مشیر کار مقرر کرے گا جنکی تعداد تین سے زیادہ نہ ہوگی - گورنر جنرل کا ایک فنانشل مشیر بھی ہوگا - گورنر جنرل کو اختیار خصوصی بھی دیا گیا ہے - اگر ملک کا امن خطرہ میں ہو یا اقلیت کی حق تلفی اور ان پر زیادتی ہو - یا سول سروس والوں کا خیال ہو - یا والیان ریاست کے حقوق نظر انداز ہوتے ہوں یا ان کے مرتبہ یا شان میں کچھ فرق آتا ہو تو گورنر جنرل ایسے موقع پر اپنے تمیز خصوصی سے کام لیگا -

نئے دستور کے نفاذ سے برما ہندوستان سے علیحدہ ہو گیا -

ریلوے کے انتظام کیلئے ایک ریلوے بورڈ ہوگا -

حق رائے دہندگی میں مزید سہولتیں دی گئیں -

نوٹ :- ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے اب تک ہندوستان کے آئین میں جو جو تبدیلیاں کی گئیں ان کو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنیکی کوشش کیگئی ہے -

حیاتین VITAMINS

از جناب سید علی سجاد قنبر رضوی عظیم آبادی

تمہید ۱۹۳۲ء کی میڈیکل ریسرچ کونسل کا بیان ہے کہ پولینڈ کے ایک یہودی ڈاکٹر کیسیمر فنک D.CASIMIR FUNK نے ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلے VITAMINE وائیٹامائن لفظ کو وضع کر کے ایک انگریزی رسالہ میں کہ جس کا نام THE ETIOLOGY OF DEFICIENCY DISEASE تھا شائع کیا۔ وائٹا VITA سے اُس کی مراد اُن اجزاء سے تھی جو زندگی کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اور AMINE کو لفظ AMONIA امونیا یعنی نوشادر سے لیا کہ یہ بھی اس کے خیال میں ضروری اجزاء کا ایک اہم جزو تھا مگر چونکہ لفظ مذکور کا دوسرا جزو یعنی امائن ہونا ثابت نہ ہو سکا لہذا ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر جے سی ڈرمنڈ کی رائے کے مطابق آخر کی ای (E) حذف کر کے (VITAMINE) وائٹامن نام رکھا گیا جو اب تمام رائج ہے۔

اِدھر چند سالوں سے حیاتین[1] کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کی گئی ہیں۔ اور معلومات میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ حیاتین اے سے یلمر پی فیلکر مینک دریافت ہو چکی ہیں۔ جنکو اب مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے چنانچہ بی (B) کی آٹھ قسمیں قرار دی جا چکی ہیں۔ مگر یہاں صرف انہیں حیاتین پر روشنی ڈالی جائے گی۔ جو زیادہ مشہور اور زندگی کے لئے نہائت ضروری ہیں۔

انکشاف DISCOVERY ۲۰ مئی ۱۷۴۷ء میں LIND نامی ایک انگریز بحری ڈاکٹر SCURVY داءالاخفر (اسکربوط) کے چند مریضوں کو SALISBURY نامی جہاز پر سوار کر کے بحری سفر کر رہا تھا۔ اثنائے سفر میں صرف لیموں اور نارنگیوں کے استعمال سے مریض اچھے ہونے لگے یہاں تک کہ ایک ہفتہ کے اندر مریض اچھے ہو کر اپنا اپنا کام کرنے لگے۔

ڈاکٹر میجنڈی Dr. MAGENDY نے کتوں پر تجربہ کیا اور ایک رسالہ LANCET لینسیٹ مجریہ ۱۱ مارچ ۱۸۲۶ء میں اپنا بیان شائع کیا کہ وہ کتے جن کو وہ میدے کی روٹیاں اور پانی دیا کرتا تھا پچاس دنوں کے اندر مر گئے۔ مگر وہ کتے کہ جنہیں چوکر ملی ہوئی روٹیاں اور پانی دیا جاتا تھا تندرست رہے

اُس وقت تک چونکہ غذا کے متعلق کافی معلومات نہیں بہم پہنچ سکیں تھیں لہذا ان دو تجربوں کے باوجود بھی کسی کا خیال حقیقت حال کی طرف منتقل نہیں ہوا۔

ڈاکٹر ایک مین نے بمقام جاوا DEFICIENCY DISEASE غذا کے ضروری اجزاء کی کمی کی وجہ سے ہونے والی بیماریوں کا کامیاب علاج کیا

۱۸۸۴ء میں جاپان کے سمندری بیڑے میں بیری بیری کی بیماری اس زور سے پھیلی کہ ہزاروں گھر تباہ ہو گئے۔ ADMIRAL

[1] حیاتین کو میں نے مؤنث لکھا ہے مجھے یہی سامعہ نواز معلوم ہوا۔ قنبر

TAKAKI امیر البحر ٹکاکی بعد غور وفکر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس بیماری کا علاج غذا کی تبدیلی سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جملہ ملازمین سرکاری کو بجائے صاف چاول (مشین کا چھانٹا ہوا) مچھلی اور سبزی کے۔ آٹا۔ جو۔ سیم۔ دودھ۔ گوشت اور تھوڑا لال چاول دینا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۹ء تک اس بیماری کا وہاں نام نشان تک نہ رہا۔ مگر بدقسمتی دیکھئے کہ اس پر بھی لوگوں کو اس کا احساس کافی طور سے نہیں ہوا کیونکہ اسی زمانہ میں جاپان سرکار نے شہر کی عام صفائی کی طرف بھی نمایاں اقدام کیا تھا لہذا لوگوں نے خیال کیا کہ صرف صفائی کی وجہ سے ہی بیماری دور ہو گئی ہے۔

۱۸۹۷ء میں جاپان کے قیدیوں کے ایک ہسپتال میں بیری بیری کے مریض بھرے ہوئے تھے۔ اس سے ملحق ایک مرغی خانہ تھا۔ مرغیوں کو بھی یہی بیماری تھی۔ اتفاق وقت کہ ڈاکٹر اجک مین ہی اس ہسپتال کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس نے غور کیا کہ آخر ایسی کون سی چیز ان دونوں میں مشترک ہے جو دونوں کو ایک ہی قسم کی بیماری ہو گئی ہے۔

وہ چیز تھی مشین کا چھانٹا ہوا صاف چاول!

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے اس کو ثابت کر دیا کہ چاول کے کنے (کنڈا) سے بیری بیری کا کامیاب علاج ہو سکتا ہے۔

۱۸۸۱ء میں لونن نے چوہوں پر تجربہ کیا۔ پروفیسر سوسن اور ہیکل ہیرنگ نے بھی اپنے اپنے تجربوں کے بعد بیانات شائع کئے ۱۹۱۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ڈاکٹر سر فریڈرک جی ہوپ کنگس کا بھی بیان شائع ہوا کہ کس طرح وہ چوہے جنہیں مصنوعی غذائیں دی جاتی تھیں کمزور ہو کر مر گئے اور جب ان کی غذاؤں میں دودھ کا اضافہ کر دیا گیا تو باقی چوہے رفتہ رفتہ تندرست ہو گئے۔

ڈاکٹر میک کالم اور اس کے ساتھیوں نے بھی نمایاں تحقیقاتیں کی ہیں۔ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ آخر چوہوں ہی پر کیوں تجربہ کیا گیا۔ انشاء اللہ تعالے کسی دوسرے موقع پر اس پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

اصطلاحات NOMENCLATURE

مختلف وائیٹامنس (حیاتین) کے ناموں کی وضع کسی باقاعدہ اور خاص اصول پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے آج بھی ان کے ناموں میں تفاوت پائے جاتے ہیں۔

۱۹۱۵ء میں ڈاکٹر میک کالم اور ڈیوس نے دریافت کیا کہ بعض اجزا جو۔ مکھن۔ انڈے کی زردی۔ کاڈلیور آئیل۔ کلیجی اور گردے وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ہری ترکاریوں میں نہیں ہوتے۔ ایسے اجزا کا نام "FAT SOLBLE "A" رکھا گیا۔

پھر یہ دریافت ہوا کہ پانی میں بھی چند ایسے اجزا ہیں جو پرندوں کی عام اعصابی شکائتوں کے لئے مفید ہوتے ہیں اس کا نام WATER SOLUBLE "B" رکھا گیا۔ یہ انسان کی نشو ونما اور تندرستی کیلئے بھی ممد ثابت ہوئے ہیں۔

اس کے بعد کر سچیانیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایکزل ہوسٹ نے پتہ لگایا کہ اس میں ایک اور نمایاں جزو ہے جو زندگی اور تندرستی کے لئے ضروری ہے اس کا نام وائیٹامن سی رکھا گیا۔ VITAMIN "C"

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر میلن بیبز (موجودہ سرایڈورڈ) نے حیاتین ما نع کساح دریافت کیا جو اب وائیٹامن ڈی کے نام سے موسوم ہے ڈاکٹر ایونس نے وائیٹامن ای دریافت کیا۔ مختصر یہ کہ اسی طرح اے سے پی فیکر ٹمک حیاتین دریافت ہوئیں۔ ان میں "کے" اور "ایچ" فیکٹرس قابل ذکر ہیں۔ پورے نام ملاحظہ ہوں

حیاتین مانع جریان خون ANTI HAEMORRHAGIC FACTOR FAT SOLUBLE VITAMIN "K"

حیاتین مانع امراض جلد ANTI DERMATITIS FACTOR WATER SOLUBLE VITAMIN. H

وائیٹامن۔ اے VITAMIN "A"

نباتات کے پتوں میں کیروٹینس CAROTENES ہوتا ہے۔ جب نباتات پھولنے کے قریب ہوتے ہیں تب ان میں کیروٹینس زیادہ ہوتا ہے۔ یہ کیروٹینس آفتاب کی شعاعوں سے موثر ہو کر وائیٹامن اے بنجاتا ہے۔ حیوانات، پتوں اور پھلوں کے ذریعہ کیروٹینس حاصل کرتے ہیں جو حیوانات کے جگر میں بصورت وائیٹامن اے جمع ہو جاتا ہے۔ پرندوں کے انڈوں کی زردی میں ہوتا ہے مچھلیاں کائی اور ان سبزیوں کو جو سمندروں میں پیدا ہوجاتی ہیں کھاکر کیروٹینس حاصل کرتی ہیں۔ اور اس طرح مچھلیوں کے جگر اور انڈوں میں حیاتین اے پائی جاتی ہیں۔

مندرجہ ذیل چیزوں میں بافراط پایا جاتا ہے

دودھ دینے والے جانوروں کی کلیجی۔ انڈوں کی زردی مچھلیوں کے جگر پھیپھڑوں اور انڈوں سبز ترکاریوں اور مکھن میں۔ گھی میں بہت کم ہوتا ہے۔ وہ بھی اس میں زیادہ دیر رہنے سے ضائع ہوجاتا ہے۔ گاجر اور آم میں زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کاڈ لیور آئیل میں یہ حیاتین بکثرت ہوتی ہے۔ مگر اب دریافت ہوا ہے کہ ہیلی بٹ لیور آئیل HALLIBT LIVER OIL اس تیل کے واسطے زیادہ مقدار ہوتا ہے۔

وائیٹامن اے جسم کی مناسب نشو و نما کے لیے بہت ضروری ہے۔ خصوصاً حفظ ما تقدم کے لئے خاص کر مفید ہوتا ہے پھیپھڑوں و ریشوں کے اندر کی جھلی کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کی کمی سے جلد سخت اور خشک ہونے لگتی ہے۔ خون کم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھوں کی جھلی خشک ہونے لگتی ہے۔ شب کوری کا مرض پیدا ہوجاتا ہے۔

حیاتین بی اوّل VITAMIN B 1

اس کے دوسرے نام نورن اور تھیامن بھی ہیں۔ ڈاکٹر جینسن اور ڈونتھ نے سنہ ۱۹۲۶ء میں اس کے متعلق بہت سی مفید باتیں دریافت کیں۔ سنہ ۔۔۔ میں وسن نامی ایک ڈاکٹر نے بیان شائع کیا کہ عورتوں کو خون کی کمی کی وجہ سے جو ایام حمل میں بیماری ہو جاتی ہے اس کا علاج ۔۔۔ سے جو وائیٹامن بی اوّل اور بی دوئم میں پائے جاتے ہیں۔ کیا جاسکتا ہے۔ پھل اور پھول میں اور کسی قدر پتیوں میں پایا جاتا ہے۔ آفتاب کی شعاعوں کا خاص اثر پڑتا ہے۔ چوکر بھرے ہوئے آٹے میں چاول کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ میدہ میں بالکل نہیں ہوتا۔ مسلم اناج (کھڑے اناج) دال۔ آلو۔ گوبھی۔ گاجر۔ حیوانات کے دماغ۔ قلب۔ جگر۔ گردوں اور آم میں زیادہ ہوتی ہے۔ غذا میں اس کی موجودگی کی وجہ سے بیری بیری کا مرض نہیں ہوتا۔ بغیر چھانے ہوئے چاول اور دال کے اوپری حصہ میں زیادہ ہوتی ہے۔ مشین کے چھانے ہوئے اناج میں بالکل کم ہوتی ہے۔ امریکہ کی پبلک ہیلتھ اتھارٹیز کا بیان ہے کہ جس مقدار میں اناج کھایا جائے اس کا تیسرا حصہ مسلم اناج استعمال کرنا چاہئے۔

بچوں میں نہیں ہوتی اس کی کمی سے بھوک کم ہو جاتی ہے۔ خون کم پیدا ہوتا ہے۔ وضع حمل کے بعد اگر عورتوں کو یہ حیاتین صحیح مقدار میں نہیں ملتی ہیں تو دودھ خشک ہوجاتا ہے۔

حیاتین بی دوئم VITAMIN B 2

پہلے یہ PELLAGRA PREVENTIVE FACTOR

(OF GOLD BERGER کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ زمانۂ حال میں دریافت ہوا ہے کہ یہ دو اہم ترین اجزاء سے مرکب ہے۔ ایک تو نشوونما میں مدد پہنچاتی ہے مگر اس کو جلد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور دوسرا (THE DERMATITIS PREVETIVE FACTOR) مانع امراض جلد ہے۔ حیاتین بی دوئم کا لیکٹوفلیون بھی نام ہے۔ ۱۹۳۷ء کی مجلس ماہرین بین الاقوام نے لیکٹوفلیون LACTO FLAVIN کو غذا کا ایک اہم ترین جزو مان لیا ہے۔ کیونکہ اس کی کمی سے انسان بیمار اور کمزور ہو کر مر جاتا ہے۔ ابھی اس کے متعلق اس سے زیادہ معلومات نہیں حاصل ہوئی ہیں کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کس عضو بدن پر اس کا کیا خاص اثر ہوتا ہے۔ اس کے باقی اجزا ابھی پردہ خفا میں ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی کمی کی وجہ سے مرض جلدی۔ اسہال معوی اور قلت الدم کی بعض بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر اڈ ابنڈ ہارٹ نے ۱۹۳۶ء میں ایک بیان شائع کیا تھا کہ بچوں کے ورم معدہ کا ازالہ اتارے ہوئے دودھ اور خمیر سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ کاڈ لیور آئیل سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

غلوں میں یہ بہت کم ہوتا ہے مگر یونٹ۔ مونگ، ماش اور ارد کی دال میں کچھ زیادہ۔ دودھ۔ انڈا اور خمیر میں یہ حیاتین بافراط ہوتی ہیں۔ ان کی کمی سے بھوک کم ہوجاتی ہے۔ اور پتلے دست آنے لگتے ہیں۔

حیاتین سی | VITAMIN C

۱۹۳۲ء میں SZENT-GYORGYI نامی ہنگری کے ایک ڈاکٹر نے دریافت کیا اور اس کا نام اسکاربک ایسڈ رکھا۔ مصنوعی طریق سے ہنگری کی گول مرچ سے بھی یہ حیاتین تیار کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ قدرتی حیاتین سے یہ کمزور نہیں ہوتی ہیں۔

مندرجہ ذیل چیزوں میں پائی جاتی ہے

ہرے پتے سبز ترکاریاں۔ تازہ پھل۔ سوکھی املی۔ امرود اور آلو سے میں زیادہ۔ گوشت۔ مونگ جس میں انکھوے پھوٹے ہوں ٹماٹر۔ پپیتہ۔ گوبھی۔ لیموں۔ نارنگی۔ سیب کیلا۔ انگور۔ آلو۔ باجرا۔ چقندر۔ کچے اور تازہ دودھ۔ دودھ میں بہت کم ہوتا ہے اور وہ گرم کرنے سے ضائع ہوجاتا ہے۔ جو بچے صرف دودھ ہی پر رہتے ہیں انہیں تازہ پھلوں کے عرقیات بھی دینا چاہئے اس سے HYPOVITAMINOSIS کی حفاظت ہوتی ہے۔ اناج کے انکھوؤں اور مونگ کے دال میں بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جس جگہ سبز ترکاریاں اور پھل نہیں ملتے وہاں انکھوؤں کے ذریعہ اس کی کمی پوری کی جاسکتی ہے۔ مگر انکھوؤں کو یا تو کچا کھایا جائے یا اگر پکانا ہی ضروری ہو تو دس منٹ سے زیادہ آگ پر نہ رکھیں۔

اس کی کمی سے دانتوں کی ساخت خوبصورت طریق سے نہیں ہونے پاتی۔ دانت کمزور ہوجاتے ہیں اور خون آنے لگتا ہے۔ SCURVY داء الاخضر (اسکربوط) کی بیماری ہوجاتی ہے۔ دانت جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ منہ میں اکثر دانے نکل آتے ہیں۔

حیاتین ڈی | VITAMIN "D"

اس کا دوسرا نام ANTIRACHITIC FACTOR مانع کساح ہے اسے CALCIFEROL بھی کہتے ہیں۔

تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ بعض چکنائیوں میں ایک خاص شے پائی جاتی ہے۔ انگریزی میں اس کو ارگیسٹرول ERGOS-

(TEROL) کہتے ہیں جس پر آفتاب کی الٹراوائیلٹ ریز پڑنے سے حیاتین ڈی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان کے جلد کے نیچے جو چربی ہوتی ہے اس میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ جب اس پر دیر تک دھوپ پڑتی ہے تو انسان کے جسم میں بھی یہ حیاتین پیدا ہو جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل چیزوں میں پائی جاتی ہے

انڈے کی زردی۔ دودھ۔ ہری ترکاریاں۔ اور مچھلی کی کلیجی میں زیادہ ہوتی ہے۔ شکر کے سوا باقی جتنی اشیا اغوردنی ہیں اگر ان کو آفتاب کی الٹراوائیلٹ ریز کے سامنے رکھا جائے تو یہ حیاتین ان میں پیدا ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات میں آرگسٹرول ہوتا ہے۔ اور جب اس کو دھوپ دکھلائی جائیگی تب اس میں یہ حیاتین پیدا ہو جائیگی

جو گائے آزادانہ سبزہ زاروں میں چرتی ہے اس کا دودھ اور مکھن زیادہ مفید ہوتا ہے VISCONSIN UNIVERSITY میں گائے کو دھوپ میں رکھتے ہیں تاکہ اُس کے دودھ میں حیاتین ڈی بافراط پیدا ہو جائے۔ امریکہ میں بچوں کو دھوپ دکھلایا ہوا دودھ دیا جاتا ہے۔ اس سے RICKETS سوکھا کی بیماری کی حفاظت ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو صبح کے وقت کچھ دیر تک دھوپ میں رکھنا چاہئے تاکہ ان کے جسم میں قدرتی طور سے یہ حیاتین پیدا ہو جائے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو بچے ماں کا دودھ پیتے ہیں اُن کو سوکھا کا مرض RICKETS نہیں ہوتا کیونکہ ماں کے دودھ کے ذریعہ ان کو یہ حیاتین ملتی رہتی ہے۔

۱۹۳۲ء میں ولسن نے شمالی ہندوستان میں ہڈیوں کی عام کمزوری کا (مرف اُس خیمہ سے جو شراب کے پیپوں میں پایا جاتا ہے۔) کامیاب علاج کیا۔ یہ ہڈیوں کی مناسب نشوونما میں مددہو پہنچاتی ہے۔ اور دودھ۔ مکھن۔ ہری ترکاریوں۔ گیہوں کی کیمون میں پائی جاتی ہے۔

حیاتین ای — VITAMIN E

اس کے انکشاف کو صرف پندرہ سال ہوئے ہیں۔ اس درمیان میں اس کے متعلق تشفی بخش معلومات نہیں حاصل ہو سکیں۔ Dr. RACH-ARACH کا ۱۹۲۸ء میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل پانچ چیزوں میں اس کا وجود ثابت کیا ہے۔

عـ۱ گیہوں کے انکروں کے تیل کا وہ حصہ جو صابن میں تبدیل نہیں ہوتا بافراط ہوتا ہے
عـ۲ چاول کا تیل جو ایتھر میں چاول کے بیرونی اجزا کے حل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔
عـ۳ ناریل کا تیل
عـ۴ روئی کے بیج کا تیل (تخم پنبہ کا تیل)
عـ۵ ہرے پتوں کے دودھیہ حصے کے اجزائے شحمیہ۔

ڈاکٹر موٹر پہلا شخص ہے جس نے ۱۹۳۱ء میں اپنا بیان شائع کیا کہ اس نے کس طرح صرف گیہوں کے انکروں کے تیل سے متعدد عورتوں کا جن کے حمل برابر ضائع ہو جایا کرتے تھے کامیاب علاج کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کری نے ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر واٹسن نے ۱۹۳۲ء میں اور ڈاکٹر بٹو نے ۱۹۳۵ء میں اس بات کو ثابت کیا کہ جن عورتوں کے حمل ضائع ہو جایا کرتے ہیں ان کے جسم میں اس حیاتین کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی سے حمل کی محافظت ہو سکتی ہے۔ قوی امید ہے کہ زندہ اور تندرست لڑکا پیدا ہو یا بانجھ عورتیں اس سے شفایاب ہوں۔

ڈاکٹر شوٹ نے بھی اسقاطِ حمل اور مشیمہ کی علیحدگی کا اس حیاتین سے کامیاب علاج کیا ہے۔ غذا میں اس حیاتین کی مناسب مقدار نہ ہونے سے عورتیں بانجھ ہو جاتی ہیں۔ بعضوں کا حمل باربار ضائع ہوتا رہتا ہے۔ مردوں میں نامردی پیدا ہو جاتی ہے۔

کشتگان فریب

ضخامت ۶۵ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: حاجی نبی احمد۔ درزی چوک بریلی

یہ کتاب بھی جناب حاجی صاحب کے ایک طویل افسانہ پر مشتمل ہے۔ جسمیں ایک بدکار مولوی کی عیاریوں کا راز فاش کیا گیا ہے نیز اس میں شامل عشق و محبت کی چاشنی موجود ہے۔ زبان شستہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ ع۔ س

نیکی اور شیطان سے بحث ہوتی ہے۔ شیطان کا خیال ہے کہ میرا پلہ بھاری ہے، بھلا نیکی کیوں ماننے لگی۔

شیطان کی توبہ

ضخامت ۲۴۲ صفحات۔ کاغذ عمدہ چکنا۔ کتابت و طباعت بہت اعلیٰ۔ ٹائیٹل پیج نہایت دیدہ زیب معہ گرد پوش قیمت عہ/۱۲

ملنے کا پتہ: ۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

جامعہ عثمانیہ نے اپنی پچیس سالہ زندگی میں مختلف علوم و فنون کو مادری زبان کے ذریعہ ترقی دیکر جو بیش بہا کارنامہ پیش کیا ہے۔ اس سے کسی صاحب علم کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اب ہمیں یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو نے اس کی قابل قدر علمی نمونے کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔

زیر نظر کتاب میں جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل چھبیس ۲۶ شعراء کی بلند پایہ نظموں اور غزلوں کا انتخاب ان کی خصوصیات کلام پر مختصر مگر جامع نوٹ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس مرقع سخن میں حیدرآباد کے مشہور و معروف شعراء بھی ہیں اور غیر معروف بھی۔ نیز مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کا کلام شامل ہے۔

مجموعی طور پر یہ نادر مجموعہ سخن اردو ادب میں ایک گرانبہا اضافہ ہے۔ کتاب کے آغاز میں اردو کے مایہ ناز ادیب جناب محی الدین زور اور جناب عبدالقیوم خان باقی کی تقریظیں شامل ہیں۔ نیز شعراء کے گروپ فوٹو بھی ہے۔

جنھیں اردو شعر و شاعری سے کچھ بھی دلچسپی ہے۔ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں کوئی بھی لائبریری اسکے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی ہم ادارۂ ادبیات کو اسکی اس شاندار خدمات پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ق۔ ع

ان سب، کے اسباب کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انداز بیان نہایت دلکش اور پر اثر ہے۔ مسلمانوں کا ... معاون ہے۔

ع۔ س

سائینس کی انوکھی کہانیاں

مصنفہ: ۔ ڈاکٹر محمد قدرت خدا۔ ڈی۔ ایس سی (لندن) ڈی۔ آئی سی ایم ایس سی کلکتہ گولڈ میڈلسٹ پی آر ایس

مترجمہ: ۔ جناب مولوی رشید احمد ندوی

نظر ثانی: ۔ از جناب محمد طاہر رضوی ایم۔ اے پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ پبلشرز: ۔ ماڈرن بک ایجنسی ۱۰۔۸ کالج اسکوائر کلکتہ

ضخامت ۴۷۹ صفحات۔ کاغذ عمدہ چکنا۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت مجلد عہ/۱۲

سائنس جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اور جن مختلف طریقوں سے انسان پر چھا رہی ہے وہ غالباً کسی سے پوشیدہ نہیں۔ غیر زبانوں میں سائنس سے متعلق بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ نصاب تعلیم میں جبتک اسے ثانوی درجہ حاصل رہا تعلیم انگریزی زبان میں ہوتی رہی۔ لیکن ہندوستانی طلباء کیلئے اس مشکل فن کی تعلیم غیر مادری زبان میں نہایت دقت طلب تھی۔ چنانچہ انہیں مشکلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس فن کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے جب ۴۳ء سے اس فن کو ثانوی سے لازمی کا درجہ دے دیا وہاں سے

ارباب ذوق نے اس کی طرف توجہ شروع کی اور وہاں کے ہندوستانی طلبا کے لئے اس کا ترجمہ اردو میں شائع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی "سائنس کی انوکھی کہانیاں" کی صورت میں پیش کی گئی۔ پوری کتاب مندرجہ ذیل سات باب پر مشتمل ہے

۱۔ داستان علم ہیئت ۲۔ طبقات الارض ۳۔ عالم نباتات۔ ۴۔ حیات حیوانات۔ ۵۔ داستان عضویات۔ ۶۔ مادہ کی مختلف کہانیاں۔ ۷۔ علم کیمیا کی ابتدا۔

مندرجہ بالا عنوانات کی جس فاضلانہ طریقہ پر سیر حاصل تشریح کی گئی ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلہ کو اتنی آسانی سے سلجھایا گیا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار پھڑک اٹھتا ہے۔ اسباق کی آسانی کیلئے مختلف تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ مختلف مذاہب کے حوالے بھی دئے گئے ہیں۔ مشاہیر زمانہ کے خیالات بھی قلمبند کئے گئے ہیں۔ سنسکرت اور بنگلہ زبان کے ان اشعار کا جو اس سے متعلق ہیں اردو نظم میں ترجمہ کرایا گیا ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور قابل غور خصوصیت جو اس کتاب میں ہے وہ زبان وادب کی چاشنی اور بیان کی سادگی ہے۔ اتنے خشک موضوع کو دلچسپ پیرایہ میں ترجمہ کرنا مولانا رشید احمد ندوی ہی کا حصہ تھا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ قابل قدر تصنیف کلکتہ اور دیگر یونیورسیٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل کر لی جائیگی۔ ع۔ س

رسالے

رسالہ جدید اردو کلکتہ کا بنگال نمبر

ادارہ ۱۔ پرویز شاہدی ایم اے۔ احسن احمد اشک۔ سعد منیر۔ ایم زیڈ احسن قاضی

ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍

"جدید اردو" اردو کا مشہور رسالہ ہے جو سرزمین بنگال میں زبان وادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ عوام کا خیال تھا کہ بنگال کی زمین اردو رسالوں کے حق میں نہایت شور واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کی ذیل میں وہ ان رسالوں کی فہرست پیش کرتے ہیں جو وہاں سے نکلے اور کچھ عرصے کے بعد بند ہو گئے۔ لیکن مسرت کی بات ہے کہ "جدید اردو" نے عوام کے اس سطحی نظریے کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اور بتا دیا کہ شور زمین کو زرخیز بنانا انسان کے اختیار میں ہے۔ تین سال ہو رہے ہیں جب "جدید اردو" کا کلکتہ سے اجرا کیا گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک پابندی وقت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ تمام تر مضامین معیاری ہوتے ہیں۔ تصویروں سے بھی رسالہ کی زینت بڑھائی جاتی ہے۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں اس نے اپنا قابل قدر بنگال نمبر شائع کیا ہے۔ بنگال کے قریب قریب تمام مشاہیر اہل قلم اس میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر صوبوں کے لکھنے والوں سے بھی نمبر کی زینت بڑھائی گئی ہے۔ مقالوں میں خان بہادر مولانا رضا علی وحشت کا گرانقدر مقالہ "اردو کا تعلق بنگالہ سے" نہایت گہرے مطالعہ کا محتاج ہے۔ اتنے وسیع موضوع کو دو چار صفحوں میں قلمبند کر دینا حضرت وحشت ہی کا کام تھا۔ مولانا محفوظ الحق ایم۔ اے کا مقالہ "تذکرۂ ہفت اقلیم" بھی قابل قدر ہے۔ پروفیسر طاہر رضوی ام۔ اے اور جناب کلیم اللہ صاحب کے مقالے "فردوسی اور دقیقی" اور "ایران اور ہندوستان کے قدیم تعلقات" اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں" وحشت اور تتبع غالب" بھی قابل مطالعہ ہے۔ "اوقاف اسلامی کا صحیح مصرف" خشک لیکن مفید ہے۔ افسانوں میں "محبت اور شادی" بیچی کہانی "معلمہ" نہایت دلچسپ ہیں۔ "بنگالی طن" کا ایک اردو ترجمہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ گھریلو زندگی کی اتنی دلکش تصویر سوائے بنگالی ادب کے اور کہیں نہیں ملتی۔ محترمہ رومانہ بیگم کے انتخاب ترجمہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔ حصۂ نظم کافی بلند ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ جس نمبر میں آرزو۔ وحشت۔ جمیل۔ آسف۔ اسحق امرتسری۔ ٹیگور اور نذرالاسلام اکٹھے جمع ہو جائیں۔ اس کا کیا کہنا۔ ایک سہ رنگی اور دو تین یک رنگی تصویریں بھی ہیں۔ ساحران بنگالہ وحشت۔ نذرالاسلام اور

ٹیگور کا ایک گروپ فوٹو بھی ہے۔

حضرت پیر دبیر شاہدی کی غیر حاضری بنگال نمبر میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ الغرض بنگال نمبر ہر طرح کامیاب ہے اور اس کے کارکنان مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ملنے کا پتہ :۔ دفتر جدید اردو ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ ر-ع-س

خاص نمبر عالمگیر ۴۰ء کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ عمدہ، ٹائیٹل خوشرنگ، قیمت تین روپے

عالمگیر اردو زبان کا پرانا خدمتگزار ہے جو پابندی اشاعت کے ساتھ لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں اس نے اپنا دیدہ زیب اور قابل قدر خاص نمبر شائع کیا ہے۔ مضامین نظم و نثر دلچسپ اور معیاری ہیں۔ تصویریں بھی اعلیٰ شاہکار کا نمونہ ہیں۔ مقالوں میں ملک شاہ سلجوقی، چینا، افادات میر، سلاطین عرب کی چند لڑائیاں، سید جمال الدین افغانی اور درگاہوں مفید اور قابل قدر ہیں۔ آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ اور روزمرہ اور محاورہ بالکل اچھوتی چیزیں ہیں۔ اور گہرے مطالعہ کی ترجمان۔ افسانوں میں احمد ندیم قاسمی، جمیل محمد نسیم صاحبو۔ ی۔ ایم۔ اسلم اور مرزا ادیب کے افسانے حد درجہ دلآویز ہیں۔ نظموں میں علامہ سیماب، علامہ شفق، استاد جلیل، جگر مراد آبادی، روش شاہجہانپوری، نوح ناروی اور امین حزین کے جواہر پارے شریک اشاعت ہیں۔ جناب شبلی بی کام اور جناب حافظ محمد عالم خاص نمبر کی کامیابی کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں

ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ عالمگیر۔ بازار سید مٹھا لاہور ع-س

البیان امت مسلمہ امرتسر کا ماہوار رسالہ ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ۷۴ صفحات، چندہ سالانہ تین روپے۔ اس رسالہ کے اغراض و مقاصد بیان نہیں کئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ امت مسلمہ ایک جماعت ہے جس کے مقاصد میں تبلیغ اسلام اور خدمت قرآن داخل ہیں۔ اور یہ رسالہ اس جماعت کا آرگن ہے۔ چنانچہ جو اشاعت بابت ماہ فروری ۱۹۴۰ء زیر تبصرہ ہے اس میں دو مضامین ہیں۔ گو مضمون نگاروں کے بعض نظریات سے اتفاق کرنا مشکل ہے مگر طلبۂ قرآن کے لئے یہ بحثیں مزید دلچسپ ہیں۔

ملنے کا پتہ :۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر۔

نور الحسن [illegible] صفحات کا رسالہ جو دفتر امت مسلمہ امرتسر پنجاب سے شائع ہوا ہے [illegible] قیمت [illegible] ہے [illegible] فاضل مصنف غازی رحمت اللہ جالندھری نے فرقہ بندی کے [illegible] آیات قرآنی [illegible] [illegible] [illegible] ہے کہ اسلام [illegible] [illegible] [illegible] مسلم [illegible] سارے فرقے [illegible]۔ [illegible] مشکل سوال یہ ہے کہ اختلافات [illegible] نہایت جو اختیار کیا جائے؟ بہرحال اس رسالہ در خصوصاً ارشادات ربانی سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی کس درجہ مذموم ہے۔

ڈاکٹر ضمیر حسن مرحوم

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید　　ز جام دہر مے کل من علیہا فان

ولادت اور سکونت: ـ ۱۸۶۲ء میں بمقام ڈھونڈھا جو پٹنہ گیا لائن میں ٹہٹہ اسٹیشن سے دو میل مشرق کی طرف واقع ہے پیدا ہوئے ۔ آپکے والد ملک مراد علی صاحب ایک خوشحال اور معزز کاشتکار تھے ۔ قرب و جوار میں آپ کے خاندان کی کافی قدر و منزلت تھی ۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پانچ بھائیوں میں چوتھے تھے ۔

یتیمی اور مشکلات: ـ صغیر سنی ہی میں والد بزرگوار کا سایہ آپکے سر سے اٹھ گیا اور خاندانی جائداد بھی زمانے کے ہاتھوں تخس نخس ہوگئی ۔

تعلیم: ـ اردو فارسی کی تعلیم ہات کے مدرسہ میں ہوئی ۔ اسکے بعد گیا آئے جہاں آپکے منجھلے بھائی مولوی فرحت حسین صاحب وکالت کرتے تھے لیکن یہاں تشفی بخش تعلیم نہونیکی وجہ سے پاپیادہ پٹنہ تشریف لیگئے پھر وہاں سے اپنے نسبتی بھائی مولانا حکیم حمایت حسین کے ہمراہ موضع اندموس گئے اور طب یونانی کی تکمیل کی ۔ حکیم صاحب موصوف نے آپکے ذوق تعلیم کو دیکھتے ہوئے پٹنہ میڈیکل اسکول میں جو حال ہی میں قائم ہوا تھا ڈاکٹری پڑھنے کا مشورہ دیا ۔ چنانچہ آپ پٹنہ میڈیکل اسکول میں داخل ہوگئے اور اپنی غیر معمولی ذہانت سے ہمیشہ کلاس میں اول رہکر وظیفہ پاتے رہے ۔

انجمن اسلامیہ پٹنہ کی بنیاد: ـ غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انجمن اسلامیہ پٹنہ کی بنیاد میں نمایاں حصہ آپ ہی کا ہے ۔ وہ اسطرح کہ آپ اور آپکے ایک ہمدرس مولوی علی احسن صاحب نے جو آپکی ہی بستی کے رہنے والے تھے بمشورہ چند احباب ایک مجلس مناظرہ قائم کی جو شروع میں صرف دو چار ممبر پر مشتمل تھی لیکن آہستہ آہستہ تعداد بڑھنے لگی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک عمارت کی بنیاد ڈالی گئی جسکا نام انجمن اسلامیہ ہال پڑا جو ابتک قائم ہے ۔

امتحان میں کامیابی: ـ ۱۸۸۸ء میں ڈاکٹری کا آخری امتحان ہوا تو آپ ہر سبجکٹ میں اول آئے ، اسکول کا ریکارڈ ٹوٹ گیا ۔ سرجری میڈیسن اور مڈوائفری میں ایک ایک گولڈ میڈل ملا ۔

ملازمت: ـ فارغ التحصیل ہونیکے بعد گورنمنٹ کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور بمقام بگہا ضلع چمپارن کے ہسپتال میں تقرری ہوئی ۔ پھر وہاں سے بہار شریف اور اسلام پور وغیرہ مختلف مقامات میں آپ کا تبادلہ ہوتا رہا ۔

ملازمت سے علیحدگی: ـ چونکہ ابتدا ہی سے آپکے دل میں خدمت خلق کا جذبہ موجزن تھا اور آزادی کے ساتھ ملک وطن کی خدمت کرنا چاہتے تھے اسلئے دو سال کے بعد ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور گیا چوک میں اپنے منجھلے بھائی مولوی فرحت حسین وکیل کے مکان میں ڈسپنسری کھولی اور پریکٹس شروع کردی ۔ شافی مطلق نے آپ کو بہترین تجویز و تشخیص کے علاوہ دست شفا ہونے کی خاص نعمت ودیعت کی تھی اسلئے شہر کے علاوہ دور دراز کے مریضوں کا بھی کافی ہجوم ہونے لگا ۔ جو آتا صحتیاب ہوکر واپس جاتا ۔ سچ ہے این سعادت بزور بازو نیست ـ تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ڈھونڈھا مکسچر کی ایجاد: ـ بخار اور ملیریائی بخار کے اندفاع کیلئے ایک زود اثر اور تیر بہدف مکسچر ایجاد کیا جسے اپنی جائے سکونت موضع ڈھونڈھا کے نام پر موسوم کردیا ۔ یہ مکسچر اتنا مشہور اور مقبول عام ہوگیا ہے کہ سال میں لاکھوں شیشیاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچتی رہتی ہیں ۔

ادبی زندگی: ـ ادب سے آپ خاص شغف رکھتے تھے ۔ متعدد اخبارات و رسائل کی سرپرستی فرماتے ۔ بستر استراحت پر خواب سے پہلے اخبارات و رسائل کا مطالعہ فرماتے اور پڑھنے کے بعد کچھ نہ کچھ مشورہ ضرور دیا کرتے ۔



[illegible]

اخلاق:- آپکے اخلاق اور کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، سلام اور مزاج پرسی میں سبقت آپ ہی کی طرف سے ہوتی۔ معائنہ کے کمرہ میں جب تشریف لاتے تو پہلے آپ کسی مریض کی طرف مخاطب ہوتے جو سب سے پہلے آیا ہوتا اور جبتک اسکی تشفی نہ ہوتی دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ شہر کے مریضوں کی گاڑیاں صبح ہی سے منتظر رہتیں۔ ڈسپنسری کے مریضوں سے فرصت پانیکے بعد سب سے پہلے آئی ہوئی گاڑی پر بیٹھتے اور گاڑیاں نمبروار پیچھے پیچھے ہو لیتیں۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے مریضوں کو دیکھتے جاتے دوپہر کو واپس ہوتے۔

صدمہ جانکاہ:- سنہ ۱۹۱۴ء میں آپکے ہونہار اور نوجوان منجھلے صاحبزادے کی بیوقت موت نے سخت صدمہ پہنچایا اور دو سال تک خانہ نشین رہے۔ آخرش چند احباب کے اصرار سے پھر ڈسپنسری میں بیٹھنا شروع کیا۔

علاج و معالجہ سے کنارہ کشی:- ۱۹۳۵ء میں جب آپکے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر ابوالخیر صاحب نے پریکٹس شروع کی تو رفتہ رفتہ آپ نے علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن پھر بھی اپنے بیش قیمت تجربات سے لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔ آپکے اوقات کا زیادہ حصہ یاد الہی اور درود و وظائف میں بسر ہوتا۔

انتقال:- یکم مارچ سنہ ۱۹۴۰ء مطابق ۲۱ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ روز جمعہ صبح کی نماز کے وقت ایکایک قلب میں درد پیدا ہوا اور آناً فاناً درد کی ایسی شدت ہوئی کہ چند لمحہ کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنے احسن وجود سے دنیا کو خالی کر گئے انا للہ الخ اسوقت آپکے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر ابوالخیر صاحب آپکے جانشین ہیں۔ آپ بھی اپنے والد مرحوم کی طرح مجسم اخلاق ہیں۔ تجویز و تشخیص بھی نہایت عمدہ ہے۔ ڈسپنسری بھی فروغ پر ہے۔ اللہم زد فزد۔

آپکے انتقال کا ایک مختصر قطعہ تاریخ بطور یادگار درج ذیل ہے ؎

حسرتا! ڈاکٹر ضمیر احسن — سوئے خلد بریں سفر فرمود
روز جمعہ پس از نماز صبح — بست و یک از مہ محرم بود
بہر تاریخ سال رحلت او — دل اندوہگین پو فکر نمود

از سر آسمان ندا آمد
نام نیکو ضمیر احسن بود
۱۳۵۸ + ۱ = ۱۳۵۹ھ

Reg. No. P. 497.